محبتوں کے ہی درمیاں

نگہت عبداللہ

فہرست

تمہارے لیے تمہاری وہ

''نومیہ پلیز، دومنٹ کے لیے میری بات سن لو۔'' اس کا واحد کزن، واحد دوست اس کے گرد پھیلی کتابوں کو سمیٹتے ہوئے بولا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا پین زور سے کھلی کتاب پر پٹخ دیا اوراس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''عجیب ہوتم بھی، پچھلے ایک گھنٹے سے کہہ رہے ہو۔ میری بات سن لولیکن بتاتے نہیں ہو کہ کیا بات ہے۔''

''عجیب میں نہیں تم ہو۔ مسلسل کتاب میں سر دیے بیٹھی ہو۔ کوئی جواب ہی نہیں دے رہی۔''

''یہ تمہیں پتا تو ہے، میرے ایگزام ہو رہے ہیں۔''

''ہاں پتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ تم کسی کی بات ہی نہ سنو۔''

اچھا بابا! بحث میں میرا وقت برباد مت کرو۔ جلدی کہو کیا بات ہے۔'' وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی اور جو پچھلے ایک گھنٹے سے کوئی بات کہنا چاہ رہا تھا۔ اب اسے کہنے کے لیے سوچنے لگا یا الفاظ ڈھونڈنے لگا تھا۔

''مائی ڈیر عطاء الرحمٰن! میرا خیال ہے، تمہیں کوئی بات نہیں کہنی، محض مجھے ڈسٹرب کرنا مقصود ہے۔'' اتنے پیار سے اس کا پورا نام لے کر بات کرنا اس کی خفگی کا اظہار ہوا کرتا تھا۔

''نہیں نومیہ! اس کی خفگی کا یہ اندازہ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس وقت تو وہ اسے کسی طرح بھی خفا نہیں کر سکتا تھا، جب ہی فوراً بول پڑا۔

''ایمان سے۔ میرا مقصد تمہیں ڈسٹرب کرنا ہرگز نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کل

تمہارا کتنا اہم پیپر ہے لیکن کیا کروں۔ میں اپنی بات کسی اور سے کہہ بھی نہیں سکتا۔ ایک تم ہی تو ہو۔''

''یہ ہم دونوں کی مجبوری ہے کہ ایک دوسرے کے سوا ہم اپنی بات کسی اور سے نہیں کہہ سکتے۔'' اس نے تسلیم کیا تو وہ خوش ہو گیا۔

''تم سمجھتی ہو ناں یہ بات تو پلیز میری مدد کرو۔''

''کس سلسلے میں؟''

''بس ایک چھوٹا سا کام ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ بہت تیزی میں اُٹھ کر گیلری میں گیا اور ٹیلی فون اٹھا کر لے آیا۔ پھر اس کے سامنے رکھتا ہوا کہنے لگا۔

''سنو، میں ایک نمبر بتاتا ہوں۔ اسے ڈائل کرو اور دوسری طرف جو بھی ہو، اس سے کہو سونیا کو بلا دیں۔''

''ہائیں!'' وہ پوری آنکھیں کھول کر چیخی۔ ''یہ سونیا کون ہے؟''

''وہ سونیا۔ وہ۔'' وہ گڑبڑا کر سر کھجانے لگا۔

''دیکھو عطا! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ جو بھی بات ہے۔ سچ سچ بتا دو ورنہ۔''

''بتاؤں گا۔ تمہیں نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا۔''

''جلدی بتاؤ۔'' اس نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

''ابھی نہیں۔''

''کیوں؟'' وہ پھر چیخی۔

''ابھی تمہیں پیپر کی تیاری کرنی ہے اور میری طویل داستان سننے میں۔ تمہارا خاصا وقت برباد ہو جائے گا۔''

''اور تم کیا سمجھتے ہو کہ اب میں سکون سے پڑھ سکوں گی۔ کبھی نہیں جب تک تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ گے نہیں۔ میرا کسی بات میں دل نہیں لگے گا۔''

''میں تمہارے بھلے کو کہہ رہا ہوں۔''

''میرا بھلا چاہتے ہو تو جلدی سے بتا ڈالو اور ضروری نہیں ہے کہ پوری تفصیل بتانے بیٹھ جاؤ۔ مختصر الفاظ میں تعارف کروا دو بقیہ تفصیل امتحانوں کے بعد سنوں گی۔''

''تم نہیں مانو گی۔'' وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ ''سونیا پچھلے تین سال سے میرے ساتھ پڑھ رہی ہے۔''

''تین سال سے۔'' وہ حیرت سے چیخی۔ ''اور تم مجھے اب بتا رہے ہو؟''

''پاگل ہو تم۔'' وہ جھنجلا گیا۔ ''یہ صحیح ہے کہ ہم تین سال سے اکٹھے پڑھ رہے ہیں لیکن ہماری انڈر اسٹینڈنگ اب ہوئی ہے۔ بس ابھی کچھ دن پہلے یا شاید کچھ مہینے پہلے، وہ اچانک مجھے اچھی لگنے لگی اور اب عالم یہ ہے کہ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔''

''اور وہ؟'' وہ آنکھوں میں شرارت بھر کر مسکرائی۔

''وہ بھی۔''

''پھر اب مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک ہفتے سے کالج نہیں آ رہی اور میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیوں نہیں آ رہی۔''

''تو معلوم کر لو۔'' وہ فون کی طرف اشارا کرتے ہوئے بولی۔

''میں اسے فون نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے گھر کا ماحول کچھ روایتی قسم کا ہے اور اس نے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، میں فون کر کے اس کی خیریت معلوم کروں۔''

''ہاں!'' وہ زور دے کر بولا۔ ''بلکہ تم ایسا کرو کہ فون پر اسے بلا دو پھر میں خود ہی اس سے بات کروں گا۔''

''اچھا!'' اس نے ریسیور اٹھایا لیکن پھر فوراً رکھ دیا۔

''کیا ہوا؟'' وہ بے تابی سے پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ اس کی بے تابی پر محظوظ ہوئی، پھر کہنے لگی۔

''میں تو تمہاری سونیا سے بات کرا دیتی ہوں۔ یہ بتاؤ تم میرے لیے کیا کرو گے؟''

''بھئی تم پر ایسا وقت آ گیا تو میں بھی تمہاری مدد کر دوں گا۔'' وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

''میرا مطلب یہ نہیں ہے۔''

''پھر؟''

''بھئی کل میرا آخری پیپر ہے اس کے بعد۔''

''اچھا اچھا۔'' وہ اس کا مطلب سمجھ کر جلدی سے بولا۔

''تمہیں خوب گھماؤں پھراؤں گا اور آئس کریم بھی کھلاؤں گا۔''

''صرف آئس کریم۔''

''اوہو بھئی، جو تم کہو گی وہی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ خود نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پھر ریسیور اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

''لو بات کرو۔''

''ہیلو سونیا میں، میں اس کی دوست نومیہ ہوں۔'' پھر اس سے سرگوشی میں بولی۔

''ابھی آ رہی ہے۔''

''لاؤ فون مجھے دو۔''

''خبر دار۔ پہلے میں بات کروں گی۔'' دوسری طرف شاید سونیا آ چکی تھی۔ اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر بات کرنے لگی۔

''آپ سونیا ہیں؟ خوشی ہوئی آپ سے مل کر بلکہ آواز سن کر۔ کون ہیں؟ میں نومیہ ہوں، عطاء الرحمٰن کی کزن۔''

''جی وہ بالکل خیریت سے ہے بلکہ اسے آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔''

مجھے دو۔'' اس نے بے صبری سے ریسیور جھپٹا اور کان سے لگاتے ہی اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بیٹھ گیا پھر آواز کو بہت دھیمی کر کے بات کرنے لگا، تاکہ پیچھے بیٹھی نومیہ اس کی باتیں سن نہ سکے لیکن وہ بھلا یوں بیٹھنے والی تھی۔ بہت آہستگی سے کھسک کر اس کے قریب ہو گئی اور کان لگا کر سننے لگی۔

''سونیا! میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز، اس کا لہجہ کس قدر مختلف تھا۔ شاید جذبوں کی شدتیں آواز و لہجے۔ میں سمٹ آئی تھیں۔ وہ بے حد حیران ہوئی۔

''یہ عطا ہے۔'' اسے شبہ ہوا۔ پہلے اس کی چوڑی پشت کو گھورا پھر دیکھنے کی غرض سے بیڈ سے اتر کر اس کے سامنے جانا چاہتی تھی کہ وہ فون بند کر کے خود ہی اس کی طرف پلٹا اور اس کی حیران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہلکے سے مسکرایا۔

''ادئے عطا! تم تو گئے کام سے۔'' اس کا انداز تعزیت کرنے والا تھا۔

''لینگویج پلیز۔'' وہ تنبیہی لہجے۔ میں بولا۔ ''پورے پانچ سال بڑا ہوں تم سے۔

ایک تو نام کے ساتھ بھائی لگانے میں تمہاری زبان گھستی ہے۔''

''بہت شوق ہے، تمہیں عطا بھائی کہلوانے کا تو اس سونیا سے کہو وہ ہی تمہیں عطا بھائی کہہ لیا کرے۔''

''کیا؟ کیا؟'' وہ چیخا۔

''خبر دار میری طرف بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔'' وہ اسے خطرناک ارادے کے ساتھ اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر پیچھے ہٹی۔

''میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔''

''پھر آرام سے پھانسی چڑھ جانا۔ پیچھے رونے والی تو موجود ہے۔ کیا بھلا سا نام ہے سونیا۔''

''وہ خود بھی بھلی سی ہے۔'' سونیا کے نام پر وہ دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

''سچ۔ مجھے ملواؤ ناں اس سے۔''

''ایک شرط پر۔'' وہ اس کا اشتیاق دیکھتے ہوئے اکڑ گیا۔

''جلدی کہو۔''

''تم میرا احترام کیا کرو۔''

''احترام۔'' اس کے چیخنے پر جلدی سے بولا۔

''زیادہ نہیں۔ بس میرے نام کے ساتھ بھائی، بھیا یا بھائی جان کا اضافہ کر دو۔''

اس نے برا سا منہ بنایا اور کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔

''تمہیں اس پر اعتراض کیا ہے؟'' وہ جھنجلایا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ ایکدم سیریس ہو گئی۔ ''ہم دونوں فرسٹ کزن ہے۔'' یقیناً بہن بھائی کی طرح ہیں لیکن اس سے زیادہ ہم اچھے دوست ہیں۔ یہ جو ہم بے دھڑک ایک دوسرے سے اپنے اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہیں تو صرف اسی دوستی کی بنا پر، ورنہ کزن اور بہن بھائی کا رشتہ ایسا نہیں ہے۔ ہم پابند ہو جائیں گے اور تمہیں یہ پابندی قبول ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگی۔

''اب پلیز عطا بھائی، یہاں سے تشریف لے جائیں مجھے اسٹڈی کرنی ہے۔''

''کیا ہوا؟'' وہ اسی طرح سنجیدہ چہرے کے ساتھ پوچھنے لگی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ اس پہلو سے تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“

”اچھا! بس اب مزید میرا وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ایسے نہیں پہلے اپنے مخصوص انداز سے کہو۔“

”مائی ڈیر عطا!“ اس نے پیار سے کہا پھر زور سے دھاڑی۔ ”دفع ہو جاؤ۔ یہاں سے۔“ اور وہ ہنستا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔



آخری پیپر دے کر کوئی سوئی تو خوب لمبی تان کر سوئی۔ شام کو ممی نے زبردستی اٹھایا اور اٹھتے ہی اسے یاد آیا کہ عطا نے آئس کریم کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ فوراً اسے فون کر کے کل کی بات یاد دلائی تو جواب میں اس نے بالکل انجان بن کر کب اور کون سی کی گردان شروع کر دی۔

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی نشریاتی رابطے پر تمہاری اور سونیا کی خبر نشر کرتی ہوں۔“ اس نے دھمکی دی۔

”یہ سراسر، بلیک میلنگ ہے۔“ وہ دہائی دینے لگا۔

”پھر آ رہے ہو ناں؟“

”آ رہا ہوں لیکن صرف آئس کریم۔ اس سے زیادہ افورڈ نہیں کر سکتا۔“

”پکے کنجوس ہو۔“

”کنجوسی کی بات نہیں ہے یار! مہینے کی آخری تاریخیں ہیں۔ خیر تم یہ باتیں کہاں سمجھو گی۔“

”عطا!“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ کریڈل پر ہاتھ مار کر اسے پکارتی رہی پھر مایوسی سے ریسیور رکھ کر باہر نکل آئی۔ لان میں دادا حسب معمول اور حسب عادت پھولوں سے حال احوال پوچھتے نظر آئے۔ وہ بہت خاموشی سے دبے پاؤں چلتی ہوئی ان کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اسے بڑا مزا آتا تھا دادا کی باتیں سننے میں۔ وہ پھولوں پودوں کی یوں مخاطب کرتے جیسے اپنے بچوں کو مخاطب کر رہے ہوں۔

”ہاں بھئی تم کیسے ہو؟“ انہوں نے جیسے ہی کہا۔ وہ پیچھے سے آواز بدل کر بولی۔

”ایک دم فرسٹ کلاس۔“ دادا خاصے مگن تھے اس لیے غور ہی نہیں کیا۔ اپنی دھن

میں بولتے گئے۔

”واقعی کل سے بہت بہتر نظر آ رہے ہو۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی تو دادا چونک کر اس کی طرف پلٹے۔

”تم یہاں کب آئیں اور یہ ہنس کیوں رہی ہو؟“

”دادا کبھی اتنے پیار سے میرا حال احوال بھی پوچھ لیا کریں؟“

”کیوں تمہیں کیا ہوا؟“

”دیکھتے نہیں۔ امتحانوں کی وجہ سے کتنی کمزور ہو رہی ہوں۔“ دادا نے غور سے اسے دیکھا اور تشویش میں مبتلا ہو گئے۔

”واقعی کمزور تو لگ رہی ہو۔ کب تک رہیں گے امتحان؟“

”بس آج ختم ہو گئے۔“ وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بولی۔

”چلو اچھا ہے۔ اب خوب ریسٹ کرو۔ پھر آگے تمہیں بہت محنت کرنی ہے۔“

”میں محنت سے نہیں گھبراتی۔“

”جانتا ہوں پھر بھی میڈیکل کی تعلیم خاصی مشکل ہوتی ہے۔“

”کیا کیا؟“ وہ چیخی۔ ”آپ سے کس نے کہا کہ میں میڈیکل میں جاؤں گی؟“

”تمہارا باپ کہہ رہا تھا اور کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں کہی اس نے۔ تم ماشاء اللہ خاصی ذہین ہو۔“

”ذہین ہونے کا مطلب ہے کہ میں ضرور ڈاکٹر بنوں؟“

”تو اس میں برائی کیا ہے؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ بس مجھے ڈاکٹر نہیں بننا۔“ دادا وجہ جاننا چاہتے تھے۔ کہ عطا کے آنے سے بات وہیں رہ گئی۔ وہ اسے چھوڑ کر عطا سے اس کا اور اس کے والدین کا حال احوال پوچھنے لگے اور وہ محض اسے چھیڑنے اور اس کے صبر کو آزمانے کی غرض سے اطمینان سے دادا کے ساتھ چلتا ہوا لان چیئر پر بیٹھنے لگا کہ اس نے فوراً اس کے پیچھے سے چیئر کھینچ لی۔

”خبردار۔ بیٹھنے کی کوشش مت کرنا۔“

”آپ کو نہیں پتا دادا! یہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے۔“

”کیا۔ کیا کر رہا ہے یہ؟“ دادا بالکل نہیں سمجھے اور وہ بہت معصوم بن کر کہنے لگا۔

"نومیہ پلیز دو منٹ دادا سے بات کرلوں پھر چلتا ہوں۔"

"تم کیسے بے ایمان ہو۔ اب میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ خفا ہو کر جانے لگی تو اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر دادا سے کہنے لگا۔

"اصل میں دادا! آج اس کے امتحان ختم ہوئے ہیں ناں اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جس دن اس کے امتحان ختم ہوں گے۔ میں آئس کریم کھلانے لے چلوں گا۔"

"جھوٹ بالکل جھوٹ۔ آئس کریم کا وعدہ ضرور تھا لیکن۔" وہ اس کا پول کھولنے جا رہی تھی کہ اس نے کلائی کو جھٹکا دے کر اسے اپنے پیچھے کر لیا۔

"اچھا دادا! ہم چلیں۔ واپسی میں آپ کے پاس بیٹھوں گا۔" دادا نے مسکرا کر اجازت دی تو وہ اسے تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

"نومیہ! تم سچ مچ کسی دن میرے ہاتھ سے ضائع ہو جاؤ گی۔" وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر بائیک اسٹارک کرنے لگا۔ اسی وقت ڈیڈی آ گئے۔ گاڑی ان دونوں کے قریب رکوا کر پوچھنے لگے۔

"کہاں جا رہے ہو بیٹا؟"

"بس ڈیڈی! یونہی ذرا۔" وہ اتنا کہہ کر عطا کی طرف دیکھنے لگی۔ تو ڈیڈی اس سے کہنے لگے۔

"عطا بیٹا! گاڑی چاہیے تو میری گاڑی سے جاؤ۔" وہ آنکھوں سے گاڑی لینے کا اشارا کرنے لگی لیکن وہ نظر انداز کر گیا۔

"نو تھینک یو انکل! ہم بس ابھی آ جائیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" ڈیڈی اندر چلے گئے تو وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

"چلو عطا! اب بغیر کسی کوما اور فل اسٹاپ کے شروع ہو جاؤ۔" ساحل پر اپنے پسندیدہ رستوران میں بیٹھ کر اپنی پسندیدہ آئس کریم کھاتے ہوئے وہ بولی تو وہ بالکل نہیں سمجھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ حیران ہو کر بولا۔

"کیا مطلب؟"

"میں سونیا کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتی ہوں۔"

"اور میں تو جیسے تمہیں بتاؤں گا۔" وہ جل کر بولا۔

"کیوں۔ کیوں نہیں بتاؤ گے؟"

"اس لیے کہ مجھے بار بار تمہارے ہاتھوں بلیک میل ہونے کا شوق نہیں ہے۔ ابھی تو ذرا سا اس کے بارے میں جاننا ہے تو بات بات پر دھمکی دینے لگی ہو۔ جب تفصیل جان لو گی تو پتا نہیں کیا کرو گی۔"

"تمہاری اس سے شادی کرا دوں گی۔" وہ برجستہ بولی۔

"تم ظالم سماج ہماری راہ میں رکاوٹ تو بن سکتی ہو۔"

"عطا!" اس نے فوراً ٹوک دیا۔ "تم مجھے ایسا سمجھتے ہو۔"

"ہاہاہا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "تم نے خود ہی ایسا سمجھنے پر مجبور کیا ہے ورنہ میں تو تمہیں۔"

وہ اس کی بات پر پوری ہونے سے پہلے کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا کھڑی کیوں ہو گئیں؟"

"واپس چلو۔"

"چلتے ہیں۔ پہلے یہ آئس کریم تو ختم کرو۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"مائی ڈیر سویٹ کزن!" اس نے فوراً اس کی خفگی محسوس کر لی۔ "کم آن بے بی میں مذاق کرتا ہوں اور تم برا مان جاتی ہو۔"

"تم تو جیسے میرا مذاق انجوائے کرتے ہو۔"

"اچھا چلو بیٹھ جاؤ۔" وہ جتنی جلدی روٹھتی تھی، اتنی ہی جلدی مان بھی جاتی تھی۔ اس کے مصالحانہ انداز پر بیٹھ گئی۔ اور وہ فوراً شروع ہو گیا۔ سونیا کے بارے میں اسے تفصیل سے بتا کر آخر میں کہنے لگا۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ اچانک مجھے اتنی اپنی اپنی سی کیوں لگنے لگی ہے۔ بلکہ سچ پوچھو نومیہ! تو میں بقیہ زندگی کو اس کے بغیر ادھورا تصور کرتا ہوں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"واقعی ہر بات کے ہونے کا وقت مقرر ہے اور کوئی بھی بات مقررہ وقت سے پہلے یا بعد میں ممکن نہیں۔ اب یہی دیکھ لو، ہم تین سال سے اکٹھے پڑھ رہے ہیں، بار ہا ہمارا سامنا

ہوا۔ ایک دوسرے سے باتیں بھی کیں بلکہ میرا خیال ہے، ہم دو تین بار کینٹین بھی ساتھ جا چکے ہیں اور اس وقت میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی یہ لڑکی مجھے اتنی عزیز ہو جائے گی۔''

''سونیا کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں جذبوں کی سچائیاں مچلتی دیکھ کر وہ کہنے لگی۔

''تم تو واقعی اس کے لیے سنجیدہ ہو۔''

''تم کیا سمجھتی تھیں کہ میں نے مشغلے کے طور پر۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ فوراً بول پڑی۔'' میں کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ تم یہ بتاؤ اب کیا ارادہ ہے؟''

''ارادہ تو بڑا نیک ہے لیکن اس کے لیے دو تین سال انتظار کرنا پڑے گا۔''

''دو تین سال کیوں۔ کیا یہ تمہارا آخری سال نہیں ہے؟''

''وہ تو ہے۔ میں ہاؤس جاب کے دو سال بھی ساتھ ملا رہا ہوں۔''

''کیا ضرورت ہے۔ میں تو کہتی ہوں۔ ہاؤس جاب کے دوران ہی شادی کر لینا اور کیونکہ شادی سے پہلے رشتہ ہو جانا ضروری ہے۔ اس لیے میں آج ہی تایا ابو اور تائی ای سے بات کروں گی۔''

''دیکھو۔ تم پھر فاؤل کر رہی ہو۔'' وہ اسے گھورتا ہوا بولا۔

''کیوں آخر بات تو بڑوں ہی نے طے کرنی ہے ناں تو پھر کیوں نہ ابھی سے سلسلہ شروع کر دیا جائے۔'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔

''دیکھو نا عطا یونہی تو نہیں شادی ہو جائے گی۔ اس کے لیے کتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ پہلے مرحلے پر تم نے مجھے سونیا کے بارے میں بتایا۔ دوسرے مرحلے پر میں تائی اماں کو تمہاری پسند سے آگاہ کر دوں گی۔ اس کے بعد تایا ابو تک بات پہنچانے کا مرحلہ آئے گا۔ پھر تایا ابو دادا اور ممی ڈیڈی سے مشورہ کریں گے اور پھر اس کے بعد۔''

''خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔'' اس کی اتنی لمبی تمہید پر اس نے سر پکڑ لیا۔'' اتنے مراحل طے کرنے میں تو میری عمر گزر جائے گی۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ ابھی۔''

''بس۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر۔ بولا۔'' اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ تم بس اتنا یاد رکھو کہ میرے فائنل ایر سے پہلے کوئی بات نہیں کرنی۔''

''تمہاری مرضی ورنہ میں تو تمہارا بھلا سوچ رہی تھی۔'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

''مجھے پتا ہے۔ تم میرا کتنا بھلا سوچتی ہو۔''

''عطا! آپ میرے خلوص پر شبہ تو نہ کرو۔''

''کون کافر تم پر شبہ کر رہا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا پھر اسے ساتھ لے کر وہاں سے نکل آیا۔



اس نے سوچا تھا امتحانوں سے فارغ ہوتے ہی وہ کسی انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لے کر یا تو فلاور میکنگ کا کورس کرے گی یا پھر کوکنگ سیکھ لے گی۔ لیکن پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ کچھ وہ خود سستی کر گئی اور کچھ ممی بھی۔ راضی نہیں ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا۔ تم امتحانوں کی وجہ سے کافی کمزور ہو گئی ہو، اس لیے مزید کوئی مصروفیت ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ذہن کو ریسٹ دو، پھر رزلٹ کے بعد وہی کتابیں ہوں گی اور تم ہو گی۔ اس نے ممی کی بات مان تو لی تھی، لیکن اب وہ بہت بور ہو گئی تھی کیونکہ کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ سارا دن کمرے میں بند میوزک سنتی یا پھر دادا سے گپیں لڑاتی۔

دادا بھی عجیب تھے۔ (یہ اسی کا خیال تھا۔) موڈ میں ہوتے تو گھنٹوں اس کے ساتھ باتیں کرتے، ورنہ دو منٹ کے بعد ہی اسے اپنے کمرے سے نکل جانے کا کہہ دیتے اور وہ ان کے کہنے سے تو کبھی ان کے کمرے سے نہیں نکلی تھی، البتہ جب وہ اقبال کی بانگ درا یا بال جبریل اس کے ہاتھ میں تھما کر کہتے۔ ذرا پڑھ کر سناؤ۔ تب وہ وہاں سے کھسکنے کے بہانے ڈھونڈتی۔ دادا کو شاعری کا خبط تھا اور وہ اس معاملے میں صفر۔ شروع میں اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ جب وہ ان کی دی ہوئی کتاب میں سے شعر پڑھ کر سناتی ہے تو دادا اسے ڈانٹتے کیوں ہیں۔ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شعر کو نثر کے انداز میں پڑھ جاتی ہے۔ پھر وہ کوشش کے باوجود اپنا تلفظ صحیح نہیں کر پاتی۔ ایک بار وہ بہادر شاہ ظفر کی مشہور زمانہ غزل ''لگتا نہیں ہے دل میرا'' کے اس شعر کو بڑے انہماک سے یوں پڑھ رہی تھی۔

ع عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن

''عمرِ دراز۔'' دادا باقاعدہ چیختے تھے۔'' یوں لگ رہا ہے جیسے کسی کا نام لے رہی ہو عمر دراز۔''

"دادا اس میں ایسے ہی تو لکھا ہے۔" وہ ان کے چیخنے پر قدرے سہم کر منمنائی تھی۔

"آنکھیں کھول کر دیکھو، 'ز' کے نیچے زیر ہوگا۔ عمرِ دراز۔" دادا نے تصحیح کی تو اس نے پہلے کتاب میں غور سے دیکھا، پھر کتاب دادا کی طرف بڑھا دی۔

"کوئی زیر ویر نہیں لگا ہوا۔ آپ خود دیکھ لیں۔"

دادا نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر دیکھی، پھر تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولے تھے۔

"تمہاری غلطی نہیں ہے۔ پتا نہیں کس جاہل سے کتابت کروائی گئی ہے جو عمر دراز اور عمر دراز کا فرق ہی نہیں جانتا۔" پھر ایکدم اس پر برس پڑے تھے۔ "تم میں اتنا شعور ہونا چاہیے تھا۔ آخر میٹرک پاس کر چکی ہو۔"

"دادا! مجھ سے ایسی کتابیں مت پڑھوایا کیجئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" وہ ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ اور اب بھی جب دادا کو اسے اپنے پاس سے ہٹانا مقصود ہوتا تو وہ اس سے کوئی شعر بنانے کی فرمائش کرتے اور وہ چپکے سے کھسک جاتی۔

ممی اور ڈیڈی کی کمپنی وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ ممی اسے دیکھتے ہی نصیحتوں کا پٹارا کھول دیتیں اور ڈیڈی اپنی بات منوانے بلکہ زبردستی مسلط کرنے میں ماسٹر تھے۔ اس لیے وہ سوائے ناشتے، کھانے کے۔ ان دونوں کے ساتھ بیٹھنے سے گریز کرتی تھی۔ ایک عطا تھا جس کے ساتھ اس کی خاصی بلکہ سب سے زیادہ انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ اب اس کے پاس بھی سوائے سونیا کے اور کوئی موضوع نہیں رہ گیا تھا۔ پہلے روزانہ نہیں تو ہر دوسرے دن ضرور چکر لگاتا تھا اور ادھر ایک ہفتے سے پتا نہیں کہاں غائب تھا۔ اس دوران وہ دو مرتبہ تایا ابو کے گھر جا چکی تھی۔ وہ گھر پر بھی نہیں ملا اور اب وہ نہایت سنجیدگی سے اس سے ناراض ہونے کا پروگرام بناتی ہوئی دادا کے پاس چلی آئی جو حسب معمول پودوں میں مصروف تھے۔

"دادا!" وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی پوچھنے لگی۔ "یہ پودے آپ کی باتوں کا جواب بھی دیتے ہیں؟"

"ہاں!" دادا کے پر یقین لہجے پر وہ اپنی بے ساختہ ہنسی کو بمشکل روک پائی۔

"کون سی زبان میں؟"

"ان کی اپنی زبان ہوتی ہے۔" دادا نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا ورنہ فوراً سمجھ

جاتے کہ وہ ان کے ساتھ مذاق کر رہی ہے، اپنی کہے گئے۔

"یہ پیار کی میٹھی بولی بولتے ہیں اور پیار ہی کی زبان سمجھتے ہیں۔ نرمی سے چھوؤ تو کسی لاڈلے بچے کی طرح ہاتھوں میں لپٹے چلے آتے ہیں اور سختی سے چھونے پر کانٹے چبھو دیتے ہیں۔"

"میں چھو کر دیکھوں۔" اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ انہوں نے روک دیا۔

"خبردار، ہاتھ مت لگانا۔"

"کیوں دادا۔"

"تمہیں انہیں چھونے کا سلیقہ نہیں ہے اور تم ابھی ان کے مزاج کو بھی نہیں سمجھتیں۔"

"مزاج۔" وہ دوسری طرف منہ پھیر کر ہنسی اور سامنے سے عطا کو آتے دیکھ کر وہ فوراً ہنسی روک کر دوبارہ دادا کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وہ سمجھ گیا خفا ہے پھر بھی قریب آ کر دادا کو مخاطب کیا۔

"السلام علیکم۔"

"جیتے رہو میاں! اتنے دن کہاں غائب رہے اور تمہارے امی ابا کیسے ہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو بہت سلام کہہ رہے تھے۔" وہ غائب رہنے کا سوال گول کر گیا پھر اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"تم کیسی ہو نومیہ؟" اس نے جواب نہیں دیا، منہ پھلا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"باہر غبارے والا کھڑا ہے۔" اس کے پھولے منہ کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "کہہ رہا تھا بابو جی لیتے جاؤ۔ میں نے کہا۔"

"اگر ایک لفظ بھی آگے بولے تو تمہارا سر توڑ دوں گی۔" وہ فوراً بول پڑی۔ دادا پہلے حیران ہوئے پھر ڈانٹنے لگے۔

"نومیہ! بڑوں سے اس طرح بات کی جاتی ہے؟"

"بڑوں سے۔ میں اس سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ غصے اور ناراضگی کا اظہار کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔ تو وہ بھی پیچھے آ گیا۔

"صفائی کا موقع تو دو۔"

"جھوٹی داستانیں سنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب جانتی ہوں۔ غضب خدا کا، ابھی تو شادی نہیں ہوئی اور یہ حال ہے۔ جب شادی ہو جائے گی تو سالوں شکل نہیں دکھاؤ گے۔"

"ہاہاہا۔" وہ پہلے ہنسا پھر کہنے لگا۔ "تم کیا سمجھتی ہو کہ میں صبح شام سونیا کے در پر حاضری دیتا ہوں۔"

"اور کیا۔"

"بے وقوف ہو تم۔ اگر اس کے گھر تک خود رسائی حاصل کر سکتا تو اس روز تم سے فون کیوں کرواتا۔"

"ارے! اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔" اس کا موڈ ایک دم بدل گیا۔ "پھر کہاں غائب رہے اتنے دن؟"

"ایک دوست بیمار تھا۔ اس کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔"

"کیوں اس کے گھر والے نہیں ہیں کیا؟"

"دیکھو۔ تم یہ آپاؤں والے لہجے میں مجھ سے جرح مت کیا کرو۔ میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔" وہ اس کے لہجے سے چڑ کر بولا تو وہ ہنس پڑی۔

"اچھا چلو۔ اب منہ پھلا کر بور کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں پہلے ہی اتنے دنوں سے بور پھر رہی ہوں۔" پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر آتے ہوئے بولی۔ "کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"چلو لیکن آئس کریم نہیں کھلاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"جیب بالکل خالی ہے اور ہاں اسکوٹر میں پیٹرول بھی اتنا ہے کہ میں یہاں سے اپنے گھر تک جا سکتا ہوں!

وہ ٹٹولتی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی کہ کہیں وہ اسے ٹالنے کی غرض سے تو نہیں کہہ رہا اور اسے یوں دیکھتے پا کر اس نے کندھے اچکا کر مجبوری ظاہر کی۔

"ٹھیک ہے۔ مجھ سے ادھار لے لو۔" وہ اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"کیا مطلب؟ کیا آج کی تاریخ میں تم مجھے آئس کریم کھلاؤ گی۔"

"کھلا سکتی ہوں لیکن مجھے پتا ہے کہ تم پسند نہیں کرو گے۔"

"نہیں نہیں۔ میں بہت پسند کروں گا۔" وہ اس کی کمینگی پر ہنستا ہوا اس سے آگے چل پڑا۔

"سنو۔" وہ اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں نہ صرف آئس کریم بلکہ اور بھی بہت کچھ کھلاؤں گی لیکن شرط یہ ہے کہ تم سونیا کے بارے میں کوئی بات نہیں کرو گے۔"

"کیوں؟" وہ واقعی حیران ہوا۔

"اس لیے کہ صرف اس کی باتیں کرتے ہو۔ اس سے ملواتے تو ہو نہیں۔"

"ملواؤں گا۔ وقت آنے پر سب سے پہلے تمہیں ملواؤں گا۔"

"وعدہ۔"

"ہاں!" اس نے کہا اور ایک جھٹکے سے بائیک آگے بڑھا دی۔

صبح ممی نے بہت جلدی اسے اٹھا دیا اور فوراً ناشتے کے لیے ڈائنگ روم میں آنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی تو صرف سات بجے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ جب سے کالج بند ہوئے تھے۔ وہ اطمینان سے نو دس بجے اٹھا کرتی تھی اور ممی نے کبھی اس پر اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔

"آج اتنی جلدی کیوں اٹھا دیا۔" وہ سوچتی ہوئی اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر نکلی تو ملازمہ موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"صاحب ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔"

"ڈیڈی کا موڈ کیسا ہے؟" وہ آواز دبا کر پوچھنے لگی۔

"پتا نہیں جی۔ ویسے خوش نظر آ رہے ہیں۔"

"اچھا!" وہ دل ہی دل میں خوشی کا سبب قیاس کرتی ہوئی ڈائنگ روم میں آئی اور بڑے مودبانہ انداز میں سلام کر کے اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ کن اکھیوں سے پہلے ممی اور پھر ڈیڈی کی طرف دیکھا اور اسی وقت ڈیڈی اخبار پر سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"تمہارا رزلٹ آ گیا ہے۔"

”اچھا!“ وہ سارے لحاظ بھلا کر ایک دم اخبار پر جھپٹ پڑی اور رہی سہی کسر رزلٹ نے پوری کر دی۔ گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی اس نے ٹاپ کیا تھا۔ اور یہ کوئی معمولی بات یا معمولی خبر نہیں تھی جو وہ خاموشی سے ہضم کر لیتی۔

”ہرے۔“ وہ زور سے چیخی اور کیونکہ ڈیڈی قریب بیٹھے تھے، اس لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔

”دادا کہاں ہیں؟“ ڈیڈی سے الگ ہوئی تو دادا کے بارے میں پوچھنے لگی۔

”وہ واک کے لیے گئے ہیں۔“ ممی نے بتایا تو وہ دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

”ممی! میں بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی ہوں۔ دل چاہ رہا ہے خوب زور زور سے چیخوں اور۔“

”نومیہ!“ ڈیڈی کے ٹوکنے پر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ ”یہ تمہاری پہلی یا آخری کامیابی نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی تم ٹاپ کر چکی ہو اور آئندہ بھی تمہیں ٹاپ ہی کرنا ہے۔“

”جی ڈیڈی۔“

”خیر۔ اب ناشتا کرو۔“ وہ خاموشی سے اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

پھر جب ڈیڈی آفس چلے گئے تو اس نے خوب اودھم مچایا۔ یہ اس کی خوشی کا اظہار تھا کہ اپنے کمرے کی ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ دادا آئے تو انہیں اپنی کامیابی کی نوید دیتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”ارے! یہ تو خوشی کی بات ہے اور تم رو رہی ہو۔“ دادا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

”یہ خوشی کے آنسو ہیں۔“ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی، پھر ان کے ساتھ آ کر بیٹھی ہی تھی کہ عطا کے ساتھ تایا ابو اور تائی امی بھی آ گئے۔ مٹھائی۔ پھولوں کے ساتھ ڈھیروں دعائیں جنہیں وہ اپنے دامن میں سمیٹتی رہی۔

”عطا! تم صرف دعاؤں سے کام نہیں چلا سکتے۔“ وہ اس کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی تو کہنے لگی۔

”کیا مطلب؟“ وہ سمجھ کر بھی انجان بنا۔

”مطلب یہ کہ میں تم سے اچھا سا گفٹ لوں گی۔“

”مانگی ہوئی چیز گفٹ نہیں ہوتی۔“ وہ جوتے اتار کر وہیں صوفے پر لیٹ گیا۔

”ایسی باتیں کر کے تم میرا دل برا نہیں کر سکتے۔ میں ہر حال میں تم سے گفٹ لوں گی۔“

”اچھا بھئی، گفٹ بھی دے دوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ۔ اب آگے تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں نے سوچا ہی نہیں۔“ وہ لاپروائی سے بولی۔

”سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سیدھے سیدھے میڈیکل میں ایڈیشن لے لو۔“

”نہیں بھئی۔“ وہ بیزار سی شکل بنا کر بولی اور اس کے کیوں کے جواب میں وضاحت کرنا چاہتی تھی۔ کہ ملازمہ نے اس کے فون کی اطلاع دی۔ وہ ابھی آئی کہہ کر فون سننے چلی گئی۔ اس کی دوست کا فون تھا۔ جو اسے مبارکباد دے رہی تھی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ سارا دن وقفے وقفے سے فون کی گھنٹی بجتی رہی اور وہ بھاگ بھاگ کر ریسیو کرتی رہی۔

رات کے کھانے پر ممی نے اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔ اور خاص طور سے اس کی پسندیدہ سویٹ ڈش خود بنائی تھی۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا اور کھانے کے بعد جب تایا ابو اور تائی امی رخصت ہونے لگے تو انہوں نے اگلے دن سب کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔

پھر ہفتہ دس دن وہ یوں مصروف رہی کہ کبھی اس کی سہیلیاں آ جاتیں اور کبھی وہ کسی سہیلی کے ہاں انوائٹ ہوتی، اور جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو ڈیڈی شاید اسی انتظار میں تھے اس سے کہنے لگے۔

”میں نے تمہارے ایڈمیشن کے سلسلے میں ابتدائی تمام کارروائی مکمل کر لی ہے۔“

”کہاں؟“ وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکی۔

”اسپارٹن یونیورسٹی میں۔“

”اسپارٹن یونیورسٹی۔“ اس نے زیر لب دہرایا اور ایک لمحے میں کراچی سے خیبر تک کی ساری یونیورسٹیاں سوچ ڈالیں، لیکن یہ نام کہیں کبھی نہیں ملا، تب ڈیڈی ہی سے پوچھنا پڑا۔

”یہ یونیورسٹی کہاں ہے؟“

”ویسٹ انڈیز میں۔“

”کیا؟“ بے ساختہ چیخ کو کسی طرح نہ روک سکی البتہ اگلا جملہ روکنے میں کامیاب

ہو گئی وہ بھی اگر ڈیڈی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی روکنے کا تکلف نہ کرتی، بلا جھجک کہہ دیتی۔

"آپ کا دماغ صحیح ہے؟"

"میرے ایک دوست ڈاکٹر عابد لغاری۔ اسی یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں" ڈیڈی اس کی چیخ کی پروا نہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "گزشتہ سال جب میں وہاں گیا تھا تو اتفاق سے لغاری سے ملنے یونیورسٹی جانا پڑا اور اسی وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ ایف ایس سی کے بعد تمہارا وہیں ایڈمیشن کرا دوں گا۔ اس سلسلے میں میں نے لغاری سے بھی بات کی تھی۔ ویسے تمہیں کسی سفارش کی ضرورت تو نہیں ہے، پھر بھی اگر کسی قسم کی کوئی پرابلم ہوئی تو لغاری مدد کرے گا۔" وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی لیکن ڈیڈی کے سامنے یہ سب فضول تھا کیونکہ وہ اپنی بات منوانے میں ماسٹر تھے۔

"تم تیاری کر رکھنا۔ جس دن لغاری سے بات ہو گئی۔ اس دن تمہاری سیٹ کنفرم کرا دوں گا۔" وہ متحیر سی ڈیڈی کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور ان کے جانے کے بعد بھی اسی طرح بیٹھی رہی۔

"نومیہ!" ممی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بلایا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں" ممی نے مسکراتے ہوئے جس اطمینان سے ہاں کہا، اس سے وہ سمجھ گئی کہ ڈیڈی اس سے پہلے ممی سے بات کر چکے ہیں اور وہ یقیناً ان سے متفق ہیں۔ اور جس طرح ڈیڈی کے سامنے احتجاج فضول تھا۔ اسی طرح ممی سے مدد طلب کرنا فضول ترین۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ٹیبل پر نظر پڑی تو پیپر ویٹ کے نیچے بڑا سا کاغذ دیکھ کر اسی طرف آ گئی۔ قریب کھڑے ہو کر اس پر موٹے حروف سے لکھے نام کو دل ہی دل میں دو تین بار دہرایا۔ پھر قدرے اونچی آواز میں دانت پیس کر بولی۔

"اسپارٹن ہیلتھ سائنسز۔ یونیورسٹی آف ویسٹ انڈیز۔" کاغذ کھینچ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ اس پر بھی غصہ کم نہیں ہوا تو بیڈ پر گر کر رونے لگی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔" کچھ دیر بعد تکیے سے آنکھیں رگڑتے ہوتے اپنے آپ سے کہنے لگی۔ "میرے رونے کا کسی پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔ رونے میں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ڈیڈی کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کوئی اور طریقہ سوچوں۔

"بھوک ہڑتال۔"

"ناں۔"

"بیمار پڑ جاؤں؟"

"نہیں۔"

"خودکشی کی دھمکی۔"

"سب فضول ہے۔"

"دادا۔"

"ارے ہاں دادا!" امید کی کرن نظر آئی تو اسی وقت اٹھ کر دادا کے کمرے میں آ گئی۔ وہ حسب عادت کتابوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔

"دادا! آپ کو پتا ہے اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟"

وہ ان کے بیڈ کے پاس نیچے گھٹنے ٹیک کر بیٹھتے ہوئے چونکانے والے انداز میں بولی اور دادا ذرا بھی نہیں چونکے۔ اطمینان سے پوچھنے لگے۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"سازش۔ انتہائی خطرناک سازش۔" اس نے لہجے کو خوفناک بنایا۔

"کس کے خلاف؟" ان کا اطمینان برقرار تھا۔

"میرے خلاف۔ یعنی آپ کی پوتی نومیہ سیف الرحمٰن کے خلاف۔"

"کون کر رہا ہے؟"

"آپ کا بیٹا اور بہو۔"

"ہیں ہیں!" دادا کتاب رکھ کر باقاعدہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ "کس کی بات کر رہی ہو؟"

"ممی ڈیڈی کی۔" وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

"چہ چہ۔ اب ماں باپ بھی اولاد کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔"

"ہے ناں افسوس ناک بات؟" وہ فوراً ان سے پوچھنے لگی۔

"ایک بات بتائیں دادا آپ کو مجھ سے کتنا پیار ہے؟"

"پیار ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔"

"اچھا یہ بتائیں۔ کیا آپ میرے بغیر رہ سکتے ہیں؟"

دھیرے دھیرے وہ اصل موضوع کی کی طرف آنے لگی اور دادا سوچ میں پڑ گئے۔ اس کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں ان پر جمائے پوری جان سے متوجہ تھی۔ انہیں اس کے انداز پر شبہ ہوا تو پوچھنے لگے۔

"آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"مدد۔"

"کس سلسلے میں؟"

"ڈیڈی مجھے کالے پانی بھیج رہے ہیں۔"

"ہائیں!" دادا حیران ہوئے۔ "کیا جرم کیا ہے تم نے؟"

"میں نے ٹاپ کیا ہے۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو کبھی اتنی محنت نہ کرتی۔ فیل ہو جاتی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے دادا کو ساری بات بتا دی۔ آخر میں کہنے لگی۔

"دادا آپ سمجھائیں ڈیڈی کو۔ وہ مجھے اتنی دور نہ بھیجیں۔ اگر انہوں نے۔"

"بس۔" دادا نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ "میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟"

"تمہارا باپ بالکل صحیح کر رہا ہے۔ وہ تمہارا دشمن نہیں ہے۔ تمہاری بھلائی سوچتا ہے۔ تم خود سوچو، تم ذہین ہو، باصلاحیت ہو۔ چند سالوں کی محنت سے بڑا آدمی بن سکتی ہو۔"

"مجھے نہیں بننا بڑا آدمی، اور اگر ایسا ہی شوق ہے تو عطا کو بھیج دیں۔"

"عطا کا باپ یہ سب افورڈ نہیں کر سکتا۔"

"تایا ابو افورڈ نہیں کر سکتے۔ ڈیڈی تو کر سکتے ہیں۔ ڈیڈی بھیج دیں اسے۔"

"تمہارے ڈیڈی کو اس سے انکار نہیں ہوگا بلکہ وہ تو بہت پہلے عطا اور تمہارے تایا ابو کو آفر کر چکے ہیں لیکن بیٹا! ہر آدمی کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔"

"میں یہ سب نہیں جانتی۔ بس آپ ڈیڈی کو منع کریں۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"سوری بچے! یہ تم باپ بیٹی کا معاملہ ہے۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔" دادا صاف دامن بچا گئے تو وہ رونے لگی۔

"میں جانتی ہوں۔ آپ کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہے بلکہ یہاں پر کسی کو بھی

مجھ سے محبت نہیں ہے۔" وہ اسی طرح روتی ہوئی اٹھ کر پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔

شام میں جس وقت عطا آیا۔ وہ اٹیچی میں سوچ سوچ کر اپنی ضروری چیزیں رکھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور وہ جان بوجھ کر اسے نظر انداز کیے اپنے کام میں مصروف رہی۔

"کہیں جا رہی ہو؟" اس کی توجہ نہ پا کر خود ہی پوچھنے پر مجبور ہوا۔

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

"کہاں؟"

"ویسٹ انڈیز۔"

"میچ دیکھنے؟" وہ اتنی سادگی سے بولا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ہنس کیوں رہی ہو؟"

"عطا الرحمٰن! تم نے مجھے اتنا فالتو کیسے سمجھ لیا کہ میں صرف میچ دیکھنے کی غرض سے ویسٹ انڈیز جاؤں گی۔"

"اکثر لوگ جاتے ہی ہیں۔"

"ان اکثر لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہوتا ہوگا۔"

"ہاہاہا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا پھر کہنے لگا۔

"تمہیں تو جیسے اور بہت سارے کام ہیں۔"

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا موڈ سخت خراب ہے۔ تمہارا سر بھی توڑ سکتی ہوں۔"

"مجھے پتا ہے۔ تم پہلے بھی کئی بار ایسی کوشش کر چکی ہو۔ یہ بات الگ ہے کہ کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔" اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔

"سچ بتاؤ۔ معاملہ کیا ہے۔" وہ سارا معاملہ بتا کر آخری کوشش کے طور پر اس سے کہنے لگی۔

"عطا! تم ہی کسی طرح ڈیڈی کو سمجھاؤ۔"

"میں۔ یعنی تمہارا مطلب ہے کہ میں۔" وہ کچھ اس انداز سے بولا کہ دل چاہا، سچ مچ اس کا سر توڑ دے لیکن پھر اچانک یاد آیا تو کہنے لگی۔

"کیوں۔ میں نے سونیا کے سلسلے میں تمہاری مدد نہیں کی تھی اور اس وقت تم نے وعدہ کیا تھا کہ کبھی وقت آنے پر تم بھی میری مدد کرو گے۔"

"بالکل کروں گا۔ اگر وہاں رچرڈسن جیسا کوئی بندہ تمہیں پسند آ جائے تو فوراً مجھے لکھنا۔ میں انکل سے سفارش کر دوں گا۔"

"تم انتہائی کمینے انسان ہو۔" وہ اسے مارنے کے لیے ادھر ادھر کوئی چیز تلاش کرنے لگی اور وہ اس کا ارادہ بھانپ کر تکیے کو ڈھال بنا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے غصّے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے۔ ویسے انکل کو سوجھی کیا۔ بھیجنا ہی تھا تو انگلینڈ بھیج دیتے یا امریکہ، یہ ویسٹ انڈیز والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ویسٹ انڈیز میں ان کے جگری یار لغاری صاحب رہتے ہیں۔ یقیناً انہوں نے ہی ڈیڈی کو مشورہ دیا ہو گا۔ اللہ کرے یہ لغاری صاحب۔"

"بری بات۔" اس نے فوراً ٹوک دیا۔ "کسی کے بارے میں غلط الفاظ منہ سے نہیں نکالتے۔"

"کسی کے بارے میں ناں اور تم کسی نہیں ہو عطا الرحمٰن اور تمہارے لیے میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ اللہ کرے تم۔" پتا نہیں کیوں ایکدم خاموش ہو گئی۔

"آگے کہو۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"اللہ کرے تمہیں کچھ نہ ہو۔" اس کے ساتھ ہی وہ ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رو پڑی۔

"ارے!" وہ تکیہ پھینک کر اس کے پاس چلا آیا۔ کندھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھایا پھر اس کے لیے پانی لے آیا۔

"بے وقوف! رونا بزدلی ہے۔ چلو جلدی سے آنسو پونچھو۔" وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر سیدھی ہو بیٹھی۔ اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کیا پھر کہنے لگی۔

"میں بزدل نہیں ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔ میری کزن، میری دوست کبھی بزدل نہیں ہو سکتی۔" وہ اس کے بالوں کو ہلکے سے جھٹکا دے کر مسکرا دیا تھا۔



وہ زیادہ دیر تک کسی بھی بات کو اپنے اوپر طاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ جب تک سمجھتی کہ ہونی کو انہونی یا انہونی کو ہونی کر سکتی ہے تب تک روتی۔ شور مچاتی۔ دہائیاں دیتی یا اور مختلف حربے استعمال کرتی لیکن جب یہ یقین ہو جاتا کہ وہ کسی بھی بات کو یا حالات کو اپنے حق میں نہیں لا سکتی تو ہتھیار ڈالتے ہی اپنے اندر نیا عزم پیدا کر لیتی۔ اس کا کہنا تھا۔ ہتھیار ڈالنے ہی ہیں تو ہنسی خوشی ڈالو۔ تاکہ سامنے والا مرعوب تو ہو۔ اب بھی پہلے اس نے خوب شور مچانے کے ساتھ اور بھی بہت حربے استعمال کر ڈالے۔ یہاں تک کہ سب کے ساتھ ایرپورٹ جاتے ہوئے بھی وہ خاموش اور مسکین سی شکل بنائے رہی کہ شاید کسی کو رحم آ جائے۔ اور راستے ہی سے گاڑی موڑ لی جائے لیکن کسی کو رحم نہیں آیا اور جب ڈیڈی نے اسے خدا حافظ کہا تو یہ یقین ہوتے ہی کہ وہ ہونی کو انہونی نہیں کر سکتی گرم جوشی سے ان سے لپٹ گئی۔

"میں بہت محنت کروں گی ڈیڈی۔"

"گڈ! مجھے اپنی بیٹی سے یہی امید ہے۔" ڈیڈی نے اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر ممی سے گلے ملی تو انہوں نے حسب عادت نصیحتیں شروع کر دیں۔ اس نے مسکرا کر ان کی ہر بات پر اثبات میں سر ہلایا پھر تائی امی اور تایا ابو سے مل کر دادا کی آغوش میں سمائی تو کہنے لگی۔

"مجھے پتا ہے۔ آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ عمر دراز سے بھی زیادہ۔"

"کون عمر دراز؟" دادا بے حد حیران ہو کر پوچھنے لگے۔

"وہی جو چار دن مانگ کر لایا تھا اور جس کے دو آرزو میں کٹ گئے تھے اور دو انتظار میں۔"

"ہائیں!" دادا منہ اور آنکھیں پوری کھولے شاید سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبکہ ان کے پاس کھڑا عطا بے ساختہ زور سے ہنسا۔

"اچھا اب سنجیدہ کلمات کہنے کی کوشش مت کرنا۔ میرا اداس ہونے اور رونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اور ہاں مجھے ہر ہفتے تمہارا خط ملنا چاہیے۔ یاد رکھو، جس ہفتے تمہارا خط نہ آیا۔ اس سے اگلے ہفتے میں تمہیں یہیں ملوں گی۔"

اس کا ہاتھ تھام کر اس نے باقاعدہ دھمکی دی پھر سرگوشی میں کہنے لگی۔ "سونیا سے میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اس کی دید کی حسرت لیے جا رہی ہوں۔"

"بے وقوف! جب واپس آؤ گی تو وہ یہیں تمہیں اپنے استقبال کو ملے گی۔"

"خبردار میرے بغیر شادی مت کرنا۔ ورنہ زندگی بھر تمہاری شکل نہیں دیکھوں گی۔"

"وہ اس کی بات پر محظوظ ہو کر ہنسا۔ اسی وقت مائیک پر اناؤنسمنٹ ہونے لگی تو ڈیڈی نے اسے پکار لیا اور وہ ایک بار پھر سب سے مل کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔



اجنبی دیس جس کے بارے میں اس کی معلومات صرف اتنی تھی کہ پاکستانی ٹیم وہاں کرکٹ کھیلنے جاتی ہے۔ اور شاید عطا بھی صرف اتنا ہی جانتا تھا۔ جبھی تو پوچھ رہا تھا کہ وہ میچ دیکھنے جا رہی ہے۔ اس کی بات یاد کر کے بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اپنا سامان جو ایک اٹیچی اور ایک بیگ پر مشتمل تھا۔ لے کر باہر آئی تو ایک دم تنہا ہونے کے احساس نے پریشان کر دیا۔ ساتھ ہی یہ سوچ بھی کہ اگر انکل لغاری کسی وجہ سے اسے لینے نہ آ سکے تو وہ کیا کرے گی۔

"ان کا ایڈریس اور فون نمبر ہے میرے پاس۔" اس نے سوچا اور بیگ کھول کر جلدی جلدی اس میں سے وہ کاغذ تلاش کرنے لگی جس پر ڈیڈی نے ان کا ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر دیا تھا۔

"نومیہ!" وہ تقریباً بیگ کے اندر سر گھسائے ہوئے تھی۔ جب کسی نے پتا نہیں اسے پکارا تھا یا اس کا نام پوچھا تھا۔ اس نے فوراً سر اونچا کیا اور پوچھنے لگی۔

"آپ انکل لغاری ہیں؟"

انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا تو وہ اطمینان کا سانس لیتی ہوئی سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"تھینکس گاڈ! میں کسی پریشانی سے بچ گئی۔ ویسے آپ نے مجھے پہچانا کیسے!"

"سیف نے تمہاری تصویر بھیجی تھی۔" انہوں نے ڈیڈی کا نام لیا۔

"یہ ڈیڈی نے عقلمندی کا کام کیا۔" اس نے جس بے ساختگی سے کہا۔ اسی بے ساختگی سے انکل لغاری ہنس پڑے۔

"خیر ایسا بھی نہیں ہے۔ ڈیڈی بہت جینئس ہیں۔"

"اب تم لاکھ اس کی تعریف کرو۔ میں یقین نہیں کروں گا۔ سچ وہی ہے جو پہلے تمہارے منہ سے نکلا۔"

"اگر آپ ڈیڈی کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے تو یہیں سوچ لیجئے۔

کیونکہ میں بھی ان ہی کی بیٹی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ بالکل نہیں سمجھے۔

"ایسا نہ ہو، مجھے اپنے گھر لے جا کر آپ کو پچھتانا پڑے کہ کس بدتمیز لڑکی کو لے آیا۔"

"نہیں، تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ چلو۔" انہوں نے ڈرائیور کو اس کا سامان اٹھانے کا اشارا کیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گاڑی کی طرف چل پڑے۔

انکل لغاری کے گھر میں سب اس سے اپنے مخصوص انداز میں ملے۔ یعنی کوئی تصنع نہیں، کوئی بناوٹ نہیں۔ جس نے اس کی آمد کو جس انداز سے لیا اس کا برملا اظہار بھی کر دیا۔ ان کی مسز امریکن تھیں بے حد اسمارٹ۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہنے لگیں۔

"پاکستان سے آیا۔ میں پاکستان دیکھنے کا بہت شوق۔"

"ارے۔" وہ حیرت کا اظہار کرنے سے باز نہ رہ سکی۔ "آپ نے ابھی تک پاکستان نہیں دیکھا۔ میرا مطلب ہے، آپ کبھی وہاں نہیں گئیں؟"

"نہیں۔ ہم کبھی وہاں نہیں گئے۔" ان کے بجائے جواب کسی اور نے دیا۔ وہ گردن موڑ کر اسی طرف دیکھنے لگی تو انکل لغاری تعارف کرواتے ہوئے کہنے لگے۔

"یہ ہمارا سب سے بڑا بیٹا ہے آصف۔ یہ ہوانا کی ایک مقامی فرم میں انجینئر ہے۔"

"ہیلو!" اس کے بے تکلفی سے مسکرانے پر وہ اس کے ساتھ کھڑی لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"میں عالیہ ہوں۔" وہ خود اپنا تعارف کروانے لگی۔ "جہاں تمہارا ایڈمیشن ہوا ہے، میں وہی پڑھتی ہوں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" اس نے خوشی کا اظہار کیا۔ "مجھے تمہارا ساتھ مل جائے گا۔"

"مشکل ہے۔" اس نے ذرا بھی مروت سے کام نہیں لیا۔ "تمہاری اور میری کلاسوں میں کم از کم ایک کلومیٹر کا فاصلہ تو ہوگا ہی اور روزانہ اتنا فاصلہ تم طے کر سکو گی اور نہ میں۔"

وہ کچھ کھسیا کر انکل لغاری کی طرف دیکھنے لگی تو وہ کہنے لگے۔

"یونیورسٹی میں نہ سہی گھر میں تو تم دونوں کا ساتھ رہے گا ہی۔" اور اسے ڈیڈی کی

کہی بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا۔

''لغاری تم سے اپنے گھر رہنے پر اصرار ضرور کرے گا لیکن میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ تم سہولت سے منع کر دینا۔''

''لیکن انکل!'' وہ سوچ کر بولنے لگی۔ ''اگر آپ ہاسٹل میں میرا انتظام کر دیتے تو۔''

''کیوں بیٹا۔ یہاں رہنے میں تمہیں کیا اعتراض ہے، تمہارا اپنا گھر ہے۔'' انہوں نے اپنائیت سے کہا۔

''جی انکل! وہ تو ہے لیکن میں سمجھتی ہوں۔ میرے لیے ہاسٹل میں رہنا زیادہ مناسب ہے۔'' اس نے ڈیڈی کا نام نہیں لیا۔

''اگر تم ایسا سمجھتی ہو، تو ٹھیک ہے۔'' پھر اٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ ''بہر حال جب تک تمہارا ہاسٹل میں انتظام نہیں ہو جاتا۔ تم یہاں آزادی اور بے تکلفی سے رہو۔''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کی اسمارٹ لیڈی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے میاں کی تائید کر رہی تھیں۔ جبکہ ان کی اولادوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

پھر تقریباً پندرہ دن اسے انکل لغاری کے ہاں رہنا پڑا۔ اس دوران ڈیڈی نے دو تین بار فون کر کے اس کی خیریت معلوم کی اور خاص طور سے پوچھا کہ وہ ہاسٹل کب منتقل ہو رہی ہے۔

ہاسٹل میں بڑی مشکل سے اسے جگہ ملی۔ وہ بھی ایک ہندو لڑکی کے ساتھ۔ اس سے اسے کوئی فرق تو نہیں پڑتا تھا لیکن پہلے دن ہی اس نے کچھ اچھا تاثر نہیں دیا تھا۔ وہ جب اپنی اٹیچی کا سامان الماری میں سیٹ کر کے بیٹھی ہی تھی کہ وہ لڑکی پوچھنے لگی۔

''کہاں سے آئی ہو؟''

''پاکستان سے۔'' اس نے خوش ہو کر بتایا تو اس لڑکی نے ایسی بری شکل بنائی کہ اسے بھی پوچھنا پڑا۔

''اور تم؟''

''بھارت سے۔''

جواب میں اس نے بھی اس سے زیادہ بری شکل بنانے کی کوشش کی لیکن ساتھ ہی اسے ہنسی بھی آ گئی۔

''تم ہنس کیوں رہی ہو؟'' وہ ناگواری سے پوچھنے لگی۔

''ہنسنا میری عادت ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض ہو تو بتا دو۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے اعتراض کرنے کی۔''

''ہاں اعتراض کرنا بھی مت، کیونکہ میں اپنی عادت نہیں چھوڑ سکتی۔'' پھر اسے کبھی کی دیکھی ہوئی کسی فلم کا مکالمہ یاد آیا تو اس پر آزما ڈالا۔

''ویسے تمہارا نام کیا ہے بسنتی؟''

لڑکی نے پہلے گھور کر دیکھا پھر منہ پھلا کر بولی۔

''بسنتی۔''

''کیا؟'' وہ چیخی۔ ''سچ مچ تمہارا نام بسنتی ہے؟''

اس کا اثبات میں سر ہلانا تھا کہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ بسنتی اسے گھورتی رہی پھر بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ اس نے جب ہنسنا بند کیا تو سامنے بسنتی کو نہ پا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی پھر چائے کی خوشبو محسوس کر کے فوراً اٹھی اور اس کے پیچھے کچن میں آ گئی۔

''چائے بنا رہی ہو؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں لیکن تمہارے لیے نہیں۔'' اُس نے روکھا سا جواب دیا۔

''ارے۔ جب ساتھ رہنا ہے تو ایک دوسرے کے لیے چائے بنانے میں کیا حرج ہے۔ تم بناؤ گی تو میں بھی پی لوں گی اور میں بناؤں گی تو تم بھی پی لینا۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے صرف ایک مگ میں چائے ڈالی اور مگ اٹھا کر دوبارہ کمرے میں آتے ہوئے کہنے لگی۔

''کچن میں تمام برتن میرے ہیں، انہیں ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کرنا۔''

''کیوں؟'' وہ حیران ہوئی اور پلٹ کر کچن کے اندر دیکھنے لگی جہاں گنتی کے کچھ برتن رکھے تھے۔

''ضروری نہیں کہ میں تمہاری ہر بات کا جواب دوں۔''

''تمہاری مرضی بے شک کسی بھی بات کا جواب نہ دو۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے دوبارہ اپنے بیڈ پر آ بیٹھی۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی۔

''اگر معلوم ہوتا تو برتن ساتھ لے آتی۔ انکل نے بھی نہیں بتایا۔ اب صبح کیا کروں

گی۔ چائے کے بغیر تو ہلا بھی نہیں جائے گا۔"

"سنو" اس نے ایک دم سے مخاطب کیا۔ "یہاں میس وغیرہ تو ہو گا ناں۔"

"ہاں۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"چائے، ناشتا وغیرہ ملتا ہے؟۔"

"سب ملتا ہے۔"

"چلو مسئلہ حل ہوا۔ صبح وہیں جا کر چائے وغیرہ پی لوں گی۔" اپنے آپ سے کہتے ہوئے لیٹی تو خیال آیا۔ عطا کو تفصیلی خط لکھنا چاہیے لیکن پھر اگلے دن پر ٹال کر سو گئی۔

نئی جگہ تھی اس لیے معمول سے ذرا دیر سے آنکھ کھلی۔ اس نے فوراً گھڑی دیکھی آٹھ سے زیادہ ہو رہے تھے۔ اٹھنا چاہتی تھی کہ بسنتی پر نظر پڑی۔ وہ ایک کونے میں سر جھکائے کھڑی پتا نہیں کیا کر رہی تھی۔ اس نے ذرا سا ترچھا ہو کر دیکھا تو اس کے سامنے پتھر کی مورتی رکھی نظر آئی۔

"میرے خدا! یہ صبح ہی صبح۔" اس نے عجیب سے احساس میں گھر کر سوچا اور قدرے اونچی آواز میں اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے بستر چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر الماری میں سے کپڑے نکال کر باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی تو وہ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"سنو میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ اور تم جاتے ہوئے چابی میڈ (کام کرنے والی خاتون) کو دے دینا۔ وہ کمرے کی صفائی کر جائے گی۔"

"کہیں چیزوں پر تو ہاتھ صاف نہیں کر جائے گی؟"

"فکر مت کرو۔ یہ پاکستان نہیں ہے۔"

"بسنتی!" وہ چیخی تھی اور مزید بہت کچھ کہنے کا ارادہ تھا لیکن وہ فوراً کمرے سے نکل گئی۔

"بدذات، بزدل۔" اس پر جھنجلاہٹ سوار ہو گئی۔ دل چاہ رہا تھا فوراً جا کر اس کا گلا دبا دے۔

"وہ کون ہوتی ہے میرے وطن پر نکتہ چینی کرنے والی۔" اور کسی پر بس نہ چلا تو عادت کے مطابق کمرے کی ساری چیزیں الٹ پلٹ کر کے رکھ دیں۔ یہاں تک کہ کچن میں

جا کر اس کا چائے پینے والا اکلوتا مگ بھی توڑ دیا۔ باقی برتن تانبے کے تھے ورنہ انہیں بھی نہ چھوڑتی۔ اسی غصے کے عالم میں جلدی جلدی بالوں میں برش کیا اور بیگ اٹھا کر کمرے سے نکلی ہی تھی کہ سامنے میڈ نظر آ گئی۔ اسے چابی تھما کر فوراً آگے بڑھ گئی۔ چائے کی خواہش شدید تھی لیکن اب کینٹین جانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ سیدھی سی بلاک کی طرف چل پڑی۔ تیز قدموں سے چلتے ہوئے ڈائری نکال کر دیکھی۔ سیکنڈ فلور ڈاکٹر تھامسن کی کلاس تھی۔ ڈائری بند کرتے ہوئے سامنے نظر گئی تو ڈاکٹر تھامسن کو ریڈور سے کلاس روم کی طرف جاتے نظر آئے۔ وہ بھاگ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ کچھ عجلت اور کچھ بوکھلاہٹ کے سیکنڈ کے بجائے تھرڈ فلور پر پہنچ گئی۔ احساس ہوتے ہی فوراً پلٹی اور پھر دو سیڑھیوں پر ہی پیر جما سکی تھی کہ سامنے سے اس سے زیادہ عجلت کا مظاہرہ کرتا ہوا جانے کون تھا جس سے وہ ٹکرائی تھی اور پھر اس کے ساتھ ہی لڑھکتی ہوئی سیکنڈ فلور پر آ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔" وہ کہے جا رہا تھا جبکہ وہ اپنی ہڈی پسلیوں کو چھو کر ان کے صحیح سلامت ہونے کا تعین کرنے میں لگی ہوئی تھی اور جب یہ تعین ہو گیا کہ معمولی خراشوں کے علاوہ باقی سب ٹھیک ہے تو اس کی طرف دیکھے اور متوجہ ہوئے بغیر اپنے کلاس روم کی طرف چل پڑی۔ اور کلاس روم میں داخل ہوتے ہوئے اسے پہلے اپنی پیٹھ میں چبھن کا احساس ہوا پھر نامعلوم سی لہر پورے وجود میں سرایت کرتے ہوئے اسے بے چین کر گئی۔ یقیناً یہ ان نظروں کا کمال تھا جو اس کا تعاقب کرتے چلی آ رہی تھیں۔

"حد ہے نومیہ سیف الرحمٰن!" اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔ "یعنی وہ تو مسلسل معذرت کر رہا تھا۔ اور میں۔ کیا سوچتا ہو گا۔ کس قدر بدتمیز اور بداخلاق ہوں میں۔ پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ اس کا حال احوال نہ پوچھتی کم از کم سوری تو کہہ دیتی۔"

"اینی پرابلم؟" اسے پہلو پر پہلو بدلتے دیکھ کر مایوس بیٹھی لڑکی نے پوچھا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی پھر دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں میرلین ہوں اور تم۔" شستہ انگریزی میں اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس کا نام پوچھا۔

"میں نومیہ ہوں۔ پاکستان سے آئی ہوں اور یہاں ہاسٹل میں رہتی ہوں۔" اس

کی زبان چل پڑی اور رکی اس وقت جب ڈاکٹر تھامسن نے ان دونوں کو مخاطب کر کے کھڑے ہونے کے لیے کہا پھر کلاس روم سے باہر جانے کا اشارا کیا۔ وہ بہت سعادت مندی سے سر جھکا کر میرلین کے ساتھ کلاس سے باہر نکل آئی۔

''آئی ایم سوری میری وجہ سے۔'' میرلین نے کہا تو وہ فوراً بولی۔

''تمہاری نہیں میری وجہ سے۔ خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے، اگر کہیں اور جانے کا خیال نہیں ہے تو پلیز۔ میرے ساتھ کینٹین چلو۔ مجھے بڑی سخت بھوک لگی ہے۔''

میرلین کندھے اچکا کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ پھر برگر کے ساتھ کوک پیتے ہوئے اس کی میرلین کے ساتھ اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔

رات میں اس نے اطمینان سے بیٹھ کر عطا کر تفصیلی خط لکھا۔ پہلے سونیا کی باتیں پھر انکل لغاری کے گھر قیام کی روداد اس کے بعد بسنتی کا ذکر اس نے بڑے جلے بھنے انداز میں کیا۔

پتا ہے عطا اس کی شکل جتنی اچھی ہے۔ مزاج اتنا ہی برا ہے۔ مجھے تو پیدائشی شریفہ لگتی ہے۔ آج میں نے غصے میں اس کا واحد مگ توڑ دیا۔ اگر اس نے آئندہ مجھ پر یا میرے دیس پر تنقید کی تو میں اس کا سر توڑ دوں گی۔

آج کا دن انتہائی ناخوشگوار گزرا۔ پہلے بغیر ناشتے کے یونیورسٹی جانا پڑا۔ پھر سیڑھیوں پر حادثہ ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر تھامسن نے کلاس سے نکال دیا۔ یعنی پے در پے حادثات نے میری کمر توڑ کر رکھ دی۔ پتا ہے ان حادثات کا ذمہ دار کون ہے۔ وہ منحوس مورت جس پر آنکھ کھلتے ہی نظر پڑی تھی۔ اُف کیا خوفناک آنکھیں بنی ہوئی تھیں ناک سے لے کر کنپٹیوں تک پھیلی ہوئی، صبح کی ابتدا ہی غلط ہوئی تو دن تو ایسے گزرنا ہی تھا۔ لگتا ہے اب کہیں اور ٹھکانہ تلاش کرنا پڑے گا۔

آخر میں میرلین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔ ہاں یاد آیا عطا۔ آج کے ناخوشگوار حادثات کے ساتھ ایک خوشگوار حادثہ بھی ہوا۔ یعنی میرلین سے دوستی۔ ایمان سے عطا بہت اچھی لڑکی ہے۔ میرلین۔ سیاہ فام ہونے کے باوجود بہت پیاری لگتی ہے۔ سچ اگر سونیا کا خیال نہ ہوتا تو میں فوراً اسے تمہارے لیے پسند کر لیتی۔

خط تہہ کر کے لفافے میں بند کیا اور قدرے اونچی آواز میں ''اللہ کرے صبح پوسٹ کرنا یاد رہے'' کہتی ہوئی بیگ میں رکھنے لگی کہ بسنتی نے پوچھ لیا۔

''کس کو خط لکھ رہی تھیں؟''

''اپنے کزن کو۔'' سرسری انداز میں جواب دے کر اس نے بیگ بند کر دیا۔

''میری برائیاں بھی لکھی ہوں گی۔''

''کسی خوش فہمی میں مت رہو۔ میرے پاس لکھنے کو اور بہت کچھ ہے۔'' وہ دل ہی دل میں اس کی قیاس آرائی پر حیران ہوتی ہوئی ترخ کر بولی۔

''بائی داوے وہ صرف تمہارا کزن ہے یا۔''

''وہ صرف میرا کزن اور دوست ہے اور بس۔''

وہ بات ختم کرنے کے انداز میں کہتی ہوئی اٹھ کر کچن میں آ کھڑی ہوئی جبکہ وہ شام میں ہی قریبی مارکیٹ سے اپنے لیے کچھ برتن لے آئی تھی۔ اسے اپنی جاسوسی کرتے دیکھ کر کہنے لگی۔

''فکر مت کرو۔ میں تمہارے برتن استعمال نہیں کروں گی۔ ویسے تمہیں اجازت ہے۔ میری جو چیز چاہے استعمال کر سکتی ہو۔'' وہ خاموش رہی تو اس نے اخلاقاً پوچھ لیا۔

''تمہارے لیے بھی چائے بناؤں؟''

''نہیں، مجھے اگر پینی ہوگی تو میں خود بنا لوں گی۔''

''تمہاری مرضی۔'' وہ اپنا مگ لے کر کچن اور کمرے سے بھی باہر آ گئی۔ کوریڈور میں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ یونہی ٹہلتی ہوئی آخری سرے تک چلی آئی، ریلنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ مین روڈ پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ کچھ دیر تک بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھتی رہی پھر اکتا کر وہاں سے ہٹ آئی۔ فوری طور پر کمرے میں جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، اس لیے دائیں طرف کی راہ داری میں مڑ گئی۔ دونوں اطراف بنے کمروں میں کہیں خاموشی تھی اور کہیں سے باتوں کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔

اتنا طویل عرصہ بسنتی کے ساتھ رہنا بہت دشوار ہوگا۔ کاش مجھے کہیں اور جگہ مل جائے یا وہ ہی کہیں چلی جائے۔ اچھا ماحول اور اچھے دوست ہوں گے تو وقت بھی اچھا گزر جائے گا ورنہ تو۔

اپنے پیچھے قدموں کی مدہم چاپ محسوس کر کے وہ چونکی اور فوراً پلٹ کر دیکھنے لگی۔

اپنے ہی کسی خیال میں مگن تیز قدموں سے چلتا ہوا قریب آیا تو اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رکا اور فوراً ہی اس کی نیلگوں آنکھوں میں پہچان کی چمک لہرانے لگی تھی جبکہ رات، تنہائی اور سناٹے نے اسے قدرے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس نے کترا کر نکلنا چاہا۔

''ہیلو۔'' وہ دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ جواب میں اس کے حلق سے پھنسی پھنسی ہیلو کی آواز نکلی اور اسے مزید کچھ کہنے پر آمادہ دیکھ کر فوراً وہاں سے بھاگ آئی۔ اپنے کمرے میں آئی تو ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو چکی تھیں اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ بسنتی کوئی ٹھیس دلانے والا سوال کرتی۔ وہ مگ رکھنے کے بہانے کچن میں چلی گئی۔

کچھ دیر وہیں کھڑے رہ کر اپنی حالت پر قابو پایا پھر آ کر کتاب کھول لی۔ اس نے اس وقت چائے پی ہی اس غرض سے تھی کہ کچھ دیر اسٹڈی کرے گی لیکن سارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا۔ نیند بھی گئی اور اسٹڈی بھی۔

''پتا نہیں کون تھا؟'' نظریں کتاب پر جمی تھیں اور ذہن مسلسل بھٹک رہا تھا۔

آنکھیں تھیں یا ساگر۔ نیلے پانیوں کو جیسے ایک دائرے میں مقید کر کے اس نے اپنی پتلیوں کے اندر چھپا لیا ہو۔

رُکا یوں جیسے پہلے سے جانتا ہو۔

مسکرایا یوں جیسے مدتوں کی شناسائی ہو۔

یہاں کا باسی تو نہیں لگ رہا تھا۔ امریکن تھا یا غالباً۔

اونہوں۔ میں کیوں اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ وہ اپنے آپ کو۔ سرزنش کرنے لگی۔ مجھے کیا کہیں کا بھی ہو۔ اور پھر ان لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے ہر ایک کو ہیلو کہنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بمشکل اس کے خیال سے پیچھا چھڑایا ساتھ ہی کتاب بھی بند کر دی۔ بسنتی کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر لائٹ آف کی پھر اپنی جگہ پر آ لیٹی۔

صبح اٹھتے ہی کل والا نظارہ دیکھنے کو ملا۔ بسنتی ہاتھ باندھے سر جھکائے کونے میں کھڑی تھی۔ اس نے فوراً اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اونچی آواز میں بڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔

''الٰہی خیر۔ ناخوشگوار حادثات سے محفوظ رکھنا مجھے۔''

اس کے ساتھ ہی اپنے کپڑے نکال کر باتھ روم میں چلی گئی۔ نہا کر نکلی تو کچن کا

رخ کیا لیکن ناشتے کا سامان لانا تو وہ بھول ہی گئی تھی۔ اپنی عقل پر ماتم کرتے ہوئے صرف چائے پر گزارہ کیا پھر اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔ گو کہ ابھی کلاس شروع ہونے میں کافی وقت تھا لیکن صرف بسنتی کی وجہ سے چلی آئی۔ کیونکہ وہ باتیں ہی طیش دلانے والی کرتی تھی اور صبح صبح وہ اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دیکھا لفٹ کا دروازہ بند ہو رہا تھا۔ وہ بھاگ کر اس میں داخل ہو گئی لیکن اندر موجود اس تنہا شخص کو دیکھ کر اس کا دل رات کی طرح پھر سینے کی دیواروں سے سر پٹخنے لگا۔

''میں رابنسن ہوں۔ رابنسن مارک۔'' وہی رات والی مسکراہٹ جس نے تھوڑی کے درمیان کھنچی لکیر کو نمایاں کر دیا تھا۔

''نومیہ سیف الرحمٰن!'' وہ اپنا نام بتا کر لاتعلق نظر آنے کی بھرپور کوشش کرنے لگی۔

''کل آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی تھی؟'' اس نے پوچھا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آیا، وہ کیا کہہ رہا تھا لیکن پھر فوراً کل سیڑھیوں سے گرنا یاد آیا اور یہ بھی کوئی مسلسل اس سے معذرت کرتا رہا تھا۔

''تو وہ یہ تھا۔'' اس نے سوچا۔ ''جب، ہی رات شناسا مسکراہٹ کے ساتھ ہیلو کہہ رہا تھا۔''

''میں نے بہت کوشش کی تھی سنبھلنے کی لیکن میرا پیر سیڑھیوں پر جم نہ سکا۔'' وہ اسے خاموش دیکھ کر یوں صفائی پیش کرنے لگا جیسے ساری غلطی اسی کی ہو۔

''آئی ایم سوری اگین۔''

''اونو۔'' اسے کہنا پڑا۔ ''غلطی صرف آپ کی نہیں میری بھی تھی۔ ویسے مجھے زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو میں یہاں نہ کھڑی ہوتی۔''

اس کی بات پر وہ مسکرایا۔ اسی وقت لفٹ رکی تو وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ خیال تھا سائے بائے کرتے ہوئے اپنے راستے پر چل پڑے گی لیکن وہ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتا ہوا کہنے لگا۔

''آپ غالباً پاکستان سے آئی ہیں؟'' اسے حیرت تو ہوئی لیکن ظاہر نہیں کی۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی بات یقین سے دہرا دی۔

''اور آپ یقیناً امریکن ہیں۔''

وہ ہنسا۔ مسکراہٹ دلنشین تھی اور ہنسی دلفریب۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر قدم روک کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ نے کیسے جانا؟" وہ اس کے ساتھ رکا تھا تو براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔

"آپ کے لہجے سے۔" وہ فوراً نظریں چرا کر چل پڑی۔ "امریکیوں کا لہجہ بقیہ انگلش اسپیکنگ سے خاصا مختلف ہوتا ہے، اس لیے پہچانا جاتا ہے۔"

"اچھا!" وہ قائل ہوا پھر کہنے لگا۔ "اور میں نے آپ کے انداز سے جانا۔"

"انداز سے؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔ اور بہت ساری خوبیوں کے ساتھ پاکستانیوں میں ماسٹر ہوتے ہیں اور کل جس طرح آپ مجھے اگنور کرتی ہوئی کلاس روم میں چلی گئی تھیں۔ اس سے میں سمجھ گیا تھا کہ آپ پاکستانی ہیں۔"

وہ خجل سی ہو کے راہ فرار ڈھونڈنے لگی۔ لیکن فرار کی کوئی راہ نہیں تھی جبھی کہنے لگی۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے بالکل برا نہیں لگا تھا۔" قدرے توقف کے بعد وہ کہنے لگا۔ "شاید زندگی میں پہلی بار مجھے اگنور ہونا اچھا لگا۔ ورنہ اب تک تو یہی گلہ تھا۔ میں اگنور کیوں ہوتا رہا ہوں۔" نیلے پانیوں میں جوار بھاٹا اٹھنے لگا اور اداسیوں کے سارے موسم جیسے مدتوں سے اس کے تعاقب میں تھے۔ ایک پل میں یوں اس کا گھیراؤ کیا کہ اس پوری زمین پر وہ تنہا کھڑا نظر آیا۔

"نومیہ! نومیہ!" وہ اپنے آپ کو پکارتی رہ گئی اور خود اسے اپنا پتا نہیں مل رہا تھا۔



اس نے بسنتی کی طرف دیکھا وہ بے خبر سو رہی تھی۔

رات کے اس پہر سب ہی بے خبر سوتے ہیں اور کوشش تو اس نے بھی بہت کی تھی لیکن نیند کسی طرح مہربان ہو کے نہ دی۔ پہلے کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی جب بدن دکھنے لگا تو تکیے کے سہارے بیٹھ گئی اور پچھلے دو گھنٹے سے وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ ذہن خالی بھی نہیں تھا اور کسی طرح سوچ پر گرفت مضبوط بھی نہیں ہو رہی تھی۔ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ اس طرح کیوں بیٹھی ہے۔

ایک پل میں سیڑھیوں سے گرنے کا تصور تو فوراً ہی دوسرے پل اس کا معذرتی لہجہ۔ آئی ایم سوری۔

شناسا مسکراہٹ کے ساتھ ہیلو کہنا اور اگلے ہی پل نیلگوں آنکھوں میں اٹھتا جوار بھاٹا۔ کوئی ایک تصور مسلسل قائم نہیں رہ پاتا پھر۔ پھر میں کیا چاہتی ہوں۔

"شاید زندگی میں پہلی بار مجھے اگنور ہونا اچھا لگا۔" خاموشیاں سرگوشیوں کا روپ دھار گئیں۔

"رابنسن مارک۔" بہت دیر بعد اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ "کیا تم میری آنکھوں سے نیند چرانے کے سزاوار ہو۔"

"اوہ نو! یہ کیسے ممکن ہے بھلا۔" اس نے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھاما تو عطا کی کہی بات یاد آئی۔ اس نے سونیا کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا۔

"ہر بات کے ہونے کا وقت مقرر ہے اور کوئی بھی بات اپنے مقررہ وقت سے پہلے یا بعد میں ممکن نہیں۔"

"یہ صحیح ہے۔" وہ اعتراف کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ "زندگی میں ایسا کوئی موڑ آنے کے لیے بے شک وقت مقرر ہو لیکن یہ جگہ، یہ ماحول کسی طرح بھی مناسب نہیں۔"

"جگہ اور مقام سے قطع نظر رابنسن کے بارے میں سوچنا انتہائی احمقانہ پن ہے۔" اس کے اندر سے آواز آئی۔

"میں کیا کروں۔" اس نے بے بسی سے سر پٹخا۔ میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرے اندر ایسی ہلچل کبھی نہیں مچی تھی۔ اس کی گہری اور شفاف آنکھوں میں مجھے اپنا وجود ڈوبتا ہوا لگتا ہے۔

لاکھ راستہ بدلا۔

لاکھ دامن جھٹکا۔

لاکھ نظریں چرائیں۔ لیکن ہر راستے پر وہ موجود تھا۔ اور موجود نہیں تھا تو اس کی نظروں کی تپش تھی۔ جواب بھی مجھے اپنے آس پاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اچانک نمی اتر آئی اور کناروں تک آنے کو تھی کہ وہ اپنے آپ سے لڑ بیٹھی۔

"حد ہے نومیہ سیف الرحمٰن! پہلے ہی مقام پر رونے لگیں۔ بغیر شور مچائے، بغیر

کوئی حربہ استعمال کیے۔ چہ چہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ کم از کم پہلے اپنا دفاع تو کرو۔ بعد میں بزدلوں کی طرح ہتھیار ڈالتے ہوئے آنسو بھی بہا لینا۔

"میں بزدل نہیں ہوں۔" اس کا دل چاہا، اتنی زور سے چیخے کہ اس کی آواز درو دیوار سے نکل کر پورے شہر میں گونجنے لگے لیکن اس نے بہت خاموشی سے تکیہ سیدھا کیا اور لیٹتے ہوئے دل ہی دل میں کہنے لگی۔

"میں نے کبھی اتنی جلدی اور آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اب بھی نہیں ڈالوں گی۔"

رات کے آخری پہر میں وہ سوئی تھی۔ جب ہی صبح آنکھ نہیں کھلی۔ بسنتی نے بھی اسے اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ البتہ جب جانے لگی تو اس کا کندھا ہلا کر پوچھنے لگی۔

"سنو۔ آج تمہارا اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟"

اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور کوئی جواب دیے بغیر کروٹ بدل لی۔ بسنتی شاید اپنا فرض پورا کر چکی تھی۔ اس لیے اسے اٹھانے کی مزید کوشش کیے بغیر چلی گئی پھر جس وقت میڈ کمرے کی صفائی کرنے آئی اس وقت بھی وہ سو رہی تھی۔ جب اس نے پنکھا بند کیا تب گرمی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر تک وہ یونہی لیٹی آہستہ ہوتے پنکھے کے پروں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھتی رہی پھر اٹھتے ہوئے گھڑی پر نظر گئی تو حیران رہ گئی۔ بارہ سے زیادہ ہو رہے تھے۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" میڈ اس کی سرخی مائل آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تشویش سے پوچھنے لگی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور منہ دھونے کی غرض سے باتھ روم میں چلی گئی۔ پھر آ کر اپنے لیے چائے بنائی۔ کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے وہیں کھڑے کھڑے چائے پی لی۔ میڈ صفائی کر کے چلی گئی تو اس نے کمرے میں آ کر فل اسپیڈ سے پنکھا کھول دیا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی کہ اب کیا کرے لیکن کوئی کام کرنے کا موڈ نہیں بنا۔ انتہائی بوریت محسوس کرتے ہوئے دوبارہ لیٹنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ عطا کا خط آ گیا۔ اس نے سب کا تفصیلی حال احوال لکھنے کے بعد اس کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔

تمہارے ساتھ ہونے والے حادثات کی تفصیل پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ بہر حال اگر تم صبح کا آغاز اپنے انداز سے کرنے کی عادت ڈال لو تو ناخوشگوار کی جگہ

خوشگوار حادثات جنم لے سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اس شر پسند لڑکی سے پہلے اٹھ کر نماز پڑھ لیا کرو۔ اللہ پاک کے نام سے ابتدا کرو گی تو تمام نحوستوں سے محفوظ رہو گی۔

اور ہاں اچھا ہوا جو میں نے نہ صرف سونیا کو پسند کیا بلکہ تمہیں بھی اس کے بارے میں بتا دیا ورنہ تم ہر دوسری لڑکی کو میرے لیے پسند کرنے کھڑی ہو جاتیں۔ دوستیاں ضرور کرو لیکن کسی کو بھی میرے حوالے سے سوچنے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔ کیونکہ میں اپنے جذبے پوری ایمانداری کے ساتھ سونیا کے نام کر چکا ہوں۔

اس نے مسکرا کر دوبارہ خط پڑھا۔ تایا ابو، تائی امی، ممی، ڈیڈی۔ اس نے سب کے بارے میں لکھا تھا۔ اور فوری طور پر وہ بوریت سے تو نکلی ہی باقی سب باتیں بھی کہیں پس منظر میں چلی گئیں اور وہ اپنے پیاروں کو بڑی شدت سے یاد کرنے لگی۔

ممی اپنی نصیحتوں کا پٹارہ کس کے سامنے کھولتی ہوں گی۔

ڈیڈی زبردستی اپنی بات کس سے منواتے ہوں گے۔

اور دادا۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ پھولوں سے ان کا حال احوال پوچھتے ہوئے مجھے ضرور یاد کرتے ہوں گے۔ اور ان کی وہ شعر و شاعری۔

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں

قدرے اونچی آواز میں اس نے شعر پڑھا اور پھر ہنس پڑی۔ کون تصحیح کرے، کون بتائے کہ کہاں غلطی ہوئی۔ اور اگر دادا اس وقت سن لیتے تو حیران رہ جاتے کہ شعر پڑھنے کا سلیقہ اسے کس نے سکھایا جو وہ انتہائی کوشش کے باوجود نہ سکھا سکے۔ پھر وہ الگ الگ سب کے نام خط لکھنے بیٹھی تو وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔

شام میں میرلین آ گئی۔ اس کا موڈ اچھا تھا اور کچھ سارا دن کمرے میں بند رہنے کی وجہ سے گھٹن کا شکار بھی تھی۔ اس لیے جیسے ہی اس نے کہیں باہر چلنے کے لیے کہا، وہ تیار ہو گئی۔

"میں سمجھتی تھی گرمی صرف پاکستان میں ہوتی ہے۔" وہ میرلین کے ساتھ کھلی فضا میں چلتے ہوئے کہنے لگی "لیکن یہاں تو اس سے بھی برا حال ہے۔"

"کیوں کیا موسموں پر صرف تمہاری اجارہ داری ہے؟" میرلین ہنسی۔

"کم عقلی کی بنا پر میں ایسا ہی سمجھتی تھی۔" اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا پھر وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "اصل میں ہمارے ہاں کے لوگ زیادہ تر ٹھنڈے ملکوں میں جاتے ہیں، اس لیے میرے ذہن میں ان لوگوں کی باتیں تھیں جو وہ وہاں کے موسموں کے بارے میں کرتے تھے۔"

"تم جب جاؤ گی تو یہاں کے بارے میں کیسی باتیں کرو گی؟"

"یہ وقت پر منحصر ہے۔ اچھا گزر گیا تو اچھی باتیں کروں گی۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"خدا کرے تمہارا وقت اچھا گزرے تا کہ تم اچھی یادیں لے کر جاؤ۔" کچھ دیر رک کر پوچھنے لگی۔ "تمہیں اپنے گھر والے یاد تو آئے ہوں گے۔"

"ہاں! آج میرے کزن کا خط آیا تھا۔" اس کے بعد سارا وقت گھر والوں کو یاد کرنے میں گزر گیا۔"

"یونیورسٹی کیوں نہیں آئی تھیں؟" میرلین نے یوں پوچھا جیسے اچانک یاد آیا ہو۔ اور وہ ہنس پڑی۔

"یہ بات تو تمہیں میرے پاس آتے ہی پوچھنی چاہیے تھی۔"

"میں یہی پوچھنے آئی تھی اور میرا خیال تھا، تمہاری طبیعت خراب ہو گئی ہو گی لیکن تمہیں فریش دیکھ کر جہاں اطمینان ہوا وہاں پوچھنا بھی بھول گئی۔"

"چلو۔ اب تم نے پوچھا ہے تو بتا دیتی ہوں کہ صبح آنکھ نہیں کھلی تھی۔"

"اگر ایسی کوئی پرابلم ہے تو میں تمہیں اٹھانے آ جایا کروں؟"

"ارے نہیں۔" وہ اس کے خلوص سے متاثر ہوئی۔ پھر۔ یونہی ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے میرلین نے اسے ہاسٹل کے قریب چھوڑا تو شام گہری ہو رہی تھی۔ وہ لفٹ کی طرف آئی اور لفٹ کو مصروف دیکھ کر انتظار کرنے کے بجائے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اپنے فلور تک آتے آتے اس کی سانس پھول گئی تھی۔ کمرے سے چند قدم کے فاصلے پر تھی کہ بائیں طرف سے نکل کر رابنسن اچانک اس کے سامنے آ گیا۔

"ہیلو ہاؤ آر یو۔" وہ مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"فائن۔ تھینک یو۔" وہ جواب دے کر فوراً اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ بسنتی

کچن میں مصروف تھی۔ وہ اطمینان سے بیڈ پر گر کر سینڈل اتارتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگی۔

"بس یہی رویہ مناسب ہے۔ مجھے اس کے سامنے زیادہ دیر نہیں رکنا۔"

"تم کب آئیں؟" بسنتی کچن سے نکلی تو اسے یوں چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"ابھی۔"

"کمال ہے، تمہارے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔"

"تمہارا مطلب ہے، مجھے شور مچاتے ہوئے آنا چاہیے تھا۔"

"نہیں۔ کچھ آہٹ تو ہوتی ہی ہے۔"

"ہوتی ہو گی۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ کر خواہ مخواہ اپنا بیگ کھول کر دیکھنے لگی۔ پھر رات میں وہ صرف اس خیال سے جلدی سو گئی کہ کہیں صبح اٹھنے میں دِقت نہ ہو اور صبح واقعی بہت جلدی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ابھی اجالا پھیلا بھی نہیں تھا۔ پہلے اس نے سوچا کچھ دیر اور سو لے لیکن فوراً عطا کی بات یاد آئی جو کل ہی اس نے خط میں لکھی تھی۔

"اللہ کے پاک نام سے ابتداء کرو گی تو ہر نحوست سے محفوظ رہو گی۔"

"جیو عطاء الرحمٰن!" وہ دل ہی دل میں اسے دعائیں دیتی ہوئی اٹھ گئی۔ وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑی ہوئی ہی تھی کہ بسنتی اٹھ گئی اور جب تک وہ نماز پڑھتی رہی، وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اپنی غفلت پر بے اختیار ندامتوں کے موتی ہتھیلیوں پر گرنے لگے تھے۔

"اے اللہ! تو نے، ہمیشہ مجھے میری بساط سے بڑھ کر نوازا اور میں کتنی بری ہوں کہ کبھی سجدہ شکر بجا نہیں لائی۔ میری اس کوتاہی، اس غفلت کو معاف فرما میرے معبُود اور میرے دل کو اپنے نور اپنی یاد سے منور فرما اور مجھے اس راستے پر ہمیشہ ثابت قدم رکھ۔ بے شک تو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔"

ہاتھ منہ پر پھیر کر اٹھی اور جاء نماز رکھ کر کچن میں چلی گئی۔ اپنے لیے ناشتا بناتے ہوئے شیشے سے باہر دیکھا۔ مشرق سے نکلتا سورج اپنی کرنوں سے کائنات کو منور کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ابھی ابھی اس کا دل ایک الوہی کرن سے منور ہوا تھا۔ اس کے

ہونٹ آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔ ناشتے کی ٹرے لے کر دوبارہ کمرے میں آئی تو اخلاقاً بسنتی کو بھی اپنے ساتھ شریک ہونے کے لیے کہا۔ جواب میں وہ برا سا منہ بنا کر باتھ روم میں چلی گئی۔ تو اس نے روزانہ کی طرح دل ہی دل میں اسے گالیاں نہیں دیں بلکہ اطمینان سے ناشتا کرنے لگی۔ پھر ناشتے کے بعد بھی اس کے پاس کافی وقت تھا۔ کچھ وقت اسٹڈی میں گزرا اور کچھ وقت تیار ہونے میں صرف کیا۔

''جلدی اٹھنے کے کتنے فائدے ہیں۔ اطمینان سے سب کام ہو گئے۔'' اس نے سوچا اور جس وقت بسنتی اپنے بھگوان کے سامنے کھڑی ہو رہی تھی وہ بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔

آج شروع ہی میں اس کی لگاتار تین کلاسیں تھیں۔ اس لیے ایک بجے تک تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ اس کے بعد ایک گھنٹے کا وقفہ ملا۔ تو وہ اور میرلین ایک لمحہ ضائع کیے۔ بغیر ریفریشمنٹ روم کی طرف چل پڑیں۔ اپنی مدد آپ کے تحت دونوں نے اپنی اپنی پلیٹوں میں کھانے کی چیزیں بھریں اور ساتھ میں کوک لے کر کونے والی ٹیبل پر جا بیٹھیں۔

''بہت سخت بھوک لگی ہے۔'' میرلین بیٹھتے ہی شروع ہو گئی جبکہ اس نے کھانے سے پہلے یونہی ہال پر سرسری نظر ڈالی اور پھر دروازے سے داخل ہوتے رابنسن پر لمحہ بھر کو اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ پھر فوراً سر جھٹک کر اپنی پلیٹ پر جھکتے ہوئے اس نے سوچا۔

اگر اس نے دیکھ لیا تو یقیناً کسی بہانے سے یہاں آئے گا۔'' وہ بھول گئی تھی کہ جس جگہ اور ماحول میں وہ بیٹھی ہے، وہاں کسی بہانے کی ضرورت نہیں پڑتی اور وہ بھی کسی بہانے سے نہیں علی الاعلان اسے ڈھونڈتا ہوا آیا۔

''مجھے یقین تھا، آپ یہیں ملیں گی۔ اس لیے میں سیدھا یہیں چلا آیا۔'' وہ ان کی ٹیبل کے پاس رک کر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ اور وہ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکی۔ قدرے نروس ہو کر میرلین کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔'' وہ اس کے نظریں چرانے کے باوجود وہیں بیٹھنے کی بات کرنے لگا۔

''شور!'' اس کے بجائے میرلین نے کہا اور وہ فوراً بیٹھ گیا تو اس نے اپنی کوک بہت آہستگی سے اس کی طرف بڑھا دی۔

''تو تھینک یو۔'' اس نے کوک لے کر دوبارہ اس کے سامنے رکھ دی پھر کہنے لگا۔

''میں صرف آپ کو دیکھنے آیا تھا۔''

''میرے خدا۔'' اس کے حلق میں سینڈوچ اٹک گیا، جسے نیچے اتارنے کے لیے کوک کا سہارا لیا تو ایکدم آنکھوں اور ناک میں پانی اتر آیا۔ پتا نہیں رومال کہاں چلا گیا تھا۔ جلدی میں دوپٹے کے پلو سے ناک اور آنکھیں صاف کرنے لگی۔ وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ سیدھی بیٹھی تو اٹھ کھڑا ہوا۔

''او کے۔ میں چلتا ہوں۔ شام میں ہاسٹل کے لان میں آپ کا انتظار کروں گا۔''

اس نے بہت خاموشی سے اسے جاتے دیکھا۔

''کون ہے؟'' میرلین کے پوچھنے پر وہ چونکی۔

''پتا نہیں۔''

''کیا مطلب؟ وہ تو یوں بات کر رہا تھا جیسے برسوں سے جانتا ہو اور تم کہہ رہی ہو پتا نہیں۔''

''میں واقعی زیادہ نہیں جانتی۔ بس اتنا معلوم ہے کہ ہمارے کمرے کے آس پاس کسی کمرے میں مقیم ہے۔ آتے جاتے ہیلو ہائے ہو جاتی ہے اور بس۔''

''ویسے خاصا ڈیسنٹ بندہ ہے؟'' میرلین کے لہجے میں شوخی ضرور تھی لیکن انداز اسے چھیڑنے والا نہیں تھا، جب ہی وہ اعتراض کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''ہاں، لیکن میں اس سے دوستی نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیوں؟'' میرلین نے پوچھا پھر فوراً کہنے لگی۔ ''اچھا اچھا میں تمہاری پرابلم سمجھتی ہوں۔''

''کیسی پرابلم؟'' وہ حیران ہوئی۔

''یہی کہ تمہارے ہاں کی لڑکیاں اس معاملے میں خاصی پابند ہوتی ہیں۔ اور خاص طور سے جب مذہب کی دیوار درمیان میں حائل ہو جائے تو۔''

''تم ٹھیک سمجھتی ہو۔'' وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی پھر گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے! ابھی تو کچھ وقت ہے۔'' میرلین اسے اٹھتے دیکھ کر کہنے لگی۔

'' ہاں لیکن اب ڈاکٹر جارج کی کلاس ہے جو ایک لمحے کی تاخیر پسند نہیں کرتے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم پہلے کلاس میں چلے جائیں۔''

'' ٹھیک کہتی ہو۔'' میرلین بچی ہوئی کوک ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتار کر کھڑی ہو گئی۔

شام میں وہ جان بوجھ کر کمرے میں بند رہی۔

حالانکہ اس کے پاس صبح کی چائے کے لیے دودھ بالکل نہیں تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ بسنتی مانگنے سے بھی ایک کپ چائے کے لیے دودھ نہیں دے گی پھر بھی وہ کمرے سے نہیں نکلی مبادا راستے میں کہیں کھڑا رابنسن یہ سمجھ لے کہ وہ اس کے بلانے پر آئی ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی طرف سے اس کی حوصلہ شکنی ہی کرتی رہے گی تا کہ وہ اسے مخاطب کرنا ہی چھوڑ دے۔ بے وقوف تھی وہ جو اس کی حوصلہ شکنی کا سوچ رہی تھی، پہلے اپنے آپ کو تو سمجھاتی جو کمرے میں مقید ہو کر بھی ایک پل کے لیے سکون سے نہیں بیٹھ سکی تھی۔ مسلسل اس کا خیال۔

اس کی نیلگوں آنکھوں میں انتظار کے دیپ جل رہے ہوں گے۔

وہ راہ تک رہا ہوگا۔

اور وہ مایوس ہو گیا ہوگا۔

'' میں کیا کروں۔'' بے بسی ہی بے بسی۔ گھڑی کی طرف دیکھا، نو سے زیادہ ہو رہے تھے۔ اٹھ کر وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔

کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ ہارنے لگی۔ ایک ہی جگہ پر رہتے ہوئے مسلسل اس کی نظروں سے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں تھا۔ کبھی صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے، کبھی واپسی پر، کبھی کوریڈور میں، کبھی سیڑھیوں پر اور کبھی وہ خاص طور پر ڈھونڈتا ہوا چلا آتا۔ اور کبھی شکوہ بھی نہیں کیا کہ اس سے کتراتی کیوں ہے۔ بار بار اس کے انوائٹ کرنے پر آئی کیوں نہیں۔ جب سامنا ہوتا۔ وہ سوچتی ابھی کہے گا۔ میں کل تمہارا انتظار کرتا رہا لیکن وہ گزرے کل کی کوئی بات نہیں دہراتا تھا۔ ہمیشہ آنے والے کل کی بات کرتا۔ اسے دیکھتے ہی کہتا۔

'' تم کل آؤ گی ناں؟''

وہ حیران ہوتی۔ پشیمان بھی اور بالآخر ناں کرتے کرتے ایک دن ہاں کر بیٹھی اور جس روز ہاں کی اس روز آخری کوشش کے طور پر کچھ دنوں کے لیے انکل لغاری کے گھر چلی گئی۔ گو کہ ان کے گھر کا ماحول اس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا پھر بھی وہ دل پر جبر کر کے وہاں رہ گئی۔ آخر بسنتی کے ساتھ بھی تو رہ ہی رہی تھی۔ اس دوران اس نے یونیورسٹی سے بھی چھٹی لے لی تھی۔ انکل لغاری کی بیٹی عالیہ کبھی موڈ میں ہوتی تو بات کر لیتی ورنہ زیادہ تر اسے نظر انداز ہی کرتی تھی۔ ویسے وہ گھر پر کم ہی نظر آتی تھی۔ روزانہ شام میں اپنی دوستوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں چلی جاتی۔ البتہ انکل کی مسز اس کا خیال رکھتی تھیں۔ اکثر اسے عالیہ کے ساتھ جانے کو کہتیں لیکن وہ سہولت سے منع کر دیتی اور ان کے ساتھ کچن میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔

پورے پندرہ دن انکل لغاری کے گھر۔ رہ کر جب وہ واپس آئی تو پہلے ہی مقام پر پتا نہیں، وہ اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ یا یونہی بے سبب۔ بہرحال اس پر نظر پڑتے ہی دل و ذہن کے دریچوں پر دھیرے دھیرے دستک ہونے لگی۔

تیرے خیال سے دامن بچا کے دیکھا ہے
دل و نظر کو بہت آزما کے دیکھا ہے
نشاط جان کی قسم، تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہت دنوں تجھے ہم نے بھلا کے دیکھا ہے

وہ ہمیشہ ہنسی خوشی ہتھیار ڈالنے کی عادی تھی لیکن پہلے مقام پر کبھی نہیں۔ جب تک سمجھتی کہ ہونی کو انہونی یا انہونی کو ہونی کر سکتی ہے، تب تک اپنے دفاع کے لیے ہر حربہ استعمال کرتی تھی۔ اپنی آخری کوشش کے بعد جب یقین ہو جاتا کہ وہ حالات کو اپنے حق میں نہیں لا سکتی یا اس کے مقدر ہی میں ایسا کچھ لکھا ہے، تب وہ ہتھیار ڈالتے ہی اپنے اندر ایک نیا عزم پیدا کر لیتی تھی۔ اب بھی یعنی زندگی کے اس موڑ پر بھی وہ گزشتہ ایک سال سے تو کوشش کر رہی تھی اپنا دفاع کرنے کی لیکن اوپر والے کو پتا نہیں کیا منظور تھا کہ نہ تو رابنسن اس کے رویے سے مایوس ہو کر راستے سے ہٹا اور نہ وہ اپنے دل کو ہی سمجھا سکی تھی۔ اور اس کی اب تک کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے رو رہی تھی۔ اس کے آنسو موتیوں کی صورت پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر میز کی شفاف سطح پر چمک رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اپنی ہتھیلی اس پر جہاں اس کے آنسو گر ہے تھے۔ رکھتے

ہوئے کہنے لگا۔

"میں تم سے رونے کا سبب نہیں پوچھوں گا لیکن پلیز اس طرح مت روؤ۔ مجھے بے حد دکھ ہو رہا ہے۔" اور وہ شکست خوردہ تھی۔ تلخ ہو گئی۔ اس سے لڑ بیٹھی۔

"کیوں۔ کیوں سبب نہیں پوچھو گے۔"

"اس لیے کہ۔" وہ سمجھ نہیں پایا، کیا کہے۔

"چپ کیوں ہو گئے۔ بولو مجھے بتاؤ، کیا تم سب کے ساتھ ایسے ہو یا صرف میرے ساتھ ایسا رویہ روا رکھا ہے تم نے۔ اول روز میں تمہیں نظر انداز کرتی ہوئی گئی۔ تم نے نہیں پوچھا۔ اس کے بعد میرا گریز پھر بارہا تم سے ہامی بھرنے کے باوجود میں نے تمہیں انتظار کی اذیت کے سوا اور کچھ نہیں دیا لیکن تم نے کبھی سبب نہیں پوچھا۔ کیوں۔" وہ اور شدت سے رونے لگی۔ "تمہارے ہاتھوں میں آس کی کیسی ڈور ہے جو اس تمام عرصے میں پھیلی نہیں ٹوٹی نہیں۔"

"یہ ڈور تو میری سانسوں کے ساتھ بندھی ہے۔ ٹوٹ جاتی تو باقی کیا بچتا۔" اس کے آزردہ لہجے پر وہ بھیگی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ کہنے لگا۔

"تمہیں شاید یاد نہ ہو۔ میں نے پہلی ملاقات میں ہی تم سے کہا تھا کہ مجھے تمہارے ہاتھوں اگنور ہونا اچھا لگا۔ اسی طرح تمہارا گریز اور تمہارا بخشا ہوا انتظار بھی اچھا لگتا تھا اور جو بات اچھی لگے اس کا سبب نہیں پوچھتے، بس آنکھوں کے رستے دل میں اتار لیتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے، تمہیں میرا رونا بھی اچھا لگ رہا ہے۔" وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

"نہیں۔" وہ اس کی اپنائیت بھری خفگی پر ہلکے سے مسکرایا۔ "میں تمہارے رونے کا سبب جان گیا ہوں پھر پوچھنے کا کیا سوال۔"

"کیا جان گئے ہو؟"

"یہی کہ تم اپنے آپ سے لڑتے لڑتے ہار گئی ہو اور صرف تم ہی نہیں نومیہ! میں بھی اپنے آپ سے بہت لڑا ہوں۔ بہت سمجھایا اپنے آپ کو کہ تمہارے اور میرے بیچ جو خلیج حائل ہے۔ اسے نہ تم عبور کر سکتی ہو اور نہ میں لیکن یہ جو پاگل دل ہے ناں، یہ کچھ بھی سننے کو

تیار نہیں ہوا۔ بارہا سوچا، واپس چلا جاؤں۔ شاید تم سے دور رہ کر تمہارے خیال سے دامن بچا سکوں لیکن۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ پھر اس کی بے حد خاموش آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ کوئی ایسی بات نہیں کروں گا، جو تمہارے لیے باعثِ دکھ، ندامت یا خود اپنے آپ کے لیے باعثِ ملامت ہو۔ بس اتنی آرزو ہے کہ یہ جتنا عرصہ تم یہاں ہو، میری زندگی کے صحرا میں اپنی مسکراہٹوں کے پھول کھلا دو تا کہ میری بقیہ زندگی ان پھولوں کی آبیاری میں با آسانی کٹ سکے۔"

"آئی ایم سوری۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"میں سبب نہیں پوچھوں گا۔" وہ مسکرایا اور اس کے شاکی نظروں سے دیکھنے پر کہنے لگا۔ "اس لیے کہ میں جانتا ہوں۔"

"کیا جانتے ہو۔"

"یہی کہ تم مسلمان ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مسلمان اپنے عقیدے میں اٹل ہوتے ہیں۔ اپنے مذہب کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں نہ چلیں لیکن اس کی لگائی ہوئی حد بندیاں کبھی نہیں توڑتے۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور اگر یہی بات اس کا کوئی ہم مذہب کہتا تو وہ اعتراف کرتے ہوئے کڑھتی لیکن مقابل غیر مسلم تھا اور اس کے سامنے پہلے ہی مقام پر کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی؟ اس لیے فوراً کہنے لگی۔

"نہیں، مسلمان مذہب کے بتائے ہوئے راستوں پر بھی ضرور چلتے ہیں۔"

"چلو۔ تم نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔" وہ اس کی بات مان گیا تو وہ کہنے لگی۔

"جب تم ہمارے بارے میں جانتے ہو تو پھر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں نے کہا ناں۔ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ بس اتنا یقین کر لو کہ رابنسن مارک ایک بے ضرر سا بندہ ہے اس خوف سے اس سے گریز مت کرو کہ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائے گا۔ کبھی نہیں۔ اور پلیز اب مزید مجھے اگنور مت کرو اور نہ ہی مجھے انتظار گاہ پر کھڑا کر کے خود غائب ہو جاؤ، میں جانتا ہوں ایسا کر کے تم خود بھی سکون سے نہیں رہتیں۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" اعتراف بھی تھا اور اچھنبا بھی۔

"بس میں جانتا ہوں۔"

"یہ تم ہر بات کیسے جان لیتے ہو؟"

"سب کے بارے میں نہیں تمہارے بارے میں دعوا کر سکتا ہوں۔" اس سے پہلے کہ وہ اس کی کیفیات کے بارے میں مزید انکشاف کرتا وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب چلو۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔"

"ڈرتی ہو؟" وہ اس پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

"کس سے؟"

"مجھ سے کہ کہیں میں تم میں دراڑیں نہ ڈال دوں۔ تم جو ندی کے اس طرف کھڑی ہو۔ تمہارا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف نہ کھینچ لوں۔"

"نہیں۔" وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ "ابھی تم نے خود اعتراف کیا ہے کہ ہم اپنے عقیدے میں بہت اٹل ہوتے ہیں، پھر تم نے مجھے کمزور کیسے سمجھ لیا۔ اور رہی ہاتھ پکڑ کر کھینچنے کی بات تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یا تو تم منہ کے بل گرو گے یا پھر میرے ایمان کی روشنی میں خود کھنچے چلے آؤ گے۔"

"آئی ایم سوری۔ تمہیں شاید میری بات بری لگی۔"

"نہیں۔" وہ اپنے ایک دم جذباتی ہو جانے پر دل ہی دل میں ندامت محسوس کرتے ہوئے بولی۔

"اچھا چلو اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ میرے کمرے میں چلو۔ میں تمہیں بہت اچھی سی چائے پلاؤں گا۔"

"جب تمہارے ساتھ یہاں تک آ گئی ہوں تو تمہارے کمرے میں جانے پر کیا اعتراض کروں گی۔"

"گڈ!" وہ اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ دونوں کیفے سے باہر نکلے تو تاریکی اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ ہاسٹل زیادہ دور نہیں تھا اور پھر اب تو وہ ساتھ تھی جس کے ساتھ وہ بقیہ تمام عمر کی مسافت کی خواہش رکھتا تھا۔ اور جانتا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے اس لیے یہ تھوڑی مسافت ہی غنیمت لگی۔ ایک سرشاری کے عالم میں راستہ طے کیا اور جب اس کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو لائٹ آن کرتے ہی خاصا شرمندہ ہو گیا۔ کمرے کی حالت انتہائی خراب تھی۔

"پلیز ایک منٹ۔" اس نے کہا اور جلدی جلدی پھیلی ہوئی چیزیں سمیٹنے لگا۔ وہ کھڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ اس کی مدد ہی کر دے۔ چیزیں سمیٹ کر

وہ چائے بنانے کمرے کے ایک طرف بنے چھوٹے سے کچن میں چلا گیا اور وہ سامنے میز پر پڑا البم اٹھا کر دیکھنے لگی اور ایک تصویر دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

"کون ہے۔" وہ ذہن پر زور دینے لگی۔ اُسی وقت وہ چائے لے کر آ گیا تو وہ البم رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"میرا خیال یہ ہے کہ میں چائے اچھی بناتا ہوں۔ اب پتا نہیں تمہیں کیسی لگتی ہے۔" وہ کپ اسے تھما کر سامنے کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ پھر جیسے ہی اس نے پہلا گھونٹ پیا پوچھنے لگا۔

"کیسی ہے؟" وہ ہنس پڑی۔

"چائے واقعی اچھی ہے۔"

"تھینکس گاڈ، ورنہ مجھے ہمیشہ افسوس رہتا۔ کہ میں تمہیں اچھی سی چائے بھی نہ پلا سکا۔" وہ کچھ نہیں بولی قصداً اس کی بات ان سنی کر کے چائے پینے میں لگی رہی پھر آخری گھونٹ کے بعد ہی اس کی طرف متوجہ ہوئی اور کہنے لگی۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"تم ہر بات بلا جھجک پوچھ سکتی ہو۔" وہ اسے مان دے رہا تھا۔ پھر بھی وہ فوراً کچھ نہیں کہہ سکی۔ پہلے ہاتھ میں پکڑا خالی کپ سائیڈ میں ٹیبل پر رکھا پھر البم، اس کے بعد کہنے لگی۔

"میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ دنیا بھر سے لوگ پڑھنے کے لیے امریکہ جاتے ہیں۔ اور تم امریکہ سے یہاں آئے ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"کاش ہم بہت پہلے کہیں ملے ہوتے تو اس وقت میں کہتا تمہاری خاطر البتہ اب جو بھی مجھ سے پوچھے گا میں یہی کہوں گا کہ میں تمہارے لیے یہاں رکا ہوا ہوں۔"

"تم خوبصورتی سے میری بات ٹال رہے ہو۔"

"افوہ!" خجل سا ہو کر ہنسا پھر سوچتا ہوا بولا۔

"تمہاری بات کے جواب میں مجھے بہت کچھ بتانا پڑے گا۔"

"اگر کوئی ایسی بات ہے جو تم بتانا نہیں چاہتے تو پلیز اس بات کو یہیں ختم کر دو۔"

وہ اسے سوچتے دیکھ کر جلدی سے

"یہ بات نہیں ہے نومیہ، میں تو خود ایک عرصے سے کہنا چاہتا ہوں لیکن کوئی سننے والا ہی نہیں تھا۔ اور اب تم سننا چاہتی ہو تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہاں سے شروع کروں۔" وہ ذرا سا سر اونچا کیے سامنے دیوار پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اور وہ اُس کی نیلگوں آنکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتی جا رہی تھی۔

"میں بمشکل ایک سال کا تھا جب میرے ممی ڈیڈی میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ اپنے ڈیڈی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا کیونکہ میں کبھی ان سے نہیں ملا۔ بس ایک بار ممی نے بتایا کہ ان سے علیحدگی کے بعد وہ ساؤتھ امریکہ چلے گئے تھے۔ میں ممی کے پاس رہا۔ بس صرف دو سال، میرا مطلب ہے جب میں تین سال کا ہوا تو ممی نے مجھے بورڈنگ میں ڈال دیا تھا۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

"ان ہی دنوں ممی نے دوسری شادی کر لی ایک پاکستانی مرد کے ساتھ۔ اور اگر تمہیں یاد ہو تو میں نے تم سے کہا تھا کہ پاکستانی دوسرے کی ذات کو اگنور کرنے میں ماسٹر ہوتے ہیں، یہ بات میں نے یونہی نہیں بلکہ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہی تھی۔ میں اس شخص کے ہاتھوں بری طرح اگنور ہوا۔ گو کہ میں بورڈنگ میں رہتا تھا لیکن ہر ویک اینڈ پر جب ممی مجھے گھر لے کر آتیں تو وہ شخص کبھی میری طرف متوجہ نہیں ہوا، پتا نہیں ممی نے اس کے رویے کو محسوس کیا یا نہیں۔ لیکن میرا چھوٹا سا ذہن بری طرح متاثر ہوا تھا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں جب ذرا سا سمجھدار ہوا تو ممی کے ساتھ گھر جانا چھوڑ دیا۔ وہ جب آتیں، میں کچھ دیر کے لیے انہیں اپنے پاس روک لیتا۔ پھر جب وہ مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہتیں تو میں صاف منع کر دیتا۔ اتنے عرصے میں وہ اس شخص کے دو بچوں کی ماں بن چکی تھیں۔ بہر حال میرے ساتھ اس شخص کا رویہ جیسا بھی تھا۔ ممی کے ساتھ وہ ضرور مخلص تھا کیونکہ اب تک ممی اس کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔" وہ پھر اس انداز سے خاموش ہوا جیسے مزید کچھ کہنے کے لیے سوچ رہا ہو، جبھی اُس نے ٹوکا نہیں۔ چپ چاپ دیکھنے لگی۔

"جب تک ممی امریکہ میں رہیں میری اُن سے ملاقات ہوتی رہی۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بہت خوش تھیں۔

تقریباً پانچ سال پہلے کی بات ہے، ایک دن ممی میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ ان کے شوہر کو ویسٹ انڈیز میں بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔ اور اب وہ وہاں جا رہی

ہیں۔ اور پتا ہے نومیہ اس وقت میں ممی کو بغور دیکھ رہا تھا اور منتظر تھا کہ ابھی وہ مجھ سے اصرار کریں گی، منت کریں گی کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں اور انہوں نے کہا بھی لیکن بے حد سرسری انداز میں۔"

"تم بھی چلے چلو رابی۔" یہ ان کے الفاظ تھے، جیسے نہ چاہتے ہوئے کہے گئے ہوں۔ میرا دل چاہا میں اُن سے کہوں، میں بھی آپ کے پیٹ کی اولاد ہوں، پھر مجھ میں اور ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ جو انہیں آپ لمحہ بھر کے لیے خود سے جدا نہیں کرنا چاہتیں۔ میرے پاس ہوتی ہیں تب بھی ان کا خیال۔ جبکہ اب ان کے ساتھ جاتے ہوئے آپ کو میرا ذرا بھی خیال نہیں۔ لیکن میں خاموش رہا۔ بلکہ ان کی بات رکھنے کی خاطر کہا کہ میں چلا تو چلوں لیکن ان کے شوہر مجھے برداشت نہیں کریں گے۔ اس پر وہ کہنے لگیں۔ انہیں تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جوان بیٹی کی وجہ سے وہ گھر میں کسی غیر مسلم کی آمد پسند نہیں کرتے۔ اور تب میں نے بے حد حیران ہو کر ان سے پوچھا تھا کہ وہ اس بارے میں کیا کہتی ہیں۔ جواباً وہ اطمینان سے بولی تھیں۔ وہ غلط نہیں کہتے، ہمارے مذہب میں یہ انتہائی نا مناسب بات ہے......" بات کے اختتام پر وہ یونہی نظروں کا زاویہ بدل کر اُس کی کھلی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اور اس نے کوشش کر کے اپنی آنکھوں کو اس پر جما رہنے دیا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کسی بھی غیر اخلاقی حرکت سے وہ اس بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے برعکس نظریں اس پر جما کر گویا یہ باور کرا دیا کہ اس کے ممی نے غلط نہیں کہا تھا۔

"بہر حال۔" وہ پھر وہ گویا ہوا۔" اس وقت میں نے ممی سے کہا کہ وہ سب کو چھوڑ دیں اور میرے پاس رہیں۔ میں چند سالوں میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ انہیں بہترین زندگی دے سکوں۔ لیکن ممی نہیں مانیں۔ اور مجھے چھوڑ کر چلی آئیں۔ اس وقت میں بہت ٹوٹ گیا تھا۔ ایک دم سے تنہا ہو گیا۔ ممی مجھے انتہائی سنگدل عورت لگیں۔ اور میں نے سوچا تھا شاید اب میں خود بھی کبھی ان سے نہیں ملنا چاہوں گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ میرا دل ان سے ملنے کے لیے مچلنے لگا۔ پھر بھی میں نے اپنے آپ پر بہت جبر کیا۔ یعنی تین سال خود کو سمجھانے میں گزار دیے۔ لیکن میری ساری کوششیں بے سود کیونکہ میں دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ آخر گزشتہ سال میں یہاں چلا آیا۔" وہ جیسے تھک کر چپ ہوا تھا۔ اور فوری طور پر

وہ بھی کچھ نہیں بول سکی۔ لمحے چپ چاپ سرکنے لگے، پھر جب خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تب اسے بولنا پڑا۔

''یہاں آکر تم اپنی ممی سے ملے؟''

''نہیں۔'' نہیں کی صورت اُس نے گہری سانس لی۔ پھر خود ہی وضاحت کرتا ہوا بولا'' مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہیں۔ کیونکہ یہاں آنے کے بعد سے انہوں نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ ویسے میں انہیں تلاش کرتا رہا ہوں۔ اَب بھی کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کبھی سرراہ ملاقات ہو جائے اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر آیا اور جو البم وہ ابھی کچھ دیر پہلے دیکھ رہی تھی۔ اُسے اٹھا کر آخری سے پہلے والی تصویر اُس کے سامنے کرتا ہوا بولا۔

''یہ میری ممی ہیں؟''

''اچھا'' اسے بالکل یاد نہیں رہا کہ کچھ دیر پہلے وہ اسی تصویر میں الجھ رہی تھی۔ ورنہ اس سے ضرور کہتی کہ وہ اس خاتون کو کہیں دیکھ چکی ہے۔

''یہ بہت پرانی تصویر ہے۔'' وہ بتانے لگا'' اَب ممی ایسے ڈریس نہیں پہنتیں۔ اور ان کے بال بھی اَب کافی لمبے ہیں۔'' وہ کھل کر مسکرائی اور جیسے ہی گھڑی پر نظر پڑی ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی

''میرے خدا اتنی دیر ہوگئی۔''

''تمہیں کون سا دور جانا ہے۔''

''پھر بھی۔ اتنی رات تک اپنے کمرے سے باہر رہنا اچھی بات نہیں ہے۔''

''چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔'' وہ اُس کے ساتھ ساتھ چلنے کیلئے تیار ہو گیا۔

''نہیں'' تم بس دروازے سے دیکھو میں چلی جاؤں گی۔''

''او کے۔'' وہ دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ اور جب کوریڈور کے اختتام پر مڑنے سے پہلے اس نے ہاتھ ہلایا تو وہ ایک غیر اختیاری حرکت کرتے کرتے فوراً سنبھل گیا اور وہ سمجھ کر جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ اپنے دروازے تک آتے ہی بسنتی کا خیال آیا اور اس نے دعا کی خدا کرے وہ سو چکی ہوتا کہ اس کی طنزیہ نظروں اور باتوں سے اس کا خوشگوار موڈ خراب نہ ہو۔ اپنی طرف سے وہ بہت احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی، پھر بھی بسنتی جو دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ فوراً گردن موڑ کر کہنے لگی۔

''کیا تم میرے انتظار میں جاگ رہی ہو؟'' وہ یونہی کہہ گئی۔

''نہیں۔'' خلاف عادت بسنتی نے تڑخ کر جواب نہیں دیا۔ اور نہ ہی اُس کی بات کا برا مانا۔ پہلے اٹھ کر بیٹھی پھر تکیہ کمر کے پیچھے لگا کہ بیڈ کی پٹی سے لٹکاتے ہوئے بولی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس وجہ سے نیند بھی نہیں آ رہی۔''

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' وہ پوری طرح متوجہ ہوئی اور اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگی۔

''پتا نہیں شام میں ٹھیک تھی۔ پھر اچانک بدن میں درد ہوا اور اَب تو بخار بھی ہو گیا ہے۔''

''کوئی میڈیسن لی۔''

''نہیں اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ جا کر کوئی میڈیسن لا سکوں۔'' وہ بول بھی رُک رُک کر رہی تھی۔

''کمال ہے، مجھ سے کہا ہوتا۔'' پھر فوراً احساس ہوا تو کہنے لگی۔ ''سوری میں تو شام سے کمرے میں آئی ہی نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو خیر اگر تم کہو تو میں ابھی بھی کوشش کر سکتی ہوں۔''

''کیا کرو گی؟'' وہ سوچ میں پڑ گئی، پھر اچانک خیال آیا تو کہنے لگی۔

''فرسٹ فلور پر پرکاش کھنہ سے کوئی نہ کوئی ٹیبلٹ مل جائے گی۔ مجھے میرلین نے بتایا تھا کہ وہ ہر قسم کی ٹیبلٹ اپنی جیب میں رکھتا ہے۔''

''میرا خیال ہے رہنے دو۔ صبح دیکھیں گے۔'' اس کی ساری بات سن کر بسنتی نے کہا تو اس کا دل چاہا وہ ''تمہاری مرضی'' کہہ کر خود اطمینان سے سو جائے۔ لیکن ابھی وہ اخلاقی طور پر اتنی دیوالیہ نہیں ہوئی تھی کہ اسے اس حال میں چھوڑ کر خود سو جائے۔ کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

''تم سونے کی کوشش کرو، شاید نیند آ جائے۔''

''کتنی دیر سے تو کوشش کر رہی ہوں۔ اصل میں میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔'' وہ اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے بولی۔

''اسپرین تو خیر میرے پاس بھی ہوگی۔ ٹھہرو پہلے میں چائے بنا لاؤں۔'' وہ فوراً

کچن میں چلی گئی۔ اور منٹوں میں چائے بنا کر لے آئی۔ پھر چائے کے ساتھ اسے اسپرین دے کر کرسی اس کے قریب کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اور یونہی ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کا دھیان ہٹانے لگی۔

''میری وجہ سے تمہیں تکلیف ہوئی۔'' بسنتی خالی مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''بالکل نہیں۔ اب تم سو جاؤ'' وہ کہتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ مگ رکھ کر واپس آئی تو بسنتی تکیہ نیچے کھسکا کر لیٹ رہی تھی۔ اس نے لائٹ آف کر کے نائٹ بلب جلایا۔ پھر اس کے پاس آ بیٹھی اور آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگی۔

''رہنے دو۔'' اُس نے روکا، لیکن وہ نہیں مانی۔ اپنی نرم نرم انگلیوں سے اس کے بالوں میں مساج کرنے لگی۔ جس سے جلد ہی اسے نیند آ گئی۔ تب وہ بہت آہستگی سے اٹھ کر اپنی جگہ پر آ لیٹی۔

پھر اگلے تین چار دن تک اس نے بڑے خلوص سے بسنتی کی تیمار داری کی جس سے وہ متاثر تو ہوئی ہی، اس کے رویے میں بھی خاصا فرق آ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے لیے چائے بناتے ہوئے اس کے لیے بھی بنانے لگی تھی۔ اور گفتگو بھی دوستانہ ماحول میں کرتی۔ جس سے کئی بار اس نے سوچا۔

''کاش! یہاں آنے کے کچھ روز بعد ہی بسنتی بیمار پڑ گئی ہوتی تو ماحول اس وقت سے خوشگوار ہو جاتا۔''



زندگی میں جب خوشگوار لمحے در آئیں تو پتا نہیں وقت کو پر کیوں لگ جاتے ہیں۔ وہ حیران ہوتی، پہلے وہ دنوں کو انگلیوں پر شمار کرتی تھی اور اب مہینوں کے گزرنے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ یہاں آنے کے ایک سال بعد تک اس نے سوچا تھا کہ پتا نہیں آئندہ برس کیسے گزریں گے، اور اب مڑ کر تین برس پیچھے دیکھتی تو لگتا جیسے ابھی تو یہاں آئی تھی۔ یہ یقیناً رابنسن مارک کی سنگت کا کمال تھا۔ جو خود بھی تیزی سے گزرتے وقت سے بوکھلایا ہوا تھا۔

''جانا تو بہر حال ہے، پھر کیوں ابھی سے اس وقت کو سوچ کر پریشان ہوں۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں سوچ کر مگن سی ہو گئی تھی۔ ان دنوں اس کے اندر کے سارے موسم ایک

جیسے تھے یا ایک ہی موسم آ کر ٹھہر گیا تھا۔ رنگوں اور خوشبوؤں کا موسم۔ جس نے اس کے چہرے کی شادابی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اس روز وہ عطا کو خط لکھنے بیٹھی تو انجانے میں اپنے اندر کا احوال یوں لکھ گئی۔

پتا ہے عطا یہاں کا موسم بے حد خوشگوار ہے وحالانکہ بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ کلیاں چٹکتی ہوئی فضا میں مہکتی ہوئی۔ میں بتا نہیں سکتی کہ میرا کیا دل چاہتا ہے۔ شاید مر جانے کو۔

اور عطا نادان نہیں تھا۔ کافی کچھ سمجھ گیا! مائی ڈیر نومیہ سیف الرحمٰن! سچ سچ بتاؤ تم نے ویسٹ انڈیز کے موسم کا حال لکھا ہے یا اپنے دل کا۔ اور یہ بھی ضرور بتانا تمہارے دل کی کلیوں کو چٹکانے والا کون ہے۔

وہ اس خط کو پڑھ کر بے حد حیران ہوئی کہ اس نے کیسے جان لیا تھا۔ حالانکہ اس نے تو ایسی کوئی بات نہیں لکھی تھی۔ اشارتاً بھی رابنسن کا ذکر نہیں کیا۔ اور اگر اس کے اور رابی کے درمیان مذہب کی خلیج حائل نہ ہوتی تو وہ ضرور عطا کو اس کے بارے میں تفصیل سے لکھتی۔ کیونکہ وہی اس کا واحد دوست تھا۔ لیکن اَب کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ کہانی یہیں ختم ہو جائے گی۔ اس لیے جب اس نے دوبارہ عطا کو خط لکھا تو صاف مکر گئی تھی۔ اس کے بعد کوئی تین مہینے کے وقفے سے عطا کا خط آیا، وہ بھی ہارورڈ یونیورسٹی سے۔ وہ اسپلائزیشن کے لیے اسکالرشپ پر گیا تھا۔ اسے بے حد خوشی ہوئی۔ اور وہ اسے خط میں لکھنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ ان دنوں وہ پریکٹیکلز کی وجہ سے بہت مصروف تھی۔ صبح سات بجے اسے ہاسپٹل پہنچنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد سارا دن کھانے تک کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اکثر جب شام ڈھل چکی ہوتی، تب اس کی واپسی ہوتی تھی۔ اور اس وقت وہ اتنی تھکی ہوئی کہ بڑی مشکل سے منہ ہاتھ دھو کر۔ ڈائننگ ہال تک جاتی۔ کھانا بڑی عجلت میں کھاتی۔ اس کے بعد کمرے میں آتے ہی بیڈ پر گر جاتی پھر صبح ہی آنکھ کھلتی تھی۔ اتنی ٹف زندگی کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

خدا خدا کر کے تیسرا سال ختم ہوا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اَب کم از کم پندرہ بیس دن تک تو وہ بالکل فارغ تھی۔ اسی شام وہ خاصے فریش موڈ میں نیچے اتری تو لان میں رابی مل گیا۔ اسے دیکھ کر اپنے دلنشین انداز میں مسکرایا۔

''تھینکس گاڈ، تمہاری فریش شکل دیکھنے کو ملی، ورنہ میں تو سمجھا تھا تم بیمار پڑ جاؤ گی۔''

’’خدشہ تو مجھے بھی تھا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے۔‘‘

’’کہیں باہر چلو گی؟‘‘

’’نہیں بالکل موڈ نہیں ہے، یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔‘‘

اس کے ساتھ ہی وہ سنگی بینچ کی طرف بڑھ گئی۔ اور وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا آیا پھر ساتھ بیٹھا تو پوچھنے لگا۔

’’ان چھٹیوں میں کیا پروگرام ہے۔‘‘

’’انتہائی بور۔‘‘ وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

’’کیا مطلب؟ وہ فوراً پوچھنے لگا۔

’’مجھے انکل لغاری کے گھر جانا ہے۔ کل ہی انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ اس وقت تو میں نے منع کر دیا۔ لیکن اب منع نہیں کر سکوں گی۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’کیونکہ یہ میرے ڈیڈی کا حکم ہے۔ اُنہوں نے خود کلامی کے انداز میں بولا۔ پھر ایک دم خاموش ہو گیا۔

’’کم آن رابی! کوئی اتنے بہت سارے دن تو نہیں ہیں۔ پھر میں کوشش کروں گی، ہفتے بھر بعد ہی واپس آ جاؤں۔ ویسے بھی میرا وہاں دل نہیں لگتا۔‘‘

’’کون کون ہے اُن کے گھر میں؟‘‘ اُس نے یونہی پوچھا۔

’’زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ ایک بیٹا جو یہاں نہیں رہتا۔ اور بیٹی جس کے ساتھ میری بالکل انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے، البتہ آنٹی بہت اچھی ہیں میرا زیادہ وقت ان ہی کے ساتھ گزرتا ہے۔‘‘

’’اچھا!‘‘ اُس نے گہری سانس لی پھر کہنے لگا۔

’’میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ لیکن یہ ضرور یاد رکھنا کہ ٹھیک دس دن بعد میری برتھ ڈے ہے۔ اور تمہیں ہر حال میں آنا ہے۔‘‘

’’مجھے یاد ہے اور میں اس سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔‘‘

’’چلو اس وقت میں تمہیں اپنے ہاتھ کی چائے پلاؤں۔‘‘ وہ منع کرتے کرتے رہ گئی اور اُٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

اگلے دن وہ انکل لغاری کے گھر چلی گئی۔ گو کہ یہاں گھر کا سا ماحول تھا۔ لیکن محض عالیہ کی سرد مہری اسے جلد بیزار کر دیتی تھی۔ حالانکہ اس کی عادت ہی ایسی تھی۔ لیکن اسے لگتا جیسے وہ صرف اس کے ساتھ اس طرح پیش آتی ہے۔ بہت رسمی سے انداز میں حال احوال پوچھتی۔ اس کے بعد بالکل لاتعلق ہو جاتی۔ اس بار اس نے بھی اس سے زیادہ بات کرنے کی کوشش نہیں کی، سارا دن آنٹی کے ساتھ لگی رہتی۔ وہ جو بھی کام کرتیں ان کا ہاتھ بٹاتی اور جب وہ فارغ بیٹھتیں تو ان کے ساتھ گپ شپ لگاتی۔ اس وقت بھی وہ فراغت سے بیٹھی تھیں۔

’’کس قدر گرمی ہے۔‘‘ وہ اپنے بالوں کو بل دیتے ہوئے بولیں۔ پھر جیسے ہی انہوں نے بل دیتے ہوئے بالوں کو سر کے اوپر سے چکر دے کر سائیڈ میں کلپ لگایا تو وہ ایک دم چونک کر دیکھنے لگی، پھر فوراً تو نہیں لیکن ذہن پر زور دینے کے بعد اسے یاد آیا کہ وہ کس سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اور صرف مشابہت ہی نہیں ہو بہو وہی تصویر تھی، بس ذرا سا فرق درمیانی سالوں کا تھا۔

’’ایک بات پوچھوں آنٹی، آپ برا تو نہیں مانیں گی۔‘‘ وہ سوچ کر بولی۔

’’پوچھو۔‘‘ وہ مسکرائیں۔

’’آپ کا آصف کے علاوہ کوئی اور بیٹا بھی ہے؟‘‘

اس کا خیال تھا۔ وہ چونکیں گی لیکن اُنہوں نے سہولت سے اعتراف کیا۔

’’ہاں۔‘‘

’’رابنسن مارک!‘‘

’’ارے، کیا تم اسے جانتی ہو؟‘‘ انہوں نے خوشگوار حیرت کا مظاہرہ کیا۔

’’ہاں!‘‘

’’کہاں ملاقات ہوئی؟‘‘

’’یہیں، وہ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔‘‘

’’ریئلی!‘‘ وہ خوشی کے ساتھ غیر یقینی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

’’کیا رابی نے تمہیں میرے بارے میں بتایا ہے؟‘‘

’’جی۔!‘‘

’’وہ میرے پاس آیا کیوں نہیں۔ کیا ناراض ہے؟‘‘

"نہیں، اصل میں اسے آپ کے گھر کا معلوم نہیں ہے، ورنہ ضرور آتا۔ اب میں اسے بتاؤں گی، بلکہ آپ چلیں میرے ساتھ، پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"ابھی نہیں آنٹی! پرسوں اس کی برتھ ڈے ہے، پھر چلیں گے، وہ آپ کو دیکھ کر بہت حیران ہوگا۔ اور خوش بھی۔"

"کیسا ہے وہ؟" ان کے لہجے میں حسرت سما گئی۔" مجھے اس کی بہت فکر رہتی ہے۔"

"بظاہر ٹھیک ہے وہ؟ لیکن میں جانتی ہوں وہ آپ کے بنا بہت ادھورا ہے۔ آپ نے اسے تنہا کیوں چھوڑ دیا؟"

"کیا کرتی۔ میرے پاس یہی دو راستے تھے، اسے چھوڑ دیتی یا ان سب کو۔" وہ دکھ سے بولیں۔

"کیوں کیا انکل اسے پسند نہیں کرتے۔" وہ پوچھے بغیر رہ نہیں سکی۔

"بات پسند ناپسند کی نہیں ہے نومیہ، ساری غلطی میری ہے۔" وہ کہنے لگیں۔

"میں لغاری سے شادی کے وقت ہی مسلمان ہوگئی تھی۔ اس وقت رابی تین سال کا تھا۔ اور مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے اسے ہاسٹل میں رہنے دیا۔ جس سے ہم ماں بیٹے کے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی ہوگئی۔ اصل میں اس وقت میں سوچ ہی نہیں سکی تھی کہ ایسا ہو جائے گا۔ اور لغاری نے بھی مجھے احساس نہیں دلایا! قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"مجھے جب احساس ہوا اس وقت کافی دیر ہو چکی تھی، پھر بھی میں نے بہت کوشش کی کہ رابی ہمارے راستے پر چل سکے، لیکن کم عمری ہی میں اس کی سوچ اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ وہ میری ہر بات کو جھٹلاتا چلا گیا وہ نہ خدا کو مانتا ہے اور نہ یسوع مسیح کو۔ اس کا کوئی مذہب نہیں۔ اور اپنے بارے میں، میں یہی کہوں گی کہ یقیناً خدا کو میری بھلائی منظور تھی۔ جبھی اس نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔ میرے دل کو ایمان کی روشنی سے منور کیا۔ اور وہ ہے ناں کہ تم ایک قدم بڑھو، وہ دس قدم بڑھ کر تمہیں تھام لے گا۔ تو اس کی زندہ مثال میں تمہارے سامنے ہوں۔ میں رابی کی ماں ہوں۔ اس سے بے حد محبت کرتی ہوں لیکن جب کبھی یہ سوچتی ہوں کہ سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس چلی جاؤں تو پتا نہیں کیسے اسی پل میرے دل پر مہر سی لگ جاتی ہے، میرا دل اس کی طرف سے سخت ہو جاتا ہے۔" اور میں اس کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیتی ہوں۔" کچھ دیر خاموش رہ کر جانے کیا سوچتی رہیں پھر پوچھنے لگیں۔

"پھر تم اسے سمجھاؤ کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہے۔"

"میں۔" اسے یہ کام بہت مشکل لگا۔

"کوشش تو کر دیکھو بیٹا! ہو سکتا ہے، وہ تمہاری بات سمجھ جائے۔"

"جی!" اس نے یونہی کہہ دیا۔ ورنہ اس معاملے میں اسے اپنے آپ پر قطعی اعتماد نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اولین پانچ ارکان کے نام جاننے اور ان پر یقین یا ایمان رکھنے والی مسلمان تھی۔

توحید!

نماز! کبھی پڑھی کبھی نہیں۔

روزہ! اس عمر میں سب ہی شوق سے روزے رکھتے ہیں۔

زکوٰۃ! جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ فی الحال ممی ڈیڈی کا شعبہ ہے۔

حج! شاید بوڑھے لوگ کرتے ہیں۔ وہ بھی بوڑھی ہوگی تو ضرور کرے گی۔ اس کے علاوہ انٹر تک کورس کی کتابوں میں اس نے جو کچھ پڑھا تھا۔ بہر حال اپنی حد تک وہ پھر بھی بہت کچھ جانتی تھی۔ اس کا مذہب کتنا وسیع ہے اور اس میں کتنی آسانیاں ہیں اور اپنے ہم مذہب کے ساتھ بیٹھ کر وہ اپنے مذہب کے سہارے میں یقیناً سیر حاصل گفتگو کر سکتی تھی۔ لیکن کسی غیر مسلم کے سامنے دلیل کے ساتھ بات کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔



اس نے رابی سے کہا تھا کہ وہ اس کی برتھ ڈے سے پہلے ہی آجائے گی، لیکن پھر آنٹی کے ساتھ اس نے پروگرام بنایا تھا کہ وہ عین وقت پر ان کے ساتھ جائے گی، پھر اپنے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے اس شام وہ آنٹی کو لے کر ہاسٹل آئی۔ انہیں اپنے کمرے میں بنستی کے پاس چھوڑا۔ پھر اس کی طرف چل پڑی۔ محض اس کا موڈ دیکھنے کی خاطر کیونکہ اس کا خیال تھا وہ اس کے دیر سے آنے پر خفا ہوگا۔ اور جب وہ اسے منانے میں ناکام ہوگی تب ایک دم آنٹی کو بلا لائے گی۔ شاید وہ بھول گئی تھی کہ وہ کبھی خفا نہیں ہوا، کبھی شکوہ نہیں کیا اور نہ کبھی گزری کل کی بات دہراتا تھا۔

جب وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ ایزی چیئر پر قدرے نیم دراز تھا۔ بیک پر سر ٹکائے اس کی نظریں دیوار کی آخری حدوں پر جمی تھیں۔ آہٹ پر وہ چونکا نہیں، جیسے

اسے یقین ہو کہ وہ ابھی ابھی یہاں آئے گی، جس زاویے سے بیٹھا تھا۔ اسی طرح بیٹھا رہا۔ بس نظریں دیوار سے ہٹا کر اس پر جما دی تھیں کہ وہ کچھ نروس سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پورے کمرے میں سالگرہ کا کوئی سامان نہیں تھا۔

''میں تو سمجھی تھی، یہاں اچھا خاصا اہتمام ہوگا۔ لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے تم نے کسی اور کو نہیں بلایا۔'' وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''نہیں۔'' وہ گہری سانس لے کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''اس وقت ہم کہیں باہر چلیں گے۔''

''باہر۔'' اس کے پرسوچ انداز پر چونک کر دیکھنے لگا۔

''تمہیں اعتراض ہے؟''

''نہیں۔''

''چلیں پھر۔'' وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔

''ایک منٹ رکو پہلے میں تمہارا گفٹ لے آؤں۔''

''نومیہ۔'' وہ شاید روکنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ عجلت میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو وہ اس کے خالی ہاتھوں کو قدرے تعجب سے دیکھنے لگا۔ تب وہ ہنس کر بولی۔

''اصل میں'' میں تمہارے لیے ایک جیتا جاگتا تحفہ لائی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ دیکھو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے پورا دروازہ کھول دیا۔ اور سامنے اپنی امی کو دیکھ کر لمحہ بھر کو تو وہ ساکن ہو گیا۔

''رابی! کیسے ہو تم!'' آنٹی خود ہی آگے بڑھ آئیں۔

اور اُس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامنا چاہتی تھیں کہ اس نے انہیں اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اور ان کے کندھے پر پیشانی ٹکا کر بولا۔

''میں نے آپ کو بہت مس کیا تھا ممی!''

''میں بھی تمہیں مس کرتی ہوں۔''

''پھر یہاں آنے کے بعد سے آپ نے مجھ سے کوئی رابطہ کیوں نہیں رکھا۔'' وہ پہلی بار اس کے منہ سے شکوہ سن رہی تھی۔ اور جواب میں آنٹی نے بات ہی بدل دی۔

''تمہاری برتھ ڈے ہے اور تم نے کوئی اہتمام ہی نہیں کیا۔''

''اگر مجھے آپ کی آمد کا علم ہوتا تو میں ضرور اہتمام کرتا۔''

''اور نومیہ، کیا نومیہ کے لیے۔'' آنٹی نے ایک نظر اس پر ڈالی، پھر اس سے پوچھا تو وہ صاف گوئی سے بولا۔

''نومیہ کو میں باہر لے جانا چاہتا تھا۔''

''ضرور لے جاؤ۔'' آنٹی مسکرائیں۔

''اب آپ بھی چلیں گی۔ ہم تینوں۔''

''نہیں بیٹا!'' وہ جلدی سے بولیں۔'' میں پھر کسی وقت تم سے ملنے آؤں گی۔''

''پھر تو آئیں گی، اس وقت بھی چلیں، یا پھر بیٹھیں، میں یہیں انتظام کر لیتا ہوں۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' وہ اس کی آخری بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولیں لیکن آنٹی کو پتا نہیں سچ مچ کوئی کام یاد آ گیا تھا یا اُس کا پروگرام خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ معذرت کرتے ہوئے بولیں۔

''میں اس وقت تم دونوں کا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔ آئندہ انشاء اللہ کسی موقع پر ہم مل کر کوئی پروگرام بنا لیں گے۔ اور اب تم دونوں یہیں کھڑے کھڑے وقت برباد مت کرو چلو۔'' آخر میں اُنہوں نے پیار سے ڈانٹا تو دونوں ان کے پیچھے چل پڑے۔ پھر آنٹی دوبارہ آنے کا کہہ کر چلی گئیں اور وہ اسے جھیل پر لے آیا۔

جاتی گرمیوں کی شام تھی۔ طویل گرم موسم کے بعد یہ ہلکی پھلکی شام اچھی لگ رہی تھیں۔ فضا میں ایک سرور سا تھا۔ لوگوں کے ہجوم سے پرے وہ نسبتاً تنہا گوشے میں آ بیٹھے تو وہ کہنے لگا۔

''نومیہ! میں اس وقت بہت خوش ہوں، بہت زیادہ۔'' وہ سر اونچا کیے آسمان پر دور تک نظریں دوڑا رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی نیلگوں آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اندرونی خوشی کا عکس واضح طور پر اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔ اپنی ممی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اچانک اس سے کہنے لگا۔

''تم نے مجھے اتنا خوبصورت گفٹ دیا ہے اور ایسے وقت میں جب میں شدت

سے تمنا کر رہا تھا کہ کہیں سے ممی آجائیں، میری سمجھ میں نہیں آرہا، میں کس طرح تمہارا شک ادا کروں۔"

"شکریہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہاں تمہارا ایک اور گفٹ میں وہیں چھوڑ ہوں۔ واپسی میں دوں گی۔"

"اَب کسی اور گفٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" پھر اٹھتا ہوا بولا۔ "آؤ وہاں کیس میں چلیں۔ میں نے کل وہاں ٹیبل ریزرو کروالی تھی۔"

"زیادہ تکلف تو نہیں کیا ناں!۔"

"تم آؤ تو۔" وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

کیسینو ذرا اونچائی پر واقع تھا۔ اور سیڑھیوں کے بجائے چکر کھاتی ہوئی بجری روش تھیں، جس پر اترنا آسان اور چڑھنا قدرے مشکل تھا۔ چند قدم کے بعد ہی اسے احسا ہوا تو اس کا ہاتھ تھام کر چلنے لگا۔ اور جس طرح اس نے بہت عام سے انداز میں ہاتھ تھ تھا۔ اسی طرح وہ بھی انجان بن گئی۔ ہال میں داخل ہونے تک اُس کی سانس پھول چکی تھی گلاس وال کے قریب رکھی ٹیبل پر اس کے سامنے بیٹھی ہی تھی کہ اس نے سرخ گلاب کا بڑا پھول اس کی طرف بڑھا دیا۔ غالباً ابھی آتے ہوئے اُس نے باغ میں سے حاصل کیا تھا۔

"تھینک یو۔" اس کے ہاتھ سے پھول لے کر وہ ایک سرشاری کے عالم میں ا دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے چھو کر دیکھنے لگی۔ اور اسی وقت اس سے غیر شعوری کوشش سرز ہوئی۔ کچھ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

"اس کا سارا حسن اسی ذات کا مرہون منت ہے کہ اس نے اسے رنگ نرمی او خوشبو بخشی۔"

"کون؟" وہ چونک کر دیکھنے لگا۔

"میں اس کی بات کر رہی ہوں، جس نے مجھے اس پھول کی تمام جزئیات کو سمجھ اور محسوس کرنے کی تمام حسیات بخشی ہیں۔ وہ ہے میرا خدا۔"

"خدا۔" اس نے پہلے دہرایا پھر بند ہونٹوں کے اندر ہلکی سی ہنسی ابھری، اس کے بعد کہنے لگا۔ "اس پھول سے تمہارے خدا کا کیا تعلق۔"

"صرف اس پھول سے نہیں بلکہ کائنات کے ذرے ذرے سے اس کا تعلق ہے۔

ہر شے کو پیدا کرنے والا اور پھر اسے فنا کرنے والا وہی ہے۔"

"کم آن نومیہ!" وہ شاید موضوع بدلنا چاہتا تھا کہ وہ میز پر کہنی ٹکا کر پھول عین اس کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

"اتنی ترقی کر لی ہے سائنسدانوں نے۔ زمین اور آسمان کے درمیان کیا کچھ نہیں تسخیر کیا۔ لیکن کوئی ہے ایسا جو اس جیسا پھول بنا دے، جس کی نرمی انگلیوں کی پوروں کو گدگدا دیتی ہے، جس کی خوشبو سے حواس معطر اور جسے دیکھتے ہی جہاں آنکھیں چمکتی ہیں، وہاں روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔" اس کے پاس شاید جواب نہیں تھا۔ اٹھ کر چلا گیا۔

"ارے!" وہ پہلے حیران ہوئی۔ "میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے، پھر اپنی باتیں سوچنے لگی۔ اسے خوشی ہوئی کہ انجانے میں ایک کوشش کر گئی تھی۔ اور ایسی کوششیں تو وہ بار بار کر سکتی ہے۔ بقول آنٹی ہو سکتا ہے وہ میری بات سمجھ جائے اس نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا وہ اپنی مدد آپ کے تحت ٹرے میں مختلف چیزیں سجا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر سیدھی بیٹھی تو گلاس وال سے پرے آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھنے لگی تھی۔



اس کی پہلی کوشش غیر شعوری تھی۔ لیکن پھر اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسی طرح جب بھی موقع ملے گا۔ اس کے احساسات کو جھنجھوڑے گی، ہو سکتا ہے کبھی وہ خدا کو تسلیم کرے اور اگر نہیں تو میرا کیا جائے گا۔ آخر میں اس نے لاپروائی سے سوچا تھا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اُسے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ رابی کی زندگی کو ایک نیا موڑ دینے کے لیے کتنی سنجیدہ ہو چکی ہے۔ کیونکہ ان دنوں وہ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے سنی ہوئی مذہبی باتیں یا کہیں پڑھے ہوئے اقوال اور ٹی وی پر کسی مذہبی پروگرام میں کسی علامہ کی تقریر جو اس نے سنی ان سب کو وہ سوچ سوچ کر ذہن میں محفوظ کرتی رہتی تھی۔ تاکہ جب بھی موقع ملے، وہ رابی کے سامنے اس انداز سے دہرائے کہ وہ لاجواب ہو جائے، جیسے اس روز ہوا تھا۔ اور اسی طرح لاجواب ہوتے ہوتے ہو سکتا ہے کسی دن وہ قائل ہو جائے۔

"نومیہ سیف الرحمٰن تم جیت گئیں میں ہار گیا، کتنا انوکھا دن ہو گا جب وہ ایسا کوئی اعتراف کرے گا۔ وہ اب اکثر تصور میں اس کا یہ روپ دیکھنے لگی تھی۔

اس کے چوتھے سال تعلیم شروع ہو چکی تھی۔ اس لیے وقتی طور پر وہ سب بھول کر اس میں مصروف ہوگئی۔ ویسے بھی اب زیادہ تر وقت ہاسپٹل میں گزرتا تھا۔ کسی بھی چیپٹر کو پریکٹیکلی سمجھانے کے لیے ڈاکٹر جارج آگے آگے اور وہ تمام اسٹوڈنٹس پیچھے پیچھے بھاگتے تھے۔ کبھی اس وارڈ میں کبھی اس وارڈ میں، کبھی آپریشن تھیٹر اور کبھی ایمرجنسی، ٹانگیں شل ہو جاتی تھیں، کسی کسی وقت اسے ڈیڈی پر بہت غصہ آتا جنہوں نے اس کے لیے اتنی مشکل فیلڈ کا انتخاب کیا تھا۔ اور ایک بار اس نے دادا کو لکھا بھی کہ آپ کے بیٹے نے مجھ سے پتا نہیں کون سے جنم کا بدلہ لیا ہے۔

اس وقت وہ آپریشن تھیٹر میں مسلسل تین گھنٹے کھڑے رہنے کے بعد کامن روم میں آئی تو صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

’’مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ وہ عورت بچ جائے گی۔ اس کا بچہ پیٹ کے اندر مر چکا تھا۔ اور جسم میں زہر پھیلنے لگا تھا۔ لیکن خدا کو اس کی زندگی منظور تھی جو۔‘‘ یونہی اپنی دھن میں بات کرتے ہوئے اس نے صوفے کی بیک سے سر ٹکایا تو سامنے نظر رابی پر پڑی پتا نہیں کیا تھا اس کی نظروں میں کہ وہ بلا ارادہ خاموش ہوگئی۔ اور وہ کہنے لگا۔

’’ڈاکٹرز کی انتھک کوشش سے اس عورت نے نئی زندگی پائی ہے۔‘‘ وہ اس کی بات کا جواب دے سکتی تھی۔ لیکن ایک تو تھکی ہوئی بہت تھی۔ دوسرے یہ جگہ اور ماحول ایسا نہیں تھا کہ وہ اس سے الجھنے بیٹھ جاتی۔ مصلحتاً خاموشی اختیار کرگئی۔ لیکن اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ رابی نے اس کی اس روز والی بات کو آج جھٹلانے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر وہ خاموش رہی تو اس کی طرح وہ بھی یہی سمجھے گا کہ میں لاجواب ہوگئی ہوں اور پھر اس کی بات کا جواب دینے کی خاطر اس شام وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے سیدھی اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی پہلے یوں ظاہر کیا جیسے بے خیالی میں آگئی ہو اور پھر یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ فوراً واپس پلٹنے دیتا۔ اسے اصرار سے بیٹھایا اور خود چائے بنانے چلا گیا۔

’’تم نے ناحق تکلیف کی۔‘‘ وہ چائے لے کر آیا تو کہنے لگی۔

’’بالکل نہیں، یہ تو میرا روز کا معمول ہے، آتے ہی سب سے پہلے چائے بناتا ہوں۔ تم اگر کچھ کھانا پسند کرو تو۔‘‘

’’نہیں بس چائے ٹھیک ہے۔‘‘ وہ اس کے ہاتھ سے مگ لے کر کہنے لگی، ویسے

بھی اب کل تک میں کچھ نہیں کھا سکوں گی۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’جس دن آپریشن تھیٹر چلی جاؤں پھر مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ عجیب طرح سے دل متلایا متلایا سا رہتا ہے۔ اور آج تو وہ عورت۔‘‘ وہ قصداً خاموش ہوگئی، پھر کچھ دیر بعد سرسری انداز میں بولی۔ ’’جسے بقول تمہارے ڈاکٹرز کی انتھک کوشش سے نئی زندگی ملی ہے۔‘‘

’’کیا تمہیں اس بات سے انکار ہے؟‘‘

’’نہیں بلکہ شکوہ ہے۔‘‘

’’کیسا شکوہ؟‘‘ وہ بالکل نہیں سمجھا۔

’’کہ ڈاکٹرز نے اس عورت کو تو نئی زندگی دے دی، لیکن اس کے بچے کو نہیں بچایا۔ کیا قصور تھا اس بیچارے بچے کا، اور کیا بگڑ جاتا ڈاکٹرز کا جو اس بچے کو۔‘‘

’’نومیہ پلیز۔‘‘ وہ ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک گیا تو وہ ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی، وہ کچھ اضطراری کیفیت میں اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ کتنی دیر ہوگئی۔ وہ پتا نہیں کیا کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہا جھانک کر دیکھے اور اپنی جگہ سے کھڑی بھی ہوئی لیکن اسی وقت وہ آ گیا۔ غالباً اتنی دیر اسے اپنے آپ پر قابو پانے میں لگی تھی کہ اب اسے کھڑے دیکھ کر مخصوص دلنشیں مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

’’ارے تم کھڑی کیوں ہوگئیں بیٹھو ناں۔‘‘

’’بس اب میں چلوں گی۔‘‘

’’بیٹھ جاؤ۔‘‘ نہ تو حکم نہ اصرار، جانے کیا تھا کہ وہ چاپ بیٹھ گئی۔ تب وہ کچھ خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

’’شاید تمہیں یاد ہو، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ کوئی ایسی بات نہیں کروں گا۔ جو تمہارے لیے باعث دکھ، ندامت یا خود اپنے آپ کے لیے باعث ملامت ہو، اَب تم بتاؤ اس تمام عرصے میں کیا مجھ سے کبھی نادانستگی میں بھی ایسی کوئی حرکت سرزد ہوئی جس سے تمہیں دکھ ہوا ہو۔‘‘ وہ جواب دینے کے بجائے بغور اسے دیکھ کر یہ جاننے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اور اس کی طرف سے جواب نہ پا کر وہ کہنے لگا۔

’’اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے درمیان جو خلیج حائل ہے اسے نہ تم عبور کر

سکتی ہو اور نہ میں، پھر تم ایسی کوشش کیوں کر رہی ہو کہ میں اپنا کنارا چھوڑ کر تمہاری طرف آ جاؤں۔''

''میرے خدا'' اس کی آخری بات پر وہ اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کرتی ہوئی سر جھکا گئی اور وہ اپنی بات جاری رکھتا ہوا کہنے لگا۔

''نہیں نومیہ! میں جہاں کھڑا ہوں، مجھے وہیں کھڑا رہنے دو، ہاں اگر تم درمیانی خلیج کو پانے کی خواہش رکھتی ہو تو خود چل کر میرے پاس آ جاؤ۔ جبکہ اپنے بارے میں، میں یہی کہوں گا کہ میری زندگی کی سب سے بڑی اور خوشگوار حقیقت یہ ہے کہ میں تمہیں ٹوٹ کر چاہتا ہوں، میری چاہت میں کسی قسم کی کوئی غرض شامل نہیں تمہارے حصول کی بھی نہیں۔ اور میں نے تو کبھی یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی نومیہ کہ بدلے میں تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔ وہ اتنی کمزور تو نہیں تھی، پھر بھی پتا نہیں کیسے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی، جسے پلکیں جھپک جھپک کر وہ اپنے اندر اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ اور گو کہ اس کا سر جھکا ہوا تھا پھر بھی وہ جان گیا۔

''آئی ایم سوری، میرا مقصد تمہیں دکھ دینا یا رلانا ہرگز نہیں تھا۔ پلیز رونا مت ورنہ میں بہت ندامت محسوس کروں گا۔'' اس نے سوچا وہ اس طرح چپ چاپ اٹھ کر چلی جائے۔ لیکن پھر فوراً اپنی سوچ کی نفی کر دی، پتا نہیں وہ کیا سمجھے۔ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر بولی۔

''تم غلط سمجھے ہو رابی! میں نہ تو درمیانی خلیج پانے کی خواہش رکھتی ہوں اور نہ ہی میں نے تمہیں اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے صرف آنٹی کے کہنے پر تمہیں احساس دلانا چاہا تھا کہ تم غلط راستے پر کھڑے ہو ورنہ اس میں میری اپنی کوئی غرض شامل نہیں ہے۔''

وہ اپنی صفائی میں اسی قدر کہہ سکی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولی۔

''اور رہی محبت کی بات، تو میرے دل میں تمہاری محبت نہیں کسک ہے جو ہمیشہ رہے گی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اس کے کمرے سے نکل آئی۔

اس رات وہ ایک پل کے لیے نہیں سو سکی۔ اس کا سارا جوش ہوا ہو گیا تھا۔ مسلسل

اپنے آپ کو کوستی رہی کہ وہ کیوں اس حد تک بڑھی تھی۔ پھر اس نے اپنا محاسبہ بھی کیا کہ اس نے محض آنٹی کے کہنے میں آ کر اسے راہ دکھانے کی کوشش کی یا وہ خود بھی ایسی خواہش رکھتی تھی۔ تب اس نے پوری ایمانداری سے اپنے آپ سے اعتراف کیا کہ وہ ایسی خواہش رکھتی ضرور تھی لیکن اپنے لیے نہیں۔ خود اس کے لیے تا کہ وہ بھٹکا ہوا مسافر ہے، اسے کم از کم ماں کی آغوش تو میسر آ جائے۔ اور وہ گھر جہاں اس کا داخلہ اس لیے بند ہے کہ وہ غیر مسلم ہے۔

وہ سوئی ہی نہیں تھی، اس لیے اٹھنے میں دیر سویر کا سوال ہی نہیں تھا۔ معمول کے مطابق بستر چھوڑا پھر حسب معمول پہلے نماز پڑھی۔ اس کے بعد دوسری ضروریات سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے لیے ناشتا بنا رہی تھی، تب اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا کہ وہ آئندہ اس کی ذاتیات میں ہرگز دخل نہیں دے گی، ویسے بھی اب یہ آخری سال جا رہا ہے۔ کیا ضرورت ہے رنجش پیدا کرنے کی۔ بہتر ہے اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے رخصت ہوں۔

جس وقت وہ اپنے کمرے سے نکلی، وہ اس سے چند قدم آگے لفٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اور وہ محض اس خیال سے کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ رات وہ اس سے خفا ہو کر گئی ہے۔ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے ساتھ جا ملی۔

''ہیلو!'' وہ اچانک اسے اپنے برابر دیکھ کر چونکا۔

''ہیلو!'' جواباً وہ کھل کر مسکرائی۔

''میرا خیال تھا تم خفا ہو گی۔''

''کیوں۔؟'' وہ انجان بن گئی۔

''کل میں نے تمہیں شاید ہرٹ کیا تھا۔''

''نہیں، بلکہ مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے جو سمجھا، سوچا اسے فوراً کہہ بھی دیا۔ اس کے برعکس اگر تم ایک طویل عرصہ تک میری باتیں جبراً برداشت کرنے کے بعد آخر میں یہ ساری باتیں کہتے تو میں ضرور ہرٹ ہوتی بلکہ مجھے لگتا جیسے اس تمام عرصے میں تم اندر ہی اندر محظوظ ہوتے رہے ہو۔ اور آخر میں ہری جھنڈی دکھا کر میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ بہرحال رابنسن مارک ہم اچھے دوست ہیں اور دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے رخصت ہوں گے۔''

وہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا ایک لفظ نہیں کہہ سکا تھا۔

پھر اگلا سارا وقت بے انتہا مصروفیت میں گزرا وہ خود کہتی تھی کہ اگر کبھی اس نے اپنی سوانح عمری لکھی تو اس میں یہ ضرور لکھے گی کہ ایک سال تک اس نے سورج طلوع ہوتے اور غروب ہوتے نہیں دیکھا۔ بہر حال اس تھکا دینے والے دور کا اختتام بھی ہو ہی گیا۔ یونیورسٹی میں آخری دن قدرے خوشگوار گزرا اور اس شام ڈاکٹر جارج نے اپنے اسٹوڈنٹس کو چائے پر بلایا۔ یونیورسٹی سے نکل کر ان کی شخصیت بالکل مختلف تھی۔ کہ وہ بار بار حیران ہو کر انہیں دیکھتی رہی۔ اور ان چار سالوں کے دوران اس نے جتنے ریمارکس اور جتنے نام انہیں دیے تھے واپسی میں بڑی فراخ دلی سے واپس لیتی آئی۔

''تمہارا فوراً واپسی کا ارادہ ہے یا کچھ عرصہ یہاں ہو گی؟'' واپس میں رابی نے اس سے پوچھا تو وہ بے اختیار کہہ گئی۔

''نہیں بھئی، اب یہاں رہنے کا کیا سوال، فوراً واپس جاؤں گی۔''

پھر اچانک اس پر نظر پڑی جس کی نیلگوں آنکھوں میں اداسیاں سمٹ آئی تھیں بات سنبھالتی ہوئی بولی۔

''میرا خیال ہے۔ اب تو مزید ہاسٹل میں رہنے کی اجازت بھی نہیں ملے گی۔ اس سے پہلے کہ کوئی نکل جانے کا کہے ہمیں خود ہی نکل جانا چاہیے۔'' پھر اس سے پوچھنے لگی۔

''تم امریکہ واپس جاؤ گے یا......؟''

''میں نے اس سلسلے میں ابھی کچھ نہیں سوچا بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ اس تمام عرصے میں، میں نے تم سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں سوچا۔'' اس کا دل عجیب انداز سے دھڑکا۔ اور بالکل غیر محسوس طریقے سے اس کی طرح سے رخ موڑ گئی۔

اس رات وہ دیر تک بسنتی سے گپ شپ کرتی رہی ایڈریس کا تبادلہ بھی ہوا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ کبھی بھی اسے خط نہیں لکھ سکے گی۔ اگلا دن وہ رابنسن کے ساتھ رہی اور اس سے اگلے دن وہ اس سے کہنے لگی۔

''میں آج انکل لغاری کے گھر جا رہی ہوں تم میرے ساتھ چلو۔''

''نہیں۔'' وہ سختی سے ہونٹ بھینچ کر بولا اس کے باوجود اپنے آپ کو ''کیوں'' کہنے سے باز نہیں رکھ سکی۔

''ممی نے مجھے اپنے گھر آنے سے منع کیا ہے۔'' وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ الفاظ اس

نے ہونٹوں سے کیسے ادا ہوئے کیونکہ وہ دیکھ رہی تھی، وہ ساری توانائیاں اپنے آپ پر ضبط کرنے میں صرف کر رہا ہے، تب وہ بہت خاموشی سے اس کے پاس سے ہٹ گئی۔

پھر وہ دن انکل لغاری کے گھر رہنے کے بعد ان سب سے رخصت ہو کر جب واپس آئی تو وہ موجود نہیں تھا۔ پہلے وہ یہی سمجھی کہ یونہی کسی کام سے نکلا ہوگا۔ لیکن تین دن اس کا دروازہ لاک رہا۔ وہ صبح شام جا کر دیکھتی رہی۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔

اگلے دن اس کی واپسی تھی اور اس سے وقت وہ کوریڈور میں ریلنگ پر جھکی یہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اب بھی نہ آیا تو وہ اس سے ملے بغیر چلی جائے گی جس کا ملال اسے ہمیشہ رہے گا۔ اس وقت اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو فوراً گردن موڑ کر دیکھنے لگی اور اسے دیکھ کر بے اختیار پوچھ گئی۔

''کہاں چلے گئے تھے تم؟'' اس کے لہجے میں بے اختیاری کے ساتھ بے قراری بھی تھی جسے محسوس کر کے ہی اس نے گہری سانس لی اور دھیرے سے مسکرایا۔

''پتا ہے۔ میں کل جا رہی ہوں۔'' اپنی طرف سے اس نے احساس دلایا اور وہ اطمینان سے بولا۔

''جانتا ہوں۔''

''جانتے ہو، پھر بھی غائب رہے۔ اگر اب بھی نہ آتے تو میں تم سے ملے بغیر چلی جاتی۔''

''اس وقت تو مجھے آنا ہی تھا۔'' وہ پتا نہیں کیوں اتنا مطمئن تھا کہ وہ الجھ گئی اسے وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں جانے لگی تو وہ سامنے آ گیا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' وہی بے بس کر دینے والا انداز کہ وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ غالباً ابھی سیدھا اس کے پاس آیا تھا جبھی اس کے کمرے کا دروازہ لاک تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر لاک کھولا۔ پھر دروازہ کھول کر پہلے اسے اندر جانے کا اشارا کیا پھر اس کے بعد داخل ہوا تو کہنے لگا۔

''تم بیٹھو۔ میں پہلے چائے بنا آؤں۔''

''چائے میں بنا دیتی ہوں۔ تم جب تک منہ ہاتھ دھو لو۔''

وہ اس کے منع کرنے کے باوجود کچن میں چلی گئی۔ چائے لے کر آئی تو وہ اس جگہ

بیٹھا تھا جہاں ہمیشہ وہ بیٹھتی تھی۔ اس بات کو اس نے محسوس کیا لیکن ٹوکا نہیں۔ خاموشی سے ایک مگ اسے تھما کر خود اس کی جگہ پر جا بیٹھی۔

"تو کل تم جا رہی ہو؟" اس نے غالباً اپنے آپ سے کہا تھا اس لیے وہ کچھ نہیں بولی۔ تب وہ اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

"پوچھو گی نہیں میں تین دن کہاں رہا؟"

"میرا خیال ہے تمہیں دیکھتے ہی میں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔"

"ہاں!" اس کا انداز پتا نہیں تھکا ہوا تھا یا ہارا ہوا، وہ سمجھ نہیں سکی۔ ہاں کہہ کر وہ خاموش ہو گیا تھا یا شاید کچھ سوچ رہا تھا۔ کافی دیر بعد بولا۔

"جب تم انکل لغاری کے گھر جا رہی تھیں، اس وقت اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں تمہیں پھر کبھی نہیں دیکھ سکوں گا اور تمہارے جانے کے بعد میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا کہ زندگی میں یہ موڑ تو آنا ہی تھا لیکن مجھ پر عجیب بے بسی اور بے چارگی سوار ہو گئی۔ اور پھر میں خود کو آزمانے کی خاطر یہاں سے چلا گیا کہ شاید اس ماحول سے نکل کر میں اپنے آپ کو بہلا سکوں لیکن کہیں کسی مقام پر بھی میں خود کو نہیں بہلا سکا، ہر پل یوں لگتا رہا جیسے دھیرے دھیرے میری روح انتہائی اذیت کے ساتھ میرے جسم کا ساتھ چھوڑ رہی ہو۔"

وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا، پھر اس کی بے حد خاموش آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"پہلے میں نے تم سے صرف اپنی شدید محبت کا اعتراف کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ میری چاہت میں کسی قسم کی کوئی غرض شامل نہیں۔ اس وقت میں نے تم سے بچھڑنے کا سوچا تو تھا لیکن شاید مجھے یقین نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی یہ لمحہ آئے گا بھی۔ اور اب ایسا ہے نومیہ سیف الرحمٰن ان تین دنوں میں مجھ پر یہ ادراک ہوا کہ میں محبت کے ساتھ تمہارے حصول کی خواہش بھی رکھتا ہے لیکن مسئلہ وہی درمیانی خلیج کا ہے تمہارے پاس اس کا اور کوئی حل نہیں ہے۔؟"

"کیا مطلب۔؟" وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

"میرا مطلب ہے۔ کیا ہم اپنے اپنے راستوں پر چلتے ہوئے ایک نہیں ہو سکتے؟ وہ بڑی آس سے دیکھنے لگا۔

"نہیں، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے پر جبر اور تنقید کیے بغیر خوشگوار زندگی

گزار سکتے ہیں۔"

"پلیز رابی! تم جانتے ہو، مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی۔" اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر جانے لگی تو اس نے روک دیا۔

"اس طرح مت جاؤ پلیز، کوئی اور راستہ سوچو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" ں کے لہجے میں عاجزی تھی۔ پھر سوچ کر بولا۔ "اگر ایک ہونے کے لیے ایک ہی راستے پر ہلنا ضروری ہے تو ہم ٹاس کر لیتے ہیں۔"

"کیا۔؟" وہ تقریباً چیخ پڑی۔ "مجھے کہنے دو رابنسن مارک کہ جب تک تمہاری بت میں کوئی غرض شامل نہیں تھی۔ تم اچھے انسان تھے اور اب غرض نے تمہیں اندھا کر دیا ہے کہ زندگی تو زندگی مذہب کو بھی جوئے کی طرز پر کھیلنا چاہتے ہو۔ ہوسکتا ہے تمہارے لیے یہ کوئی بات نہ ہو لیکن۔"

"پلیز نومیہ!" وہ اپنی بات پر نادم ہو کر بولا۔ پھر اٹھ کر باہر چلا گیا، لیکن چند منٹ بعد ہی واپس آ گیا اور دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"ایک اور طریقہ ہے۔"

"بس رہنے دو۔" وہ کچھ روٹھی ہوئی بے زاری سے بولی۔

"نہیں سن لو۔" پھر وہی انداز کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے مذہب کے بارے میں قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو بھی۔"

"نہیں۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ "تم ایسی کوئی کوشش ت کرو۔ کیونکہ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم کس راستے پر چل رہے ہو اور نہ ہی میں نہارے حصول کی خواہش رکھتی ہوں، اس لیے تمہاری کوئی بات مجھ پر اثر نہیں کرے گی۔"

"یہ تو ہے۔" وہ ہار مان کر بولا۔ "لیکن تم ایک کوشش ضرور کرو، ہوسکتا ہے تمہاری کوئی بات مجھے سوچنے پر مجبور کر دے۔"

فوری طور پر وہ اپنے آپ کو بہت مشکل میں محسوس کرنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ ایک شخص جو سرے سے خدا کو تسلیم ہی کرتا اسے کیسے اس کا یقین دلائے پہلے خیال یا چپ چاپ یہاں سے اٹھ کر چلی جائے لیکن اس طرح تو خود اس کا ایمان متشبہ ٹھہرتا۔

"چائے پیو گی؟" وہ اسے خاموش دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"ہاں!" اس نے فوراً ہامی بھری اور جب وہ اٹھ کر کچن میں چلا گیا تب اسے وقت مل گیا۔ وہ جلدی جلدی اپنے ذہن میں مختلف باتیں ترتیب دینے لگی۔ کبھی م مودودی کی کتاب اس کی نظر سے گزری تھی کبھی اس نے علامہ عابدی کی تقریر سنی تھی اور کسی پرچے میں کوئی ایسا واقعہ جو بہت دن تک اسے یاد رہا ہو۔ وہ سب کو سوچنے کے س دل ہی دل میں دعا کرتی رہی

"اللہ میری مدد کرنا۔ ایسا نہ ہو وہ بجائے قائل ہونے کے میرا مذاق اڑانے جائے کہ میں تو خود ہی نابلد ہوں اسے کیا سمجھاؤں گی۔"

"چائے!" وہ اپنی سوچوں میں اتنی محو تھی کہ اُس کے آنے کا پتا نہیں چلا۔ اس آواز پر بری طرح چونکی پھر کچھ خجل سی ہو کر اس کے ہاتھ سے مگ لیتے ہی ہونٹوں سے لگا

"کیا میں نے تمہیں مشکل میں ڈال دیا ہے؟" وہ اپنی جگہ پر بیٹھتا ہوا پوچھنے لگا

"نہیں۔" وہ کافی حد تک سنبھل کر مسکرائی۔

"چلو تو پھر شروع ہو جاؤ۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کون سی ہستی ہے جسے تم نے دیکھا نہیں جانا نہیں پھر بھی اسے یقین سے اُس کے ہونے کا دعوا کرتے ہو، یہاں تک کہ ہر بات ہونے اور نہ ہونے کا تعلق اس سے جوڑتے ہو کہ اسے منظور تھا یا منظور نہیں تھا؟" شاید یہ کا پہلا سوال تھا۔ اور اسے محسوس ہوا جیسے اچانک اس کا دھڑکتا دل ٹھہر گیا ہو۔ اپنے معمو کے مطابق پرسکون اور پھر وہ اسی سکون سے بولی۔ "سب سے پہلے تو میں اس دنیا کی با کروں گی جسے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، یہاں موجود ہر چیز کی ضد قائم ہے یعنی متض جیسے صبح، شام، دن، رات خوشی ہے تو غم بھی ہے تم سوتے ہو تو جاگتے بھی ہو، یعنی کوئی بھی ایک مقررہ وقت سے زیادہ نہیں ہے۔ اپنے آپ کو دیکھو، مجھے دیکھو، ہم آج ہیں کل نہیں ہو گے ہر چیز فانی ہے اور جب فانی ہے تو کوئی لافانی بھی ہوگا اور وہ لافانی ذات ہے خدا کی جس کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔" وہ اپنی پہلی مثا کا ردعمل دیکھنے کے لیے رکی نہیں بولتی چلی گئی۔

"یہ ساری کائنات جس کے بارے میں غالباً تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ یا تو خود وجود میں آئی ہے یا کسی انسان کی تخلیق۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا نظام اتنا مستحکم نہیں ہو سکتا تھا۔

غور کرو تو اس کائنات کا سارا نظام ایک قاعدے، ضابطے اور قانون کے تحت کام کر رہا ہے۔ اور یہ قانون ایسا مستحکم ہے کہ یہاں موجود کوئی بھی شے اپنے ضابطہ اور قاعدہ سے ایک انچ کے ہزارویں حصہ میں بھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کر سکتی۔ اس زمین کو دیکھو، اپنی مخصوص رفتار سے محوری اور طولانی گردش کر رہی ہے۔ اس کو اپنے مدار پر حرکت کرنے کے لیے بھی ایک مخصوص رفتار سے گردش کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا کیا تم تمہارے سائنسدان اس کی رفتار میں کمی بیشی کر سکتے ہیں؟" اس نے لحظہ بھر کو اس کو طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر کہنے لگی۔

پھر جس طرح حیوانات، نباتات کی پیدائش اور افزائش ایک لگے بندھے قانون کی پیروی کر رہی ہے، اس طرح انسانی دنیا میں بھی پیدائش اور نشوونما کا نظام ایک ہی چلا آ رہا ہے۔ انسان پیدا ہو کر بڑھتا ہے پھر لڑکپن اور جوانی کے دور سے گزر کر بڑھاپے میں داخل ہو جاتا ہے، اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ہم لاکھ اپنی من پسند زندگی گزار لیں لیکن زندگی کے ادوار پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ ہم چاہیں بھی تو جوانی کو ہمیشہ برقرار نہیں رکھ سکتے اور ہزار جتنے اور کوشش کے باوجود بڑھاپے کو آنے سے نہیں روک سکتے، اسی طرح ہم موت کو نہیں روک سکتے۔ کون ایسا شخص ہے یہاں جو مرنا چاہتا ہے، اس کے باوجود مر جاتا ہے۔ زندگی کی یہ حقیقتیں جن پر ہمیں کوئی اختیار نہیں ان پر اسے اختیار ہے جسے کوئی بھگوان کہتا ہے کوئی گاڈ کوئی یزداں اور نام کچھ بھی ہو، وہی ایک خدا ہے، ایک طاقتور اور لامتناہی ہستی جو ہمیں پالے ہوئی ہے اور ساری کائنات پر اسی کی حکمرانی ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جو ایک بار اسے مان لیتا ہے، وہ پھر کبھی اسے جھٹلا نہیں اس کی محبت میں ایک نشہ ہے، سرور ہے اور غرور بھی تم کہتے ہو، اسے دیکھا نہیں اگر محسوس کرو تو اس کا جلوہ ہر شے میں ہے۔ وہ اگر ہمارے دل میں اپنی محبت ڈالتا ہے تو ہم سے محبت بھی ہے اس کی محبت بڑی زورآور ہے رابی! جس کے سامنے باقی سارے جذبے اپنی آپ مرجاتے ہیں۔ تمہارے سامنے زندہ مثال تمہاری ماں کی ہے۔ آصف اور عالیہ کی طرح تم بھی اس کی اولاد ہو، پھر یہ تفریق کیوں۔ یہ تو نہیں ہے کہ اس نے ان دونوں کے لیے زیادہ تکلیفیں اٹھائی ہیں اور تمہارے لیے کم بلکہ تمہارے لیے تو اس کا دل زیادہ گداز ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ تم باپ کے سائے سے بھی محروم تھے لیکن ایسا نہیں ہے اس لیے کہ اس کا دل

خدا کی محبت سے منور ہو چکا ہے اور وہ اپنے دل میں اب صرف اسی کو بسائے گی جو اس
خدا سے محبت رکھے گا، اور جو اس کے خدا پر یقین نہیں رکھتا، خواہ اس کے پیٹ کی اولاد
کیوں نہ ہو، اس کے لیے اس نے دل تو کیا گھر کے دروازے بھی بند کر دیئے ہیں۔"

وہ اس کے چہرے پر تاریک سائے لہراتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

"بس۔" اس نے یوں کہا جیسے پوچھ رہا ہو، تمہاری بات ختم ہو گئی۔

"کیا بس۔ مزید سننا چاہتے ہو تو آؤ اپنے آج پر بات کریں۔" وہ اب چیلنج قبو
کر رہی تھی۔

"ابھی ابھی تم اور میں جو تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوئے ہیں، اس نے ہمیں
سکھایا ہے۔ یہی ناں کہ لوگوں کی زندگیاں بچانے کے لیے ہم اپنی اہمیت کے زور پر سار
توانائیاں صرف کر دیتے ہیں لیکن سب تو نہیں بچ جاتے کوئی مر بھی جاتا ہے۔ اس مر
والے سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہوتی اور نہ ہی ہم نے کہیں کوتاہی کی ہوتی ہے پھر وہ کیو
مرتا ہے۔ جب کہ اسے ساری طبی امداد بروقت ملی ہوتی ہے پھر بھی ایک اسٹیج ایسا کیوں آجا
ہے جب ہم ڈاکٹرز اپنے آپ کو انتہائی بے بس اور بے اختیار محسوس کرنے لگتے ہیں، ا
لیے کہ اوپر وہ با اختیار ہستی ہے۔ اور ایسے ہی وقت میں وہ احساس دلاتا ہے کہ مان لو میں
ہوں پھر بھی کوئی نہ مانے تو یہ۔"

وہ قصداً خاموش ہو گئی کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا لیکن وہ سر جھکائے پتا نہیں
کیا سوچ رہا تھا۔ تب وہ کہنے لگی۔

"میں نہیں جانتی۔ تم میری کسی بات سے قائل ہوئے یا نہیں لیکن ضرور جانتی ہو
کہ میری ساری باتیں تمہیں سوچنے پر مجبور ضرور کریں گی اور جب کسی نتیجے پر پہنچو تو مجھے مط
ضرور کرنا۔"

وہ گہری سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی دروازے
پاس جا کر رکی پھر پلٹ کر اسے دیکھا، وہ اسی خاموشی سے سر اونچا کر کے اسے دیکھ رہا تھا۔
بات سے قطع نظر وہ اچھا دوست بھی تو تھا، اپنے قول کا پکا کہ اس تمام عرصے میں اس نے ا
کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اسے دکھ ہوتا یا جو اس کے لیے باعث ندامت یا خود کے ل
ملامت ہوتی وہ سرخرو ہو کر جا رہی تھی تو اس میں اس کا بھی اتنا ہی حصہ تھا جتنا خود اس کا۔ ا

کی نیلگوں آنکھوں میں اس وقت بھی وہی جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا جو پہلی ملاقات میں اس نے
دیکھا تھا، پھر جیسے اداسیوں کے سارے موسم اس کا تعاقب کرتے چلے آئے تھے اور اب بھی
وہ انہی موسموں کے حصار میں تھا۔ لمحہ بھر کو وہ ڈگمگائی پھر فوراً سنبھل کر بولی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے دل میں تمہارے لیے محبت نہیں کسک ہے اور
میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہاں اگر تم کسی نتیجے پر پہنچ کر مجھے نئے موسموں کی نوید دو گے تو میں
کسک کو محبت میں بدلنے میں دیر نہیں کروں گی، دوسری صورت میں، میں بغیر کسی ملال کے کہہ
رہی ہوں، تمہارے لیے تمہاری راہ، میرے لیے میری راہ۔"

اس کے ساتھ ہی...... وہ باہر نکل آئی۔



ایئر پورٹ پر ممی، ڈیڈی، تایا ابو، تائی امی کے ساتھ دادا بھی موجود تھے۔ اسے بے
حد خوشی ہوئی اور وہ سب سے پہلے ان ہی کے سینے سے لگی۔ پھر سب سے مل کر عطا کے
بارے میں پوچھنے لگی۔ غالباً اسے خیال نہیں رہا تھا کہ وہ اسپشلائزیشن کے لیے گیا ہوا ہے
جب ڈیڈی نے بتایا تو کچھ خجل سی ہو کر بولی۔

"ہاں مجھے معلوم تو تھا لیکن اس وقت آپ سب کے درمیان اسے نہ دیکھو کہ
میرے ذہن سے نکل گیا۔ وہ ویسے اس کی واپسی کب ہو گی۔"

"ابھی تو ایک سال ہے۔" تایا ابو نے بتایا تو وہ سوچنے لگی۔ گویا یہاں بھی بور کر
دینے والے دن منتظر تھے۔

پھر کچھ دن تک اس کی وہی روٹین رہی جو یہاں اسکول کالج کے زمانے میں
چھٹیوں کے دوران ہوا کرتی تھی۔ یعنی کھانا اور سونا اس کے علاوہ عطا کے ساتھ کچھ پروگرام بنا
لیتی تھی۔ اب عطا نہیں تھا اور اگر وہ ہوتا تو بھی تو...... اب وہ ٹین ایج لڑکی نہیں تھی جو پہلے کی
طرح اس سے لڑتی جھگڑتی اور زبردستی اپنی بات منواتی، کافی تبدیل ہو گئی تھی وہ اور اسے
بدلنے میں ایک تو وقت کا ہاتھ تھا، دوسرے ندی کے اس طرف کھڑا رابنسن مارک، جس کی
آنکھوں کی نیلاہٹ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی منظر کی طرح ٹھہر گئی تھیں۔ دن میں کئی بار
ایسا ہوتا...... کہ وہ اسے اوّل ملاقات سے سوچنے لگتی۔

"آپ غالباً پاکستان سے آئی ہیں اور پاکستانیوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ

دوسرے کونظر انداز کرنے میں ماسٹر ہوتے ہیں۔'' پھر وہ ہر روز ایک ہی جملہ دہراتا۔

''میں شام میں انتظار کروں گا۔''

اسے وہ دن شدت سے یاد آئے جب وہ اس کے سامنے ہامی بھرنے کے باوجود بھی نہیں جاتی تھی اور پتا نہیں کیوں وہ گزری کل کی بات نہیں دہراتا تھا۔ اس نے کبھی نہیں کہا ...... کہ میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔ ہر روز ایک نئے یقین کے ساتھ اپنی ابات دہراتا۔ اور پھر جب وہ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے ہار گئی تھی تو اس کے سامنے بیٹھ کر کس بری طرح روئی تھی۔

''نومیہ!'' دادا نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر پکارا تو وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔

''آیئے دادا۔!''

''بیٹا! اب مجھے بھی لگتا ہے کہ تمہارے باپ نے تمہیں باہر بھیج کر واقعی کسی جنم کا بدلہ لیا تھا۔'' دادا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتے ہوئے بولے تو وہ اپنی بات یاد کر کے ہنس پڑی۔

''نہیں دادا! وہ تو میں نے بس یونہی کہا تھا۔''

''تم نے یونہی کہا ہوگا لیکن اب میں یقین سے کہہ رہا ہوں۔''

''کیسے۔؟'' وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

''بھئی، پہلے تمہاری گھر میں موجودگی کا پتا چلتا تھا۔ اب محسوس ہی نہیں ہوتا کہ تم گھر میں ہو۔''

''کیا کروں دادا! میں تو خود بور سی ہوگئی ہوں۔ اتنی مصروفیت کے بعد اب ایک دم سے فراغت بالکل اچھی نہیں لگ رہی۔'' اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔ تب دادا اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولے۔

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر تمہارے کوئی دوسرے مشاغل بھی تو نہیں ہیں۔ ایسا کرو جب تک تمہارا کلینک تیار نہیں ہو جاتا تم کوئی ہاسپٹل جوائن کر لو۔''

''میں نے کہا تھا ڈیڈی سے اور وہ کچھ رضا مند بھی ہو گئے تھے لیکن ممی نہیں مانیں۔ ان کا کہنا ہے۔ یہ جو کچھ وقت ہے میں آرام کر لوں اور آرام کرنے کا نتیجہ آپ دیکھ

رہے ہیں، میں کتنی سست ہوگئی ہوں۔''

''میں تمہاری ماں سے بات کروں گا لیکن پہلے کوئی اچھا شعر سناؤ صحیح تلفظ کے ساتھ۔'' دادا سنجیدگی سے بولے اور وہ شریر ہوگئی۔

''عمر دراز والا۔'' اور دادا ہنس پڑے۔

پھر دادا کے کہنے پر ممی کو ماننا پڑا۔ یوں اس نے ایک مقامی ہاسپٹل میں جاب کر لی تو وقت سہولت سے کٹنے لگا۔ نہ زیادہ فراغت ملتی۔ نہ یادیں ستاتیں۔ رفتہ رفتہ وہ اس زندگی میں ایڈجسٹ ہونے لگی تھی۔

اُس روز وہ ممی کے پاس بیٹھی یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ اور باتوں کے دوران جب عطا کا ذکر آیا تو ممی کہنے لگیں۔

''تمہارے دادا کی خواہش ہے کہ عطا کے آتے ہی تم دونوں کی شادی کر دیں۔''

''کیا۔!'' وہ یوں بولی جیسے اس کے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ ''کس کی شادی؟''

''تمہاری اور عطا کی۔''

''نہیں ممی!'' وہ فوراً بول پڑی۔ ''میں اور عطا میرا مطلب ہے۔ ہم دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے شادی نہیں کرنا چاہیں گے۔''

''کیوں؟'' ممی واقعی حیران ہوئیں۔

''اس لیے ہم نے کبھی اس انداز سے نہیں سوچا۔''

''تو اب سوچ لو۔''

''نہیں۔'' پھر مجبوراً اسے بتانا پڑا۔ ''ویسے بھی عطا جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اس کے بارے میں مجھے بتا چکا ہے۔''

''کون ہے؟''

''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ عطا کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔'' ممی خاموش ہو رہیں۔ پھر کچھ دیر بعد کہنے لگیں۔

''اچھا ہوا۔ تم نے مجھے بتا دیا ورنہ میں تو تمہاری طرف سے بالکل بے فکر ہوگئی تھی۔''

''ابھی بھی آپ بے فکر ہی رہیں ممی! کیونکہ فی الحال میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''ایسا مت کہو، شادی کے لیے یہی عمر مناسب ہے۔''

''پھر بھی ممی! پہلے میں اپنا کلینک سیٹ کرلوں اس کے بعد سوچوں گی۔''

اس کے ساتھ ہی وہ ممی کے پاس سے اٹھ آئی۔ اپنی طرف سے وہ فی الحال ٹال آئی تھی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب ممی اطمینان سے نہیں بیٹھی رہیں گی۔ اور اس کا اپنا اطمینان بھی رخصت ہوگیا تھا۔ طبیعت میں عجیب طرح کی بیزاری اور اکتاہٹ آن سمائی تھی۔ گو کہ روز مرہ کے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہی روٹین تھی لیکن ہر کام وہ جیسے مجبوری کے تحت کر رہی تھی۔

ان دنوں ڈیڈی نے اسے کلینک کی چابی دی اور وہ اسے اپنی مرضی سے سیٹ کرنے میں لگی ہوئی تھی کہ عطا آ گیا۔ وہ بغیر اطلاع دیئے آیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کلینک میں جو کمرا اس نے اپنے لیے سیٹ کیا تھا وہیں بڑی سی ٹیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر کچھ تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھی تھی (جب عطا غالباً سب سے ملنے کے بعد اسے فون کرنے کے بجائے خود اس کے پاس آ گیا۔ وہ اسے اچانک سامنے دیکھ کر حیران ہوئی اور خوش بھی لیکن کسی طرح بھی اظہار سابقہ انداز میں نہیں کر سکی۔ غالباً درمیانی ماہ و سال اور پھر دوری نے ایک حد قائم کر دی تھی۔ پھر وہ خاصا میچور بھی لگ رہا تھا) چہرے پر سنجیدگی کی چھاپ اور انداز میں تکلف۔

''تم فون کر دیتے میں خود آ جاتی۔'' وہ اس سے کہنے لگی۔

''پہلے میں ایسا ہی کر رہا تھا۔ پھر سوچا اس بہانے تمہارا کلینک بھی دیکھ لوں گا۔'' وہ کمرے کا جائزہ لیتا ہوا بولا۔

''یہ اچھا کیا تم نے ورنہ پھر آج کل پر ٹالتے رہتے۔ خیر، یہ بتاؤ کیسا گزرا تمہارا وقت۔؟''

''بس ٹھیک ہی گزر گیا۔ تم اپنی سناؤ۔''

''میں اب کیا سناؤں۔ مجھے تو یہاں آئے ہوئے بھی ایک سال سے زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ کافی حد تک یہاں سیٹ ہو چکی ہوں۔ البتہ اس کلینک میں سیٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔'' اس نے گزرے ماہ و سال کے بارے میں پوچھا تھا اور وہ خوبصورتی سے ان دنوں سے نظریں چرا کر اپنے آج اور آنے والے کل کے بارے میں بات کرنے لگی تھی۔

''میں تو یہی کہوں گی عطا کہ تم بھی یہیں آ جاؤ۔ ایک سے دو ہو جائیں گے تو۔''

''ابھی نہیں۔'' وہ فوراً کہہ گیا۔

''کوئی آفر ہے تمہارے پاس؟'' وہ پوچھے بغیر میں نے نہیں سوچا۔''

''گویا کچھ عرصہ ریسٹ کرنا چاہتے ہو۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''نہیں۔''

''پھر۔؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ کچھ رک کر بولا۔

''اصل میں ہمارا ارادہ کسی ایسے دیہی علاقے میں جہاں ہاسپٹل کی سہولت نہیں ہے۔ وہاں چھوٹا موٹا ہاسپٹل بنا کر کام کرنے کا ہے۔''

''ہمارا سے تمہاری مراد۔؟''

''میں اور سونیا۔'' اس نے کہا تو وہ خوشگوار حیرت میں گھر کر بولی۔

''ارے۔ سونیا کے بارے میں تو میں پوچھنا بھول ہی گئی۔ کیسی ہے وہ۔؟''

''ٹھیک ہے تم اس سے مل تو چکی ہو۔''

''اچھا۔ اس نے پل میں سارے اسٹاف کو سوچ ڈالا تو۔ ڈاکٹر سونیا جہانزیب کا سراپا نگاہوں میں آسمایا۔ وہ سرو قد لڑکی، جس کے گھنے سیاہ بالوں کی لمبی سی چوٹی گاؤن سے نیچے تک جھولتی تھی۔ تب وہ دل ہی دل میں عطا کے انتخاب کی داد دیتی ہوئی بولی۔

''ہاں ڈاکٹر سونیا جہانزیب لیکن مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ۔''

''تمہیں خود اپنا خیال نہیں۔''

''ہاں!'' وہ خواہ مخواہ ہنسی۔ ''اصل میں ہماری فیلڈ ہی ایسی ہے کہ اپنا خیال کم ہی آتا ہے۔

''شاید۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو گھر میں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''ہاں چلو۔'' وہ فوراً اٹھ گئی۔



اتفاق سے ایک ساتھ تین کیس آ گئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ مسلسل لیبر روم میں

مصروف رہی بقیہ مریضوں کو اس کی اسسٹنٹ ڈاکٹر نے اٹینڈ کیا تھا۔ جس وقت وہ لیبر روم سے نکلی سب مریض جا چکے تھے اور ڈاکٹر عارفہ بھی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے کھڑے کھڑے اس سے مریضوں کی بابت پوچھا

پھر سسٹر سے چائے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ حقیقتاً وہ اس وقت بے حد تھکی ہوئی تھی اور چاہتی تو یہی تھی کہ سیدھی گھر چلی جائے لیکن آج ڈرائیور چھٹی پر تھا اور وہ فوراً گاڑی ڈرائیو کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہی تھی اس لیے وہ کچھ دیر ستانے کی غرض سے اپنے کمرے میں آ بیٹھی سسٹر نے چائے لا کر اس کے سامنے رکھی تو وہ اسے جانے کا کہہ کر فوراً چائے پیتے ہوئے اس کے تنے ہوئے اعصاب قدرے پرسکون ہونے لگے۔ کپ خالی کر کے اس نے ٹیبل پر رکھا پھر بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک گزرے دنوں یا شاید ڈھیر سارے ماہ و سال کی تھکن پورے وجود میں اترنے لگی تھی۔ جبھی تو اس نے سوچا۔

کتنا بہت سارا وقت گزر گیا اور ایک پل میں اس کی نگاہوں میں کیا کچھ نہ آن سمایا۔ عطا اور سونیا کی شادی پھر وہ اپنے پروگرام کے مطابق فوراً جام پور چلے گئے تھے اور اب تک وہیں تھے۔ تایا ابو اور تائی امی ان کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ دو سال پہلے جب تایا ابو کا انتقال ہوا تب عطا، تائی امی کو ساتھ لے گیا۔ اور بیچارے دادا کو جیسے تایا ابو کے ساتھ ہی ختم ہو گئے تھے۔ بمشکل اپنے آپ کو گھسیٹا پھر انہوں نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔ اب یہاں صرف وہ اور ممی ڈیڈی تھے۔ ڈیڈی جنہوں نے اس وقت پتا نہیں کیا سوچ کر اس کے لیے میڈیکل کا انتخاب کیا تھا اب اکثر کہتے تھے کہ کاش میں تمہیں ایم۔ بی۔ اے کا مشورہ دیتا تو آج مجھے بیٹے کی کمی کا احساس نہ ہوتا۔ اور وائے ستم ظریفی کہ ڈیڈی کا اس وقت کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط لیکن اسے ایک دم تنہا کر گیا تھا۔ بے پناہ مصروفیات کا بہانا کر کے وہ اب تک شادی سے انکار کرتی آ رہی تھی اور حقیقت یہ تھی کہ وہ جس شخص کے لیے اپنے دل میں کسک رکھتی تھی وہ اسے کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی۔ یہاں آنے کے بعد سے اس نے اس سے کوئی رابطہ بھی نہیں رکھا تھا اور گو کہ وہ اسے اپنا ایڈریس دے کر آئی تھی لیکن اس نے بھی کوئی سندیسہ نہیں بھیجا تھا۔ اب تک تو اسے مایوس ہو جانا چاہیے تھا۔ آٹھ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا لیکن شاید وقت رخصت رابنسن مارک نے اس کی وہی ڈوری اس کے ہاتھوں میں تھما دی تھی جو کبھی خود اس نے تھامی تھی۔

"تمہارے ہاتھوں میں آس کی کیسی ڈور ہے جو اس تمام عرصے میں ٹوٹی نہیں، پھسلی نہیں۔" اس نے شدت سے روتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ ڈور تو میری سانسوں کے ساتھ بندھی ہے ٹوٹ جاتی تو باقی کیا رہ جاتا۔" وہ آرزردہ لہجے میں بولا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" چوکیدار نے تیسری دفعہ پکارا، تب اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو وہ ایک کارڈ اس کی طرف بڑھا کر بولا۔

"یہ صاحب آپ کا پوچھتا ہے۔" اس نے کارڈ لے کر دیکھا۔

"ڈاکٹر عبادالرحمٰن لغاری۔" زیر لب پڑھتے ہوئے وہ سوچنے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو چوکیدار کو یوں دیکھنے لگی جیسے وہ جانتا ہو۔

"کیا کہوں ان سے؟"

"بھیج دو۔" وہ گہری سانس کے درمیان بولی۔ پھر سامنے رکھے خالی کپ پر نظر پڑی تو جلدی سے اسے اٹھایا پھر اسے سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے لیے اسے خود اٹھنا پڑا۔ اور جب وہ کپ رکھ کر پلٹی تو وہ دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔ پھر ایک دو پل نہیں کتنے پل بیت گئے، دونوں اپنی اپنی جگہ ساکن۔

"رابی!" کتنی دیر بعد جیسے اسے ہوش آیا۔ دھیرے سے پکارا تو وہ بھی چونکا اور جو قدم رک گیا تھا آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

"کیسی ہو۔"

"تم بیٹھو تو۔" وہ کہنا چاہتی تھی میں ابھی ابھی تمہیں یاد کر رہی تھی۔ لیکن کہہ نہیں سکی۔

"کیسے ہو۔" وہ بیٹھ گیا تو اسی کی بات دہرائی۔

"تمہارے سامنے ہوں۔" اس کی ہلکی سی مسکراہٹ میں وہی دلکشی تھی۔

"پہلے میں تمہارے لیے چائے لے آؤں۔" وہ اٹھنے لگی کہ اس نے روک دیا۔

"چائے میں ضرور پیوں گا لیکن ایک بات جاننے کے بعد؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو پوچھنے لگا۔

"تمہارے دل میں اب بھی میرے لیے کسک ہے یا نہیں۔؟"

"تم صرف یہی جاننے کے لیے۔"

''ہاں صرف یہی جاننے کے لیے یہاں تک آیا ہوں۔'' وہ فوراً بول پڑا۔

''تو میں جھوٹ نہیں بولوں گی رابی، یہ کسک مجھے چین نہیں لینے دیتی۔'' اس کی پلکیں بھیگیں اور لہجہ بھی تو۔ وہ سر جھکا کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

''تھینکس گاڈ۔'' اس نے ذرا سا سر اونچا کر کے اطمینان بھرا سانس لیا۔ پھر ٹیبل پر دونوں بازو رکھ کر اس کی طرف جھک کر بولا۔

''تم رو رہی ہو، جب کہ میں تمہارے لیے نئے موسموں کی نوید لایا ہوں۔'' اس نے فوراً سر اونچا کیا تو وہ پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔

''پہلے چائے۔ اس کے بعد کوئی اور بات ہوگی۔''

''میں ابھی لاتی ہوں، کچھ کھانے کو منگواؤں؟''

''نہیں بس چائے۔'' وہ جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔ کوریڈور میں آیا بینچ پر لیٹی اونگھ رہی تھی، اسے دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھی تو وہ اسے آرام کرنے کا اشارا کرتی ہوئی خود ہی کچن میں چلی گئی۔ پھر چائے بنانے کے دوران وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچتی رہی اور یہ بھی کہ اس نے کسی نتیجے پر پہنچنے میں اتنی دیر کیوں کی۔ وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی، بہت سارے سوال تھے۔ اور جب دوبارہ آکر اس کے سامنے بیٹھی تو وہ خود ہی کہنے لگا۔

''میری زندگی میں سب سے پہلی اور اہم عورت میری ممی ہیں۔ میں انہیں الزام نہیں دوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ دانستہ یا نادانستہ ان سے غلطی ضرور ہوئی۔ کیونکہ جب انکل لغاری سے شادی کے وقت ہی وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی تھیں تو انہیں میرے بارے میں بھی اسی وقت سوچنا چاہیے تھا۔ میں اس وقت صرف تین سال کا ہی تو تھا۔ اور اتنی عمر میں ظاہر ہے مجھے جو سکھایا جاتا میں وہی سیکھتا۔ لیکن ممی نے مجھے ہاسٹل میں رہنے دیا ساتھ ہی میرے تمام اختیارات فادر کو سونپ دیے۔ بہرحال ممی کو احساس اس وقت ہوا جب میں اچھا خاصا سمجھدار ہو چکا تھا وہ بھی انکل لغاری کے کہنے پر ایک دن ممی کے گھر میں سینے پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا جب انکل لغاری نے مجھے ٹوکا اور میں کیونکہ ان سے خاصا متنفر تھا کہ انہوں نے مجھ سے میری ممی کو چھینا تھا، اس لیے میں ہر وہ بات کر کے خوشی محسوس کرتا جو انہیں طیش دلانے کا سبب بنتی تھی۔ تمہیں اندازہ ہوگا کہ ایسے حالات کا شکار بچے ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔ پھر ممی نے لاکھ کوشش کی کہ میں ان کے راستے پر چلوں ان کے مذہب کو اپناؤں

لیکن میں محض انکل لغاری کی وجہ سے انکار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن ممی مجھے چھوڑ کر ویسٹ انڈیز چلی گئیں۔ جاتے جاتے وہ مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ وہ اس وقت تک مجھ سے کوئی رابطہ نہیں رکھیں گی جب تک میں مسلمان نہیں ہو جاتا۔ اور کیا تم یقین کرو گی کہ انہوں نے مجھ سے وہی الفاظ کہے تھے جو وقت رخصت مجھ سے کہہ آئی تھیں۔

تمہارے لیے تمہاری راہ میرے لیے میری راہ۔ اس وقت میں پہلی بار ٹھٹکا تھا کہ آخر اس مذہب میں ایسی کیا بات ہے جو میری ماں مجھ سے سارے ناتے، سارے رابطے توڑے جا رہی ہے۔ پھر اسی وقت سے میں نے اس مذہب کے متعلق کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں اگر تمہیں یاد ہو تو تم سے پہلی تفصیلی ملاقات کے وقت میں نے کہا تھا کہ میں جانتا ہوں مسلمان اپنے عقیدے میں اٹل ہوتے ہیں ایسی ہی اور باتیں جو تم نے صرف سن لی تھیں یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں اتنا کچھ کیسے جانتا ہوں۔ تم اگر اسی وقت یہ پس منظر جان لیتیں تو یقیناً مجھے سمجھانے کی کوشش کرتیں اور اس وقت میں تمہاری بات مان لیتا۔ پھر تم نے کوشش کی بھی تو ممی کے کہنے پر، اور اس وقت تک میرا خیال تھا کہ ممی صرف انکل لغاری کے کہنے پر ایسا چاہتی ہیں اور انکل لغاری کی تو میں کوئی بات نہیں مان سکتا تھا۔ قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''تم میری زندگی میں آنے والی دوسری اہم عورت تھیں اور تم بھی مجھے مذہب کی وجہ سے چھوڑ آئیں، اس رات نومیہ میں بہت رویا اور جو تم نے کہا تھا کہ خدا کی محبت اتنی زور آور ہوتی ہے کہ اس کے سامنے سارے جذبے اپنی موت آپ مر جاتے ہیں تو میں یہی دعا کرتا رہا کہ میرے دل میں بھی وہ محبت سما جائے تاکہ میں ممی کو بھی بھول جاؤں اور تمہیں بھی۔ شاید قبولیت کی گھڑی تھی اور پھر یہ بھی تو ہے کہ تم ایک قدم بڑھو، میں دس قدم بڑھ کر تھام لوں گا، تو میرے ساتھ یقیناً ایسا ہی ہوا کہ اس رات کی سحر جب ہوئی تو اوپر والا مجھے تھام چکا تھا۔ اس کی رسی کو مضبوطی سے تھاما تو سارے جذبے ماند پڑ گئے۔''

وہ متحیر سی بیٹھی تھی وہ لمحہ بھر کو رکا۔ اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھ کر ذرا سا مسکرایا۔ پھر کہنے لگا۔

''تم پوچھو گی، میں نے اسی وقت مطلع کیوں نہیں کیا تھا۔ بقول تمہارے تمہیں فوراً نئے موسموں کی نوید کیوں نہیں دی تھی۔ اس وقت میں نے بھی سوچا تھا۔ تمہیں فوری مطلع

کروں۔ لیکن پھر خیال آیا پہلے نئے راستے پر تو مضبوطی سے قدم جمالوں تا کہ جب تمہارے پاس آؤں تو پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکوں کہ میں نے تمہاری راہ اپنالی ہے۔''

''تمہاری راہ کہنے میں کوئی مضائقہ تو نہیں ہے نا؟''

''نہیں۔'' کی صورت اس کے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوئی۔

پھر جن نظروں سے وہ دیکھ رہا تھا ان کا مفہوم سمجھ کر پلکیں جھکا لیں تو وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی آج بھی ویسے ہی دلفریب تھی۔

''اب بتاؤ۔ کسک کو محبت میں بدلنے میں کتنی دیر لگے گی؟''

''کوئی دیر نہیں۔ چلو۔ میں تمہیں اپنے ممی ڈیڈی سے ملواؤں۔''

وہ اب اسے ایک پل کے لیے بھی مایوس نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے ساتھ باہر نکلی۔

سب سے پہلے ڈھلتی سہ پہر کے سورج کی نارنجی شعاعیں ان کی راہوں میں مبارکبادیوں کے پھول نچھاور کرنے چلی آئی تھیں۔

جلاتے چلو چراغ

''ممی بھی عجیب ہیں۔'' میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا ''دس بج رہے ہیں اور ابھی تک بیٹھی سر کھپا رہی ہیں۔ پتا نہیں یہ اتنے سارے لوگوں کے ساتھ مغز ماری کیسے کر لیتی ہیں۔ کتنی بار کہا ہے، زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے آفس بند کر دیا کریں۔''

''روبی۔!'' شاید ممی آ گئی تھیں۔ میں جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔

''سوری ڈارلنگ! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔'' میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی انہوں نے معذرت کی۔

''اتنی دیر کر دیتی ہیں ممی آپ!''

''کیا کروں بیٹا! جب بھی اٹھنے کا ارادہ کرتی ہوں، کوئی نہ کوئی آ جاتا ہے۔'' ممی..... تھکے تھکے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''پلیز ممی! اب اس طرح مت بیٹھیں، جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آئیں۔ میں کھانا نکالتی ہوں، مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟'' ممی نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

''آپ جانتی ہیں۔ میں آپ کے بغیر نہیں کھاتی۔''

''لیکن بیٹا! جب مجھے دیر ہو جایا کرے تو تم کھا لیا کرو۔''

''نہیں۔ بس آپ جلد ہی آیا کریں۔'' میں کچھ روٹھے لہجے میں کہہ کر کچن میں آ گئی۔ جلدی جلدی کھانا گرم کر کے ٹیبل پر رکھا اور پھر وہیں بیٹھ کر ممی کا انتظار کرنے لگی۔

اس گھر میں صرف میں اور ممی رہتے ہیں۔ کوئی دس سال پہلے ڈیڈی کینیڈا گئے تھے، اور وہاں سال بھر بعد ہی انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے

اور ممی سے یوں لاتعلق ہو گئے، جیسے اس دنیا میں ہمارا وجود ہی نہ ہو۔ شروع شروع میں مم بہت بوکھلائی ہوئی سی رہتی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ عزیز، رشتہ دارو نے بس چند دن ممی کی دلجوئی کی تھی۔ اس کے بعد سب نے اپنی اپنی راہ لی، یوں جیسے فرض نبھا دیا ہو۔

مجھے یاد ہے ان دنوں ممی چپکے چپکے رویا کرتی تھیں، لیکن میرے سامنے ہمیشہ اپ آپ کو نارمل پوز کرتیں۔ ہم دونوں ماں بیٹی ایک طرح سے بالکل تنہا ہو گئے تھے۔ یہ بھی اللہ شکر ہے کہ گھر ہمارا اپنا تھا۔ یعنی ڈیڈی نے ممی کے نام سے خریدا تھا۔ ورنہ ہمارے لیے بہ مسائل کھڑے ہو سکتے تھے۔ پھر کسی مہربان دوست کے مشورے سے ممی نے دو کمرے اپ پاس رکھ کر باقی گھر کرائے پر اٹھا دیا۔ جس سے آمدنی کا ایک ذریعہ بھی ہو گیا۔ گو کہ جس طر زندگی کے ہم عادی تھے، اس کے لیے یہ آمدنی کافی نہیں تھی، پھر بھی اتنا تو ہو گیا کہ ہم کس کے محتاج نہیں ہوئے۔

اس کے بعد دو تین سال تک جلتی کڑھتی رہی تھیں۔ انہیں ڈیڈی کی بے وفائی بہت دکھ تھا۔ اور دکھ کی بات تو تھی، کیونکہ ڈیڈی کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ت کہ وہ اس طرح ممی کو چھوڑ دیں گے، جب تک یہاں تھے لوگ ممی ڈیڈی کی مثالیں دیا کر تھے۔ دونوں میں بہت زیادہ انڈراسٹینڈنگ تھی۔ پھر ڈیڈی مجھ سے بھی بہت پیار کرتے تھے۔

اب میں بھی سوچتی ہوں تو مجھے بے حد حیرت ہوتی ہے کہ میرے اتنے چاہ والے ڈیڈی اچانک بدل کیسے گئے۔ لوگ کہتے ہیں مرد کا کوئی بھروسا نہیں، اس کی محبت ایک ہوتی ہے، سامنے رہو تو جان دینے سے کم بات نہیں کرتا، اور ذرا سا نظروں سے اوجھل ہو جاؤ تو دل سے نکال پھینکتا ہے، اور اب تو مجھے بھی لوگوں کی باتوں سے سو فیصد اتفاق تھا۔

بہر حال شروع کے دو تین سال کے بعد ممی اچانک جیسے خواب غفلت سے بیدا ہوئی تھیں۔ انہیں یوں کڑھتے رہنا انتہائی احمقانہ پن لگا۔ اور غالباً انہوں نے یہ بھی سوچا ک جتنا وہ اپنے آپ کو تنہا کریں گی۔ اتنی زیادہ تنہا ہوتی جائیں گی۔ اس عرصے میں، میں بھ خاصی مرجھا کر رہ گئی تھی۔

ممی خاص طور سے سب سے پہلے میری طرف متوجہ ہوئیں، اس کے بعد انہو نے اپنے اطراف نظر دوڑائی تو دو کمروں میں محدود زندگی میں انہیں کوئی کشش نظر نہیں آئی۔

آمدنی اتنی، جس میں پس انداز کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جب کہ ان کے سامنے میں موجود تھی، اور میرے بارے میں تو انہیں سوچنا ہی تھا۔

یوں اُسی وقت سے ممی کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے انہوں نے کرایہ داروں سے گھر خالی کروایا۔ اس کے بعد باہر کی طرف جو دو کمرے تھے، ان میں ممی نے میرج بیورو قائم کر لیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک تو ممی جاب کے لیے ادھر ادھر جانے سے بچ گئیں، دوسرے انہیں میری فکر بھی نہیں رہی کہ مجھے کہاں اور کس کے پاس چھوڑیں گی۔ یوں رفتہ رفتہ ممی نے اپنا بزنس (میں اسے بزنس ہی کہوں گی) سیٹ کر لیا۔

مصروفیت کی وجہ سے ممی بہت حد تک سنبھل گئی تھیں۔ ان کے پاس اب غالباً ڈیڈی کی بے وفائی پر رونے اور کڑھنے بلکہ انہیں یاد کرنے کے لیے بھی وقت نہیں تھا، اور گو کہ میں ممی کو ایسے ہی مصروفیت اور ایکٹو دیکھنے کی خواہاں تھی، اس کے باوجود پتا نہیں کیوں مجھے ممی کا یہ بزنس پسند نہیں تھا۔ میں چاہتی تھی، ممی کوئی اور بزنس کر لیں۔ جیسے گارمنٹس وغیرہ۔ کوئی بوتیک، لیکن وہ ہمیشہ میری بات سن کر ٹال دیتیں۔ شاید وہ خود اس میں مطمئن تھیں۔

"تم نے ابھی تک کھانا شروع نہیں کیا۔" ممی آتے ہی مجھے ٹوکتے ہوئے بولیں۔ پھر کرسی کھینچ کر بیٹھیں۔ تو پہلے میری پلیٹ میں سالن نکالا۔ پھر اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہنے لگیں۔

"چلو، جلدی سے شروع کرو۔ اتنی دیر تک بھوکے رہنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"آپ کے لیے اچھی بات ہے۔"

"بیٹا! میری کیا بات کرتی ہو۔ میں تو اب بوڑھی ہو گئی ہوں، اکثر رات میں بھوک ہی نہیں لگتی۔"

"آپ اپنے آپ کو بوڑھی کہہ رہی ہیں ممی! اتنی ینگ تو ہیں۔ میری اکثر سہیلیاں آپ کو میری بڑی بہن سمجھتی ہیں۔"

"اچھا!" ممی خوش دلی سے ہنسیں، پھر جیسے اچانک یاد آیا تو کہنے لگیں۔

"ہاں، وہ تمہاری دوست نہیں ہے، کیا نام اس کا۔ صائمہ، آج اس کی ممی کا فون آیا تھا۔"

"کیا کہہ رہی تھیں؟" میں نے متوجہ ہو کر پوچھا۔

"مجھے تو بیٹا! سب ایک ہی کام سے فون کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنی بیٹی صائمہ
لیے کسی اچھے رشتے کی بات کر رہی تھیں۔" پھر خود ہی کہنے لگیں۔

"بہت مسئلہ ہے لڑکیوں کے لیے۔ اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں
میرے پاس گو کہ اچھے رشتے موجود ہیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر ایسے لوگوں کے ہیں۔
دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور دوسری شادی کا کوئی معقول جواز بھی نہیں ہے۔ ان
پاس۔ پہلے سے بیوی بچے موجود ہیں، پھر بھی بس دوسری کرنی ہے۔"

پھر غالباً انہیں ڈیڈی کا خیال آ گیا تھا۔ گہری سانس لے کر بولیں۔

"یہ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کبھی بھی ایک کے ساتھ وفادار نہیں رہتے۔"

"چھوڑیں ناں ممی!" میں اکتا کر بولی۔ "کوئی باوفا یا بے وفا ہو ہمیں کیا۔ اور م
تو آپ کو کتنی بار کہہ چکی ہوں۔ کہ بند کر دیں یہ میرج بیورو۔ کوئی بوتیک وغیرہ کھول لیں، تا
میں بھی آپ کا ہاتھ بٹا سکوں۔"

"بس ابھی تم امتحانوں سے فارغ ہوئی ہو۔ کچھ عرصہ ریسٹ کرو، پھر میں تمہار
شادی کر دوں گی۔" انہوں نے میرا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا، تو میں خاموش ہو رہی۔



آج کل میرے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی، ادھر جب سے امتحان ختم ہو
تھے۔ اس کے بعد سے تو کسی کتاب کو بھی ہاتھ لگانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ صبح کے وقت م
ہوتیں تو وقت کچھ آسانی سے کٹ جاتا تھا، لیکن تین چار بجے کے قریب، جب وہ اپنے آفس
میں جا بیٹھتیں۔ تب میں بہت تنہا ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی میں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ
دل ہی دل میں "کیا کروں" کا ورد کر رہی تھی۔ کہ عینی آ گئی۔ عینی میری بہت اچھی دوست
تھی۔ اس کی آمد پر میں کھل اٹھی اور خوشی کا اظہار اس کے گلے میں بازو ڈال کر کیا۔

"سچ عینی! اس وقت میں یہی دعا مانگ رہی تھی، کہ تم آ جاؤ۔"

"خیریت۔؟"

"اتنی بور سی ہو رہی تھی ایمان سے۔" میں سچ مچ رومانسی ہو گئی۔" جب سے کا
چھوٹا ہے، میں تو بس گھر کی ہو کر رہ گئی ہوں۔"

"بیوقوف ہو تم۔ حالانکہ تمہارے پاس گھر ہی میں اچھی خاصی مصروفیت موجود ہے۔"

"کون سی؟" میں بالکل نہیں سمجھی۔

"بھئی شام کو اپنی ممی کے ساتھ آفس میں بیٹھ جایا کرو۔"

"اوں ہوں۔" میں نے برا سا منہ بنایا۔" مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔"

"کیوں۔؟"

"بس۔ خیر چھوڑو اس کو یہ بتاؤ، تم آج کل کیا کر رہی ہو۔"

"تمہاری طرح کچھ نہیں۔ لیکن جلد ہی کچھ کرنے کا ارادہ ہے۔ میرا مطلب ہے
جاب۔ ایک دو جگہ اپلائی کیا ہے، دیکھو کیا بنتا ہے۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"لیکن تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے؟"

"یار گھر بیٹھنے سے تو بہتر ہے، پھر میرا خیال ہے یہ جو اتنا پڑھ لکھ لیا ہے، اسے
چولہے ہانڈی کی نذر کرنا حماقت ہے۔ کم از کم ملک و قوم کی کوئی فائدہ ہی پہنچا دیں۔" اپنی
بات پر وہ خود ہی زور سے ہنسی۔

"ٹھیک کہتی ہو۔" میں بھی ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو کچن میں۔ تمہیں
چائے بھی پلا ہی دوں۔"

"ارے نہیں۔" اسے جیسے اچانک اپنی آمد کا مقصد یاد آیا۔ "میں اس لیے آئی تھی
کہ طارق روڈ چلیں گے، مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ چلو گی ناں۔"

"میں۔" میں سوچ میں پڑ گئی۔

"کوئی بہانا نہیں چلے گا۔"

"بہانا نہیں یار۔ میں سوچ رہی ہوں، مجھے بھی کچھ لینا تو تھا۔"

"چلو راستے میں یاد آ جائے گا۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔

"ایک منٹ، میں ممی کو بتا آؤں، اور اُن سے کچھ پیسے بھی لے آؤں۔"

"جلدی آنا۔ میں باہر گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی، اور میں ایک شانے پر جھولتے
پٹے کو پھیلا کر اوڑھتے ہوئے ممی کے آفس میں داخل ہوئی تو وہ اس وقت اپنے کسی کلائنٹ
کے ساتھ بات کرنے میں مصروف تھیں۔ میں نے فوراً انہیں پکارنا مناسب نہیں سمجھا اور رُک
ان کی بات ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ اپنے سامنے بیٹھے شخص سے کہہ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے، آپ شادی شدہ ہیں، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ آپ اس بات کو بھی کریں۔ میرا خیال ہے رہنے دیں۔ فارم میں اپنے آپ کو کنوارا لکھ دیں، ویسے بھی آپ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ۔''

اسی وقت ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ تو پہلے کچھ حیران ہوئیں، پھر پوچھنے لگیں۔

''کیا بات ہے؟''

''وہ ممی! میں ذرا عینی کے ساتھ طارق روڈ جا رہی ہوں۔'' انہوں نے لحہ بھر کو سو پھر جلدی جلدی ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''یہ کچھ چیزیں بھی لیتی آنا۔ اور ہاں یہ لو۔'' انہوں نے دراز سے پیسے نکال میری طرف بڑھائے، تو میں جلدی سے دونوں چیزیں لے کر باہر نکل آئی۔ مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ خاص کر ممی کی بات جو وہ اس شخص سے کہہ رہی تھیں۔

''لگتا ہے تمہاری ممی نے پہلے ڈانٹا ہے، پھر تمہیں پیسے دیئے ہیں۔'' میری خامو کو محسوس کر کے عینی نے کہا تو میں چونک پڑی۔

''نہیں تو۔''

''پھر کیا بات ہے؟ کچھ دیر پہلے تک تو تم اچھی بھلی تھیں۔''

''میں اب بھی اچھی بھلی ہوں۔'' میں نے لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کر ہوئے کہا۔ ''اصل میں، میں ممی کے آفس نہیں جاتی۔ مجھے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔''

''کیوں؟''

''اب میرے پاس تمہاری اس کیوں کا جواب نہیں ہے۔'' اس کے ساتھ ہی رخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

پھر شاپنگ میں ہمیں کافی وقت لگا۔ اس کے بعد ہمارا ارادہ صائمہ کے پاس جا کا تھا۔ لیکن گہری ہوتی شام کے پیش نظر ہم نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ عینی بھی مجھے باہر سے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے اندر آ کر لائٹس آن کیں۔ پھر کچن میں آ کر چائے بنائی، اور لے کر ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھی۔ ٹی وی پر میرا فیورٹ پروگرام آ رہا تھا۔ لیکن میں غالباً تھک کے باعث توجہ سے نہیں دیکھ سکی، اور چائے ختم کرتے ہی دوبارہ کچن میں آ گئی۔

رات کے کھانے کے لیے صرف روٹی پکانی باقی تھی۔ میں نے جلدی سے آ

گوندھ کر روٹی پکائی اور ہاٹ پاٹ میں رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں اس وقت سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت سے دوچار تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہم کبھی کبھی خود اپنا احوال نہیں جان پاتے، حالانکہ ابھی عینی کے ساتھ میں نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ تمام راستہ اس کی دلچسپ باتوں پر ہنستی بھی رہی تھی، پھر بھی پتا نہیں کیوں گھر میں داخل ہوتے ہی مجھ پر عجیب سی بے بسی طاری ہو گئی تھی۔

''آخر مجھے ہوا کیا ہے؟'' میں نے بیڈ کی پٹی سے سر ٹکا کر پلکوں کے در کرتے ہوئے سوچنا چاہا تو اسی وقت برآمدے میں ممی کے قدموں کی چاپ گونجنے لگی۔

''روبی!'' مجھے پکارنے کے ساتھ ہی ممی نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ تو میں نے بھی آنکھیں کھول دیں، اور ان پر نظر پڑتے ہی میں جان گئی کہ اس وقت سے میں کیا سوچنا چاہ رہی تھی۔

''تم نے کھانا کھا لیا؟ ممی نے مجھے غائب دماغی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر پوچھا۔ تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''آ جاؤ، میں کھانا نکال رہی ہوں۔'' وہ یہ کہتی ہوئی وہیں سے پلٹ گئیں۔ اور میں چاہنے کے باوجود لپک کر ان کے پیچھے نہ جا سکی۔

''روبی!'' ممی وہیں سے پکار رہی تھیں۔ میں بادل نخواستہ اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئی۔

''کیا بات ہے؟ تھک گئی ہو؟'' پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگیں۔

''تم بہت نازک مزاج ہو، اس لیے میں تمہیں کہیں نہیں بھیجتی۔ ذرا سا کہیں جاؤ، اور واپسی میں یہ حال ہوتا ہے تمہارا۔''

''کیا ہوا ہے مجھے؟'' میں اکتا کر بولی۔

''اتنی سست ہو رہی ہو۔''

''نہیں تو۔ آپ کو تو یونہی وہم ہو جاتا ہے۔'' پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ مزید کہتیں۔ میں اپنی طرف سے ان کا دھیان ہٹانے کی خاطر پوچھنے لگی۔

''وہ ممی! صائمہ کی ممی کا دوبارہ فون آیا یا نہیں؟''

''نہیں۔''

"آپ نے انہیں کیا جواب دیا تھا۔ کیا آپ کے پاس صائمہ کے لیے کوئی اچھا پروپوزل ہے۔" میں کن انکھیوں سے انہیں دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"ابھی تو کوئی نہیں ہے اور میں نے ان سے بھی یہی کہا ہے کہ کوئی اچھا پروپوزل ہوگا تو میں انہیں کال کروں گی۔" پھر مجھ سے پوچھنے لگیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے صائمہ کے لیے کیسا پروپوزل ہونا چاہیے؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں، ہاں البتہ ایسا نہ ہو۔ جیسا شام میں آپ کے آفس میں موجود تھا۔" مجھے اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا۔

"کیا مطلب۔؟" می چونک کر میری طرف دیکھنے لگیں۔

"مطلب آپ اچھی طرح سمجھتی ہیں می! اور کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ ایک شادی شدہ شخص کو کنوارا ظاہر کرکے آپ کسے دھوکا دینے جارہی ہیں۔"

"روبی!" می نے فوراً ٹوکا۔ "تمہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں ضرورت نہیں ہے۔ آپ غلط کام کریں گی تو میں ضرور بولوں گی۔"

"میں کوئی غلط کام نہیں کررہی، اور نہ ہی دنیا سے نرالا۔ باہر نکل کر دیکھو، یہاں کیا کچھ نہیں ہورہا۔ زندگی کے ہر شعبے میں، ہر معاملے میں فریب ہی فریب ہے، اور پھر میرا مقصد کسی کو فریب دینا نہیں ہے۔"

"پھر کیا مقصد ہے آپ کا؟" میرے لہجے میں آپ ہی آپ طنز اتر آیا۔

"کوئی مقصد نہیں۔ بس میرا جو کام ہے، مجھے وہ کرنا ہے۔" پھر خود ہی تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگیں۔

"کوئی بیگم شیراز ہیں۔ ان کو اپنی بیٹی کے لیے فوری رشتہ درکار ہے۔ کیونکہ ان کا بیٹا باہر سے آرہا ہے، اور وہ چاہ رہی ہیں بیٹے کے ساتھ ساتھ بیٹی کے فرض سے بھی سبکدوش ہوجائیں۔ میرے پاس ایک دو کنوارے لڑکوں کے رشتے موجود ہیں۔ لیکن وہ ان کے معیار کے نہیں ہیں۔ جب کہ آج جو شخص دوسری شادی کے لیے آیا تھا۔ اس کا تعلق اچھے گھرانے سے ہے، پھر تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ خاصے وسیع بزنس کا مالک بھی ہے، قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"میں سمجھتی ہوں۔ کوئی بھی شخص یہ جاننے کے باوجود کہ وہ شادی شدہ اور بچوں کا باپ ہے، اسے اپنی بیٹی دینے پر اعتراض نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ تو کیا چار بیویاں افورڈ کرسکتا ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو آپ کو بیگم شیراز کو بتا دینا چاہیے کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔" میں نے ان کی ساری بات سن کر کہا تو وہ نفی میں سر ہلانے لگیں۔

"کیا ضرورت ہے جبکہ اس شخص کا کہنا بھی یہی ہے کہ وہ نہ تو اپنی پہلی بیوی کو دوسری شادی کی خبر ہونے دے گا اور نہ ہی دوسری کو پہلی کے بارے میں بتائے گا۔"

"کب تک؟"

"یہ اس کا مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں ہم کیوں سوچیں۔" می کے اطمینان سے کہنے پر میں سلگ اٹھی۔

"سوچ لیں! کبھی ایسا میرے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔"

"شٹ اپ۔!" می ایک دم آپے سے باہر ہوگئیں۔ لیکن پھر فوراً سنبھلتے ہوئے بولیں۔

"تمہیں یہ ساری باتیں سوچنے کی ضروت نہیں ہے جان۔ تم خواہ مخواہ اس بات کو اہمیت دے رہی ہو، جب کہ یہ کوئی انہونی نہیں ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" میں ان سے مزید بحث نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے دل پر بوجھ لیے ان کے پاس سے اٹھ آئی۔

پھر اگلے کئی دن تک میں اس بات کو نہیں بھلاسکی۔ مجھے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ می جنہیں میں آئیڈیل تصور کرتی تھی۔ وہ بھی اس فریب میں شامل تھیں۔ اور اب تو میں یہ بھی سوچنے لگی تھی کہ ہوسکتا ہے وہ اس سے پہلے بھی ایسی شادیاں کرواچکی ہوں۔ بہر حال میں پہلے ہی می کے اس بزنس کے خلاف تھی۔ اب تو اور بھی متنفر ہوچکی تھی، اور میرے اندر ایک انجانا سا خوف بھی آسمایا تھا۔ پتانہیں کب کیا ہو؟ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ کبھی کوئی اپنے ساتھ ہونے والے فریب کا حساب لینے می کے مقابل آن کھڑا ہو۔ اور ایسے کسی لمحے کا تصور کرکے ہی میں خوفزدہ ہوجایا کرتی تھی، کیونکہ ایک طرح سے میں اور می بالکل تنہا ہی تھے۔ اگر ایسا کوئی وقت آجاتا تو ہماری مدد کو آنے والا کوئی نہیں تھا اور پتانہیں می اس نہج پر کیوں نہیں

سوچتی تھیں۔ یا شاید وہ یہ سمجھتی تھیں کہ وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

انہی دنوں میرا رزلٹ آ گیا۔ اس کے بعد یونیورسٹی جوائن کرتے ہی میں وقتی طور پر ساری باتیں بھلا کر ادھر مصروف ہو گئی۔ میری تمام سہیلیاں جو بی اے تک میرے ساتھ تھیں۔ ان میں سے کسی نے بھی یونیورسٹی جوائن نہیں کی تھی۔ اس لیے مجھے شروع میں کافی دقت ہوئی لیکن پھر رفتہ رفتہ کافی لڑکیوں سے جان پہچان ہوتی گئی۔ جس سے اس نئے ماحول میں میرا دل لگنے لگا۔ ورنہ میں بہت اکتائی اکتائی سی رہتی تھی۔ اس وقت میں عینی کو اپنی نئی دوستوں کے حوالے سے دلچسپ باتیں بتا کر ہنس رہی تھی، جب وہ کہنے لگی۔

''شکر ہے، تمہارے چہرے پر بھی رونق آئی۔ ورنہ تمہاری بے زار شکل دیکھ دیکھ کر تو میں اُکتا گئی تھی۔''

''کیا کرتی، گھر میں بیٹھ بیٹھ کر ایسی ہو گئی تھی۔''

''اسی لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ کہیں جاب کر لو۔''

''میں نے کہا تھا ممی سے لیکن وہ نہیں مانیں۔''

''ایک بات بتاؤ'' وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''تمہاری ممی لوگوں کی شادیاں کرواتی ہیں۔ تمہارا خیال نہیں آتا انہیں؟''

''بکومت۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔''

''کیوں۔؟''

''بس، پہلے میں ایم اے کروں گی۔ ہاں اگر تم کہو تو تمہارے لیے ممی سے بات کروں۔''

میں نے بدلہ اتارتے ہوئے شرارت سے کہا تو وہ انگلی میں پڑی انگوٹھی میری آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

''جی نہیں۔ میرے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔''

''ارے، میں تو بھول ہی گئی تھیں۔ کب آ رہا ہے بلال؟'' میں نے اس کے منگیتر کے بارے میں پوچھا۔ جو ہائر اسٹڈیز کے لیے یو۔کے گیا ہوا تھا۔

''بس آنے والا ہے۔ غالباً تین چار مہینے بعد۔''

''اس کا مطلب ہے، تم اتنے ہی عرصے کی مہمان ہو۔'' اس نے ہلکی سی مسکراہٹ

کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔

''اب میں چلوں۔''

''ابھی بیٹھوں ناں۔''

''نہیں بھئی، پتا ہے آفس سے سیدھی یہیں آ رہی ہوں۔ اور اتنی سی دیر میں ممی کا بلڈ پریشر ہائی ہو چکا ہوگا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو میں اس کے ساتھ چلتی ہوئی باہر تک آئی۔

''سنو۔ کسی دن تم بھی میرے ہاں آنے کی غلطی کر ہی لو۔'' اس نے جاتے جاتے کہا۔ اور میں اس کی بات پر ہنستی ہوئی واپس پلٹ رہی تھی۔ کہ عقب سے آواز آئی۔

''ایکسکیوزمی۔'' میں نے گھوم کر دیکھا۔ اسی وقت کوئی گاڑی میرے پیچھے آ کر رکی تھی۔ اور اس میں بیٹھا شخص مجھے مخاطب کر رہا تھا۔

''جی۔!'' میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مسز شاہین کا میرج بیورو یہی ہے؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''جی، آپ ادھر چلے جائیں۔'' میں نے گیٹ کے اندر ممی کے آفس کی طرف اشارا کیا اور پلٹ کر گیٹ کے اندر داخل ہوئی، تو وہ بڑی پھرتی سے گاڑی سے اتر کر میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔

''سنیں، آپ ان کی کون ہیں؟''

''کن کی؟'' میں نے قصداً انجان بن کر اس کی طرف دیکھنا چاہا۔ لیکن اس اثنا میں وہ اتنا قریب آ گیا تھا۔ کہ میری نظریں اس کے شانوں کو چھو کر پلٹ آئیں۔

''میں مسز شاہین کی بات کر رہا ہوں۔''

''وہ میری ممی ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا، اور تیز قدموں سے روش پار کر کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ آئی۔ اور یہاں تک آ کر مجھے لگا جیسے وہ میرے قدموں کو شمار کرنے کے بعد ممی کی طرف گیا ہے۔

عجیب شخص تھا۔ کوئی بیسویں بار اس کے بارے میں اس انداز سے سوچتے ہوئے مجھے خود پر عجیب ہونے کا گمان ہونے لگا، بھلا مجھے کیا۔

اگر وہ بے پناہ وجیہہ تھا تو مجھے کیا۔

اگر اس کے وجود سے پوائزن کی دھیمی دھیمی مہک اٹھ رہی تھی تو مجھے کیا۔

اور۔

اگر وہ میرے آنے کے بعد بھی کچھ دیر میں وہیں کھڑا رہا تھا تو۔ تو۔ میں چاہنے کے باوجود ''مجھے کیا'' نہیں کہہ سکی۔ اس کے برعکس میرے ہونٹوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔

اس رات ممی نہ صرف کھانے کی ٹیبل پر بلکہ اس کے بعد جب تک وہ میرے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی رہیں۔ مسلسل اس کی باتیں کرتی رہی تھیں۔

''ابھی حال ہی میں امریکہ سے آیا ہے۔ والدین بہن بھائی کوئی بھی نہیں ہے، بے چارا بالکل اکیلا ہے۔ بس ایک چچا ہیں جو بچپن ہی میں اسے اپنے ساتھ امریکہ لے گئے تھے۔ چچا اب بھی اپنی فیملی کے ساتھ وہیں ہیں۔ جب کہ اسے اپنے وطن کی کشش کھینچ لائی ہے، پتا ہے کیا کہہ رہا تھا؟''

ممی اس کے بارے میں بتاتے ہوئے اچانک مجھ سے پوچھنے لگیں۔ تو میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کہہ رہا تھا کہ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ ایک عورت ہیں میری ماں کی طرح۔ کسی اچھے گھرانے میں میری شادی کرا دیں۔''

''وہ ممی! صائمہ۔''

''کیا صائمہ۔؟'' میری پوری بات سنے بغیر ممی نے کچھ اس طرح ٹوکا کہ میں خاموش ہوگئی۔ تب وہ نرم پڑتے ہوئے کہنے لگیں۔

''میں نے صائمہ کی ممی سے کہہ دیا ہے کہ کوئی اچھا رشتہ آئے گا تو میں انہیں بتاؤں گی۔'' پھر غالباً اس موضوع کو ختم کرنے کی غرض سے پوچھنے لگیں۔

''آج عینی آئی تھی۔''

''جی۔''

''بہت اچھی لڑکی ہے عینی۔ مجھے تمہاری دوستوں میں وہ سب سے زیادہ پسند ہے۔ خاصی ایکٹو ہے۔''

''ممی، عینی کی خوبیاں گنواتے ہوئے یا ان کا اعتراف کرتی ہوئی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں، تو میں بھی وہاں سے اٹھ گئی۔

اگلے دن وہ پھر آ گیا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی ممی کے آفس کی طرف جانے کے بجائے ہمارے رہائشی کمروں کی طرف آ گیا تھا۔ میں نے بے حد حیران ہو کر اسے دیکھا، اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

''کل آپ یوں بھاگ آئیں۔ جیسے میں آپ کو کھا جاؤں گا۔''

''آپ یہاں کیسے آئے؟'' میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔

''کانٹوں پہ چلتا ہوا آیا ہوں۔'' وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ تو میں نے گھبرا کر پہلے اطراف میں نظر دوڑائی پھر لہجے کو سخت بنا کر اسے تنبیہ کرنی چاہی۔

''دیکھیں مسٹر!''

''آصف جاہ۔!'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن کو ذرا سا خم دے کر فوراً بولا۔

''میں نے آپ کا نام نہیں پوچھا۔''

''پھر۔؟'' اس نے حیران ہونے کی ایکٹنگ کی۔

''پھر یہ کہ آپ یہاں سے چلیں جائیں، اور اگر ممی سے آپ کو کوئی کام ہے تو وہ اس وقت اپنے آفس میں ہیں، آپ وہیں چلے جائیں۔'' میں اپنی بات ختم کر کے پلٹی تو وہ قدم بڑھا کر میرے سامنے آ گیا۔

''مجھے آپ کی ممی نے ہی یہاں بھیجا ہے۔''

''ممی نے۔؟'' مجھے یقین نہیں آیا۔

''جی۔!'' اس کا اعتماد سے کھڑے ہونا اس کی بات کو سچ ثابت کر رہا تھا۔ پھر بھی میں شش و پنج میں پڑ گئی۔

''میرا خیال ہے۔ آپ اپنی ممی سے پوچھ لیں۔'' وہ میری کیفیت سمجھ کر بولا، اسی وقت ممی آ گئیں۔ بہت عجلت میں تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

''روبی! آصف کو اچھی سی چائے پلاؤ۔ میں کچھ دیر میں فارغ ہو کر آتی ہوں۔''

وہ اپنی بات کہہ کر چلی گئیں، تب میں اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تشریف رکھیں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

''شکریہ۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ اور شاید آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن میں جلدی سے کچن میں آ گئی۔ پھر چائے بناتے ہوئے میں مسلسل نہ صرف اس کے بارے میں

بلکہ ممی کے اس طرزِ عمل کے بارے میں بھی سوچتی رہی، اور ظاہر ہے، میں نادان نہیں تھی جو یہ نہ سمجھ سکتی، کہ کل ممی نے اس کی اتنی تعریفیں کیں۔ اور آج آفس کے بجائے گھر میں بٹھایا، تو یقیناً اس میں ممی کی خواہش کو دخل تھا۔

میں چائے لے کر آئی تو وہ کسی میگزین کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ ہلکی آہٹ پر ہی فوراً میگزین رکھ کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"مجھے افسوس ہے، میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی۔" وہ میرے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے بولا۔ تو میں نے پل بھر کو اس کی طرف دیکھا، پھر پلٹ کر دوسرے صوفے پر بیٹھی۔

"کیا کرتی ہیں آپ؟" اس نے غالباً یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"میں انگلش میں ماسٹر کر رہی ہوں۔"

"واقعی!" اس نے غیر یقینی سے مجھے سرتاپا دیکھا۔ پھر کندھے اُچکا کر بولا۔

"میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ انٹر میں پڑھتی ہوں گی۔"

"جی نہیں۔ اب اتنی چھوٹی بھی نہیں لگتی ہیں۔" وہ ہنس پڑا۔

"حیرت ہے، لڑکیاں تو اپنے بارے میں ایسی۔ قیاس آرائیاں سن کر خوش ہو جاتی ہیں اور آپ خفا ہو رہی ہیں۔"

"میں خفا نہیں ہو رہی۔ ویسے لڑکیوں کو بیوقوف بنانے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے۔"

"اچھا۔!" اس نے یوں ظاہر کیا۔ جیسے اس کی معلومات میں اضافہ ہوا ہو۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ "مجھے غلط مت سمجھیں۔ میں نے بہرحال آپ کو بیوقوف بنانے کی کوشش نہیں کی۔"

"میرا خیال ہے، مجھے آپ کو غلط یا صحیح سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں خالی کپ ٹرے میں رکھنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھی تو وہ شاید یہ سمجھا کہ میں جا رہی ہوں۔ فوراً پوچھنے لگا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"کہیں نہیں۔" میں کپ رکھ کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ تو وہ بہت خاموشی سے میرا جائزہ

لینے لگا، کبھی اس کی نظریں میرے چہرے پر جمتیں، کبھی بالوں پر، کبھی ہاتھوں اور کبھی پیروں پر اُلجھنے لگتیں، مجھے بڑا عجیب سا لگنے لگا۔ اور میں پریشان بھی ہوئی، دل چاہا اٹھ کر اندر چلی جاؤں، لیکن اس نے جیسے مجھے اپنی نظروں کے حصار میں لے لیا تھا کہ میں چاہنے اور کوشش کی باوجود اپنی جگہ سے اٹھ نہیں سکی۔

"پتا نہیں ممی ابھی تک کیوں نہیں آئیں۔" میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا، تب اس نے کچھ چونک کر مجھے اپنی نفرتوں کی قید سے آزاد کیا۔ پھر ادھر سے ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"اس گھر میں کون کون رہتا ہے۔"

"بس۔ میرا مطلب ہے اور۔"

"اور کوئی نہیں۔" میرے فوراً ٹوکنے پر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر غالباً پوچھے بغیر رہ نہیں سکا۔

"آپ کے فادر!"

"وہ کینیڈا میں ہیں۔" اور اس سے پہلے کہ وہ مزید ڈیڈی کے بارے میں پوچھتا، میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرا خیال ہے مجھے بھی چلنا چاہیے۔" وہ بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ "آپ اپنی ممی سے کہہ دیجئے گا کہ میں کل پھر آؤں گا۔ اوکے۔"

"جی۔!" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولا۔

"آپ یہ تو جانتی ہی ہیں کہ آپ کی ممی کے پاس لوگ کس کام سے آتے ہیں۔ میں بھی خود اپنے سلسلے میں ان کے پاس آیا ہوں۔ اصل میں کوئی اور ہے نہیں جو میرے بارے میں سوچ سکے، اس لیے میں خود ہی۔"

اس نے خاموش ہو کر کندھے اچکائے تو میں اس کی بات سمجھ کر یوں ہی سر ہلانے لگی۔

"ایک بات اور۔" وہ پھر رکا۔ "ممی سے کہیے گا۔ میرے لیے زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر وہ پسند کریں، تو لڑکی ان کے اپنے گھر میں موجود ہے، اور مجھے پسند بھی ہے۔"

''آ۔'' میرے صرف ہونٹ کھلے۔

''سی یوں۔'' وہ خوبصورت مسکراہٹ میری نذر کرتا ہوا چلا گیا۔ اور میں کتنی دیر تک اسی طرح کھڑی رہ گئی۔

بلاشبہ وہ ایسی مکمل اور بھرپور شخصیت کا مالک تھا۔ کہ اس کی ہمراہی کی خواہش کی جا سکتی تھی۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں میں کچھ ڈر رہی تھی۔ حالانکہ میں نے کل بھی اس کے بارے میں سوچا تھا، اور آج تو وہ جیسے پوری طرح مجھے اپنی گرفت میں لے گیا تھا۔ میں اس کے حوالے سے پلکوں پر خواب سجانا چاہتی تھی۔ بالکل نوعمر لڑکیوں کی طرح جن کی آنکھیں گویا منتظر رہتی ہیں۔ کہیں بادلوں کی اوٹ سے ذرا سا چاند نکل آئے۔ تب بھی وہ یہ سمجھتی ہیں کہ خاص طور سے انہیں جھانک رہا ہے۔ لیکن مسلسل اسے سوچنے کے باوجود میں کوئی خواب نہیں سجا سکی۔ اور خواب تو میں نے نوعمری میں بھی نہیں سجائے تھے۔ شاید اس کی وجہ ڈیڈی تھے۔ جن کے رویے نے نہ صرف مجھے بہت محتاط کر دیا تھا بلکہ میرے اندر ایک انجانا سا خوف بھی جاگزیں ہو گیا تھا۔ گو کہ اب میں اس انداز سے سوچنے لگی تھی۔ کہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے، پھر بھی پتا نہیں کیسے، جب بھی میری بات آتی میرے اندر کا خوف نئے سرے سے انگڑائیاں لینے لگتا تھا۔



ممی تو پہلے روز ہی اس کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔ اور جب اس نے مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا، تو گویا ممی کی دلی مراد بر آئی۔ وہ بے حد خوش تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی تعریفیں۔ پھر اس روز مجھ سے کہنے لگیں۔

''میں نے تمہارے لیے جیسا سوچا تھا۔ وہ بالکل ویسا ہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، اتنا بڑا بزنس اور آگے پیچھے بھی کوئی نہیں ہے، اچھا ہے، ساس نندوں کا کوئی بکھیڑا نہیں ہو گا۔ تم ویسے بھی شروع سے اکیلی رہنے کی عادی ہو۔ اگر اس کی لمبی چوڑی فیملی ہوتی تو تمہارے لیے مسئلہ ہو جاتا۔''

''گویا آپ اس کے حق میں فیصلہ دے چکی ہیں۔''

''ہاں۔!'' ممی اپنی دھن میں بولیں۔ پھر اچانک چونک کر مجھے دیکھنے لگیں۔

''تمہیں کوئی اعتراض ہو تو بتاؤ۔''

''نہیں ممی! آپ کو اختیار ہے، البتہ میں یہ ضرور کہوں گی کہ اس کے بارے میں اچھی طرح جان لیں۔''

''ظاہر ہے، جاننے کے بعد ہی فیصلہ کروں گی۔ ابھی میں نے آصف کو کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا گھر اور بزنس وغیرہ دیکھنے کے بعد ہی اس سے ہامی بھروں گی۔'' پھر میری آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں دیکھ کر کہنے لگیں۔

''تم فکر مت کرو جانو! کم از کم تمہارے لیے کوئی غلطی نہیں کر سکتی، اور نہ ہی کوئی رسک لینے کا سوچ سکتی ہوں۔''

آخر میں انہوں نے میرا گال تھپکا اور میں ہلکے سے مسکرائی۔

ان دنوں مجھے ڈیڈی بہت یاد آنے لگے تھے، میں سوچتی کاش کسی دن وہ اچانک کہیں سے آ جائیں تو میں گزشتہ ساری محرومیاں بھلا کر ایک دم ان کے سینے میں سما جاؤں گی۔ اس تمام عرصے میں مجھے ڈیڈی کی لاتعلقی کو سوچ کر دکھ ضرور ہوتا تھا۔ لیکن میں ان کے لیے اپنے دل میں کدورت نہیں رکھ سکتی۔ مجھے ہمیشہ ان کا انتظار رہا۔ جس میں اب شدت آ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں اس گھر سے رخصت ہونے والی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ بابل مجھے اپنی دعاؤں میں رخصت کرے۔ اس وقت بھی میں اداس سی بیٹھی تھی۔ کہ آصف آ گیا۔ اور گو کہ اسے دیکھ کر میں کھل کر مسکرائی پھر بھی وہ پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''کیا ہوا ہے مجھے؟'' میں نے الٹا اس سے پوچھا۔

''اداس ہو، یا پھر پریشان؟'' وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

''نہیں تو۔''

''مجھ سے مت چھپاؤ۔ میں تمہاری آنکھوں کے سارے رنگ پہچانتا ہوں۔''

''اچھا۔!'' میں نے ہنس کر ٹالنا چاہا۔ لیکن وہ بضد ہو گیا۔

''بتاؤ۔ کیا بات ہے؟''

''میں ڈیڈی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' میں نے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔ ممی کی زبانی وہ ہمارے حالات جان چکا تھا۔ اس لیے فوری کوئی تبصرہ نہیں کیا، پھر خاصی تاخیر سے بولا۔

''جس شخص کو تمہاری پروا نہیں ہے، تم اس کے بارے میں کیوں سوچتی ہو۔''

''وہ میرے ڈیڈی ہیں۔''

''تم بھی تو ان کی اولاد ہو۔ انہیں بھی تمہارا خیال آنا چاہیے۔''

''ہاں لیکن پتا نہیں۔''

''جھوٹے بہلاوے مت دو اپنے آپ کو۔'' وہ فوراً ٹوک کر بولا۔ ''تم سمجھدار ہو اس حقیقت کو دل سے تسلیم کر لو، کہ تمہارے ڈیڈی نئی دنیا بسا کر اس میں مگن ہو چکے ہیں اتنے زیادہ کہ انہیں کبھی بھولے سے بھی تمہارا یا تمہاری ممی کا خیال نہیں آتا ہوگا۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے آزردگی سے کہا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔

''چلو، کہیں باہر چلتے ہیں۔ ہر وقت گھر میں بند رہ کر تم پر اداسیوں کے دورے کچھ زیادہ ہی پڑنے لگے ہیں۔ جب کہ یہ صرف مسکرانے کے دن ہیں، بلکہ کھلکھلا کر ہنسنے کے۔''

''کیوں؟'' میں اسے چھیڑنے کی غرض سے انجان بنی تو اس نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے اپنا رخ موڑنا پڑا۔

''جاؤ۔ جلدی سے تیار ہو کر آؤ۔ میں جب تک آنٹی سے کہہ آتا ہوں، کہ ان کی دختر نیک اختر کو میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر ممی کے آفس کی طرف چلا گیا۔ اور میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

کچھ دیر بعد جب میں تیار ہو کر آئی۔ تو وہ میرے انتظار میں برآمدے میں کھڑا تھا۔

''میں تمہیں اپنے گھر لے جا رہا ہوں گا۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے بتایا۔ ''اصل میں، میں نے گھر کو نئے سرے سے ڈیکوریٹ کروایا ہے، اور میں چاہتا ہوں تم اسے دیکھ لو، اگر تمہیں پسند آئے تو ٹھیک ورنہ پھر جیسے تم کہو گی، اسی حساب سے چینج کر دیں گے۔''

''یہ کام تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔'' میرے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔ اور وہ شوخ ہو کر بولا۔

''بعد میں کب۔؟''

''بہت خراب ہو تم۔'' میں شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ اور جب اس نے اپنے گھر کے سامنے گاڑی روکی' تب بھی اس کی طرف دیکھے بغیر اتر آئی۔

اس کا گھر جسے وہ میرا کہہ رہا تھا۔ واقعی بہت خوبصورت تھا۔ میرے تصور سے کہیں زیادہ حسین، عمدہ ذوق اور بے حد نفاست سے سجا ہوا کہ مجھے سچ مچ اپنے آپ پر رشک آنے لگا۔ کیونکہ وہ اس ساری خوبصورتی کو میرے وجود کی مرہون منت قرار دے رہا تھا۔

''تمہیں اپنا گھر پسند آیا؟'' وہ میرے دمکتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بہت بہت خوبصورت ہے۔''

''ہاں خوبصورت تو ہے۔ لیکن مجھے ابھی اس میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ جب تم آؤ گی۔ تب یہ مکمل ہوگا۔ ابھی تو یہ ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔'' پھر گہری سانس لے کر گرنے گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بہت تنہا رہا ہوں میں۔ اور تم سے ملنے سے پہلے مجھے کبھی اپنی تنہائی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب تو جیسے ہر پل بھاری ہو گیا ہے، سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں طویل مدت تک اس طرح کیسے رہا، بغیر کسی ساتھی وہمنوا کے۔'' میں چپ چاپ اسے دیکھتی گئی۔

''سنو۔!'' وہ سگریٹ سلگاتا ہوا بظاہر سرسری انداز میں بولا۔ ''تم نے پہلے کبھی کسی سے محبت کی ہے۔''

''نہیں۔ میرا مطلب ہے، ممی ڈیڈی کو چھوڑ کر۔''

''کیوں۔؟''

''کبھی کوئی اس طرح زندگی میں آیا ہی نہیں۔'' میں انگلی میں پڑی انگوٹھی سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''کس طرح؟''

''جیسے تم آئے، اچانک بلکہ زبردستی۔'' میں نے ذرا سی پلکیں اٹھائیں۔ وہ پتا نہیں کن نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کہ مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''اب چلو، ممی انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''نہیں، میں ان سے کہہ کر آیا تھا کہ ہم دیر سے آئیں گے۔ بیٹھ جاؤ، ابھی تو میں نے تمہاری کوئی خاطر مدارت بھی نہیں کی۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔ اور خود اٹھ کر کچن کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے پیچھے ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا آ گیا۔ قریب آنے پر میں نے ٹرالی اپنی طرف کھینچ لی، اور چائے بنانے لگی۔

’’چائے بعد میں بنانا، پہلے یہ تو لو۔‘‘ اس نے سموسوں سے بھری پلیٹ اٹھا کر میرے سامنے کی۔

’’نہیں بس رہنے دو۔ میں صرف چائے پیوں گی۔‘‘ میں نے کہا تو اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ پلیٹ واپس رکھ دی، اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

پھر چائے پیتے ہی وہ میرے کہنے سے پہلے کھڑا ہو گیا۔ شاید جانتا تھا کہ اب وہ اصرار بھی کرے گا تو میں نہیں رکوں گی۔

’’او کے۔ ممی سے کہنا، میں کل آؤں گا۔‘‘

وہ مجھے دروازے پر ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ تو میں نے اندر آتے ہوئے ممی کے آفس کی طرف دیکھا۔ وہاں لائٹ جل رہی تھی، میں سمجھ گئی ممی ابھی فارغ نہیں ہوئیں۔ تب میں نے تیز قدموں سے روش پار کی اور جیسے ہی برآمدے میں قدم رکھا۔ ٹیلی فون کی بیل بجنے لگی۔

’’ہیلو۔!‘‘

’’تم زندہ ہو؟‘‘ دوسری طرف عینی تھی، میری آواز سنتے ہی کہنے لگی۔

’’کیوں۔ کیا تم مجھ پر فاتحہ پڑھ چکی ہو؟‘‘

’’مجھ سے ایسی امید مت رکھو۔ میں تو تمہیں مرنے کے بعد بھی نہیں بخشوں گی۔‘‘

’’آخر ہوا کیا؟‘‘

’’شام سے تمہیں رنگ کر رہی ہوں۔ ایمان سے میری انگلیاں دکھ گئی ہیں تمہارا۔ نمبر ڈائل کرتے کرتے، کیا تم گھر پر نہیں تھیں؟‘‘ آخر میں وہ پوچھنے لگی۔

’’نہیں۔ میں ذرا باہر گئی تھی؟‘‘

’’کس کے ساتھ۔‘‘ اس کے شوخ لہجے پر میں سٹپٹا گئی۔

’’کسی کے ساتھ نہیں۔ بس اکیلی۔‘‘

’’چلو یونیورسٹی میں پڑھنے کا یہ فائدہ تو ہوا۔‘‘

’’تم بتاؤ۔ شام سے جو رنگ کر رہی ہو۔ کیا کوئی کام تھا؟‘‘ میں نے اپنی طرف

سے اس کا دھیان ہٹانے کی خاطر پوچھا۔

’’کام تو نہیں۔ تمہیں دعوت دینی ہے۔‘‘

’’کس خوشی میں۔؟‘‘

’’اب پتا نہیں خوشی ہے یا کیا ہے، بہرحال میری شادی ہو رہی ہے۔‘‘

’’کب، کیا بلال باہر سے آ گیا ہے؟‘‘ میں نے اس کے منگیتر کے بارے میں پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘

’’نہیں۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘

’’بھئی، یہ سب کیا دھرا بلال کا ہے، نکاح ٹیلی فون پر دو ماہ پہلے ہو گیا تھا۔ اور پرسوں صبح کی فلائیٹ سے میں اس کی طرف پرواز کر جاؤں گی۔‘‘ اس نے بتایا تو میں زور زور سے ہنسنے لگی۔

’’یہ تم ہنس کس خوشی میں رہی ہو؟‘‘

’’بس یونہی۔‘‘

’’یونہی۔‘‘ وہ چڑ کر بولی۔ ’’بہرحال تم کل صبح سے آ جانا۔‘‘

’’میں بالکل نہیں آؤں گی۔‘‘

’’کیوں۔؟‘‘

’’کیا شادی میں اس طرح بلایا جاتا ہے، یعنی ایک دن پہلے کہہ رہی ہو۔ وہ بھی فون پر۔‘‘

’’اب میں تمہیں کیا بتاؤں، یقین کرو، آج صبح تک یہ فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ کہ آیا کل رخصتی کرنا چاہیے کہ نہیں۔ حالانکہ بلال نے ایک مہینہ پہلے ہی مجھے وہاں بلانے کے سارے انتظام کر لیے تھے۔ آج جب ٹکٹ آ گیا۔ اور وہ بھی اتفاق سے اگلے دن کی تاریخ پر او کے ہو گیا۔ تب یوں سمجھو۔ مجبوراً سب رضامند ہوئے ہیں۔‘‘ اس نے اپنی مجبوری بتائی۔

’’ویسے بلال کو یہ سوجھی کیا۔ جہاں اتنا انتظار کیا، وہاں تین چار مہینے اور۔‘‘

’’یہ تو میں اسی سے جا کر پوچھوں گی۔ تم یہ بتاؤ صبح آ رہی ہو کہ نہیں۔‘‘

’’آ رہی ہوں باب۔ صبح آنکھ کھلتے ہی تمہاری طرف چل پڑوں گی۔ ناشتا بھی

تمہارے ساتھ کروں گی۔"

"اس کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ریسیور رکھ کر لاؤنج میں گئی۔ اور ممی کا انتظار کرنے لگی۔ ممی آج کل آفس کو کچھ زیادہ ہی وقت دینے لگی تھیں۔ پہلے رات آٹھ بجے تک آفس بند کر دیا کرتی تھیں۔ اور اب تو کوئی وقت ہی نہیں تھا۔ ابھی بھی جب میں آصف کے ساتھ آئی تھی۔ تو باہر گیٹ پر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور شاید آصف بھی گاڑیاں دیکھ کر چلا گیا تھا۔ کہ ممی تو مصروف ہوں گی۔

آصف کا خیال آتے ہی میں اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ مجھے وہ تنہا شخص اچھا لگنے لگا تھا۔ اس وقت جب وہ اپنی تنہائی کا ذکر کر رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں سمٹتی اداسیوں نے مجھے آزردہ کر دیا تھا۔ اور اب بھی میں سوچ رہی تھی۔ کاش کوئی تو اس کا اپنا ہوتا۔

"تم کب آئیں۔؟" ممی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کافی دیر ہوگئی مجھے آئے ہوئے۔"

"اچھا۔!" ممی نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔" آصف تو مجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ اسی لیے میں اطمینان سے آئی ہوں۔"

"اصل میں ہم کہیں باہر گئے ہی نہیں، وہ مجھے اپنا گھر دکھانے لے گیا تھا۔

"دیکھ لیا تم نے اس کا گھر؟" ممی پوری طرح میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔

"جی۔"

"اب اگر تم چاہو تو اس کا آفس بھی دیکھ سکتی ہو، اور اگر ضروری سمجھو تو اس کے اسٹاف سے اس کے بارے میں معلوم کر لو کہ وہ کیسا آدمی ہے۔"

"ممی۔!" مجھے حیرت کے ساتھ دکھ بھی ہوا۔

"جب آپ یہ ساری معلومات کر چکی ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے اور میں ایسی کسی نیت سے تو اس کے گھر نہیں گئی تھی۔ وہ مجھے گھر کی نئی سیٹنگ اور ڈیکوریشن دکھانا چاہتا تھا۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں۔"

میری آواز بھرا گئی تو میں خاموش ہوگئی۔ اور ممی کچھ نادم سی ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھیں، پھر میرا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بولیں۔

"میری جان! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ تم خود اپنی تسلی کر لو۔ ہو سکتا ہے، اسے سمجھنے میں مجھ سے کہیں غلطی ہوگئی ہو۔"

"بس کریں ممی! جو کچھ میرے نصیب میں ہے۔ وہ تو ہو کر رہے گا۔"

میری اس بات میں یقیناً آصف جاہ کے لیے نہ صرف پسندیدگی کا اظہار تھا بلکہ یہ بھی کہ ممی جو فیصلہ کر چکی ہیں، وہی ٹھیک ہے۔

"انشاء اللہ۔ تمہارے نصیب میں سکھ ہی سکھ ہوگا۔" ممی نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام کر کہا، پھر میری پیشانی چوم کر بولیں۔

"تم تو جانتی ہوں، میں نے اپنی زندگی میں کتنے دکھ اٹھائے ہیں۔ مرد کے بغیر جس طرح اس گھر کو میں نے زمانے کے سرد و گرم سے بچایا، میں ہی جانتی ہوں، شاید اسی لیے میرا دل ڈرتا ہے۔ گو کہ آصف کے بارے میں میں نے اپنا پورا اطمینان کر لیا ہے، پھر بھی۔"

"چھوڑیں ممی!" میں نے انہیں ٹوک دیا، پھر انہیں عینی کی شادی کے بارے میں بتانے لگی۔

"اس کا مطلب ہے صبح تم وہاں جاؤ گی۔" میری پوری بات سن کر وہ کہنے لگیں۔

"ہاں۔"

"اچھی بات ہے۔ اب جلدی سے کھانا کھا کر سو جاؤ۔" میں سر ہلاتی ہوئی اٹھ کر کچن میں آگئی۔

پھر اگلے دن جب میں عینی کے پاس پہنچی اس کی کزنز اسے مہندی وغیرہ لگا رہی تھیں۔ اس نے اشارے سے مجھے بلا کر اپنے پاس بٹھایا، پھر اپنی کزنز سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہنے لگی۔

"یہ میری جان سے پیاری دوست روبی ہے۔ اور اسے دیکھ کر ہی مجھے "چراغ تلے اندھیرا" کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔

"یعنی اس کی ممی میرج بیورو چلاتی ہیں۔ اور یہ ابھی تک کنواری ہے۔"

"بہت بدتمیز ہو تم۔" میں نے زور سے اس کے بازو میں چٹکی لی۔

"میں نے غلط تو نہیں کہا۔" وہ کراہ کر بولی۔

"بس اب چپ رہو، اگر مزید اس سلسلے میں کچھ کہا تو میں ابھی چلی جاؤں گی۔"

میری دھمکی کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ پھر اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ البتہ اُ[س] کی کزنز خاصی متجسس سی تھیں۔ جب بھی کسی کو موقع ملا، مجھ سے ممی کے بارے میں ضرو[ر] پوچھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ آج کل اپنے بھائی کے لیے لڑکی کی تلاش کر رہی ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ممی سے رجوع کریں گی۔ اب پتا نہیں سب کو بھائیوں کے لیے لڑکیوں کی تلاش تھی یا۔

سارا دن میں عینی کے ساتھ رہی۔

واپسی کا مسئلہ تھا۔ آئی تو میں بس سے تھی اور اب کیونکہ رات ہوگئی تھی۔ اس لیے اکیلے جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ میں نے عینی سے کہا تو وہ بڑے آرام سے بولی۔

"ایسا کرو یہیں رہ جاؤ۔"

"نہیں بھئی، یہ بہت مشکل ہے۔ ممی کبھی بھی اجازت نہیں دیں گی۔"

"ممی سے کہہ کر تو دیکھو، پلیز میری خاطر۔ ویسے بھی اب تو میں جا رہی ہوں۔"

وہ اتنی لجاجت سے بولی کہ میں سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس کے کہنے پر ممی کو فون کیا تو میری آواز سنتے ہی وہ کہنے لگیں۔

"بس بیٹا! میں ابھی تمہیں لینے آ رہی ہوں۔" میں نے آ کر عینی کو بتایا، اور یہ بھی کہا کہ وہ ممی سے بات کر لے، اگر وہ مان گئیں تو ٹھیک ہو نہ میں اُن کے ساتھ چلی جاؤں گی۔

"ویسے تم کتنا عرصہ باہر ہوگی؟" میں نے عینی سے پوچھا۔

"زیادہ عرصہ نہیں رہوں گی، کیونکہ بلال کا وہاں جاب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" پھر کچھ جھجک کر بتانے لگی۔ "اصل میں بلال ہنی مون کے لیے سوئٹزر لینڈ جانا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے یہ سب چکر چلایا ہے کہ میں اس کے پاس چلی جاؤں۔ ایک دو مہینے میں وہ امتحانوں سے فارغ ہو جائے گا۔ تب ہم وہاں سے سوئٹزر لینڈ چلے جائیں گے، اس کے برعکس اگر وہ پہلے یہاں آتا پھر رخصتی ہوتی، اس کے بعد تم جانتی ہو یہاں ویزے وغیرہ کی کتنی پرابلم ہوتی ہے۔ اور بلال کا کہنا ہے کہ یہاں جب تک مجھے ویزا ملے گا تب تک میں

بچے کا باپ بن چکا ہوں گا۔"

میں بے اختیار ہنس پڑی۔

"کہتا تو ٹھیک ہے۔"

"سنو۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔ "اپنی ممی سے کہو اب تمہاری فکر کریں۔ ان کے پاس یقیناً اچھے رشتے موجود ہوں گے، پھر وہ تمہیں نظر انداز کیوں کر رہی ہیں۔ یا تمہارے لیے انہیں آسمانی مخلوق کا انتظار ہے۔"

"نہیں۔" میں نے سوچا اسے آصف کے بارے میں بتاؤں، لیکن اسی وقت ممی آ گئیں، اور آتے ہی مجھے چلنے کے لیے کہا تو میں عینی کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے ممی سے بہت کہا کہ آج کی رات مجھے اس کے پاس رہنے دیں۔ لیکن ممی نہیں مانیں۔ تب میں اس سے مل کر کچھ افسردہ سی ممی کے ساتھ چلی آئی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ ممی میری شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں، حالانکہ آصف کئی بار ان سے کہہ چکا تھا کہ وہ یہ سب نہ کریں۔ اسے کچھ نہیں چاہیے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا تھا کہ سادگی سے نکاح کر دیں۔ وہ ساری کسر ولیمے میں نکال دے گا۔ اور ممی ہنس کر کہتیں۔

"میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے، اسی کا ہے۔ پھر اسے تین کپڑوں میں کیسے رخصت کر سکتی ہوں۔"

اور اس سے روز وہ باقاعدہ مجھ پر جھنجلانے لگا۔

"پلیز، اپنی ممی کو منع کرو، آخر وہ کیوں اتنا تردد کر رہی ہیں۔ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔"

"عجیب آدمی ہو تم۔ لوگ تو باقاعدہ جہیز کی لسٹیں بنا کر بھیجتے ہیں اور تم۔"

"کیا تم مجھے ان لوگوں میں شمار کر رہی ہو۔" وہ تاسف سے بولا۔

نہیں، بلکہ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم ایسے لوگ سے مختلف ہو۔"

"تو پھر اپنی ممی کو سمجھاؤ۔ کہ وہ سادگی سے ہمارا نکاح کر دیں۔ یقین کرو، انہیں بھاگ دوڑ کرتے دیکھ کر مجھے بے حد شرمندگی ہوتی ہے۔ ہاں اگر تمہارے ڈیڈی یہاں ہوتے تب۔"

وہ قصداً خاموش ہو گیا۔ اور میں نے گہری سانس لے کر سر صوفے کی بیک سے لگا لیا۔

"تم شاید اپنے ڈیڈی کو مس کرتی ہو؟" وہ میری کیفیت سمجھ کر بولا۔

"ہاں!" میں نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ "اور پتا ہے آصف! کسی کسی وقت میرا دل چاہتا ہے کہ میں ممی کے علم میں لائے بغیر ڈیڈی کو خط لکھوں۔ ہو سکتا ہے۔ وہ اسی انتظار میں ہوں۔ لیکن پھر مجھے ممی کا خیال آ جاتا ہے، اگر انہیں معلوم ہو گیا تو وہ بہت رنجیدہ ہوں گی۔"

"ہاں، انہیں دکھ ضرور ہوگا۔ بہر حال تم فکر مت کرو۔ شادی کے بعد میں تمہیں سب سے پہلے کینیڈا لے جاؤں گا۔" غالباً اس نے مجھے بہلایا تھا۔

پھر شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی میں آصف کا سامنا کرنے سے گریز کرنے لگی۔ گو کہ ممی نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ بس مجھے خود ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اور اس نے بھی برا نہیں مانا۔ بلکہ جو ممی کا آفس ٹائم تھا۔ اس وقت آنا ہی چھوڑ دیا۔ دن میں کسی وقت ممی کے سامنے آ جاتا تھا۔ اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر واپس چلا جاتا۔ میرے لیے یہ دن جو انتہائی تیز رفتاری سے گزرے تھے۔ میری اب تک کی تمام زندگی پر حاوی تھے۔ مجھے ممی کے تنہا ہو جانے کا خیال بھی تھا۔ لیکن اس سے زیادہ زور آور آصف کی محبت تھی، جس نے اچانک میری بے آب و رنگ زندگی میں پھول کھلا دیے تھے۔ اور جب ممی نے اپنی دعاؤں میں مجھے اس کے سنگ رخصت کیا تو اس وقت مجھے یوں لگا جیسے ہماری راہوں میں بہاروں کے قافلے اترتے چلے آ رہے ہوں۔

آصف کے گھر میں ہمارے استقبال کو کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ حتیٰ کہ کوئی ملازم بھی نہیں۔ حجلہ عروسی میں وہ میرے ساتھ ساتھ داخل ہوا، اور مجھے بیڈ پر بٹھاتے ہی میرے سر سے یوں دوپٹہ کھینچا کہ میں چونک کر دیکھنے لگی۔ عجیب انداز تھا اس کا۔ میرے اتنے بڑے جھلمل کرتے دوپٹے کو بڑی بے دردی سے موڑ کر گولا سا بنا رہا تھا، پھر کمال بے نیازی سے اسے بال کی طرح ایک کونے میں اُچھال کر میری طرف متوجہ ہوا، تو پوچھنے لگا۔

"کیسا لگ رہا ہے؟"

"کیا۔؟" میں سمجھ نہیں سکی، وہ کیا پوچھ رہا ہے کیونکہ میرا سارا دھیان اپنے دوپٹے

کی طرف تھا، جس کے اترتے ہی مجھے اپنا آپ بہت ہلکا لگنے لگا تھا۔

"یہی کہ سر سے چادر چھن جائے تو عورت کتنی بے مایہ ہو جاتی ہے۔ کیا تم اپنے آپ میں عجیب سا محسوس نہیں کر رہیں۔"

"ہاں۔ میں واقعی عجیب سا محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟" میرے پوچھنے پر وہ ذرا سا ہنسا پھر سامنے بیٹھا تو کہنے لگا۔

"یونہی مذاق میں۔"

"لیکن مجھے یہ مذاق اچھا نہیں لگا۔"

"چلو جانے دو، اور فوراً اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ میں تمہارے ہونٹوں پر حسین مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا تو میں گردن موڑ کر اس کونے کی طرف دیکھنے لگی، جہاں اس نے میرا دوپٹہ پھینکا تھا۔

"بھئی، اگر تم یہ چاہ رہی ہو کہ میں پہلے تمہیں وہ بڑا سا دوپٹہ اوڑھاؤں، پھر تمہارا گھونگھٹ اٹھا کر رونمائی پیش کروں تو یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"صاف کہو کہ رونمائی نہیں دینا چاہتے۔" میرے چھیڑنے کے انداز پر مسکرا کر بولا۔

"خیر، اب اتنا بخیل بھی نہیں ہوں، رونمائی میں تمہیں ضرور دوں گا، لیکن صبح۔"

"ابھی کیوں نہیں۔"

"بس، میں نئی روایت ڈال رہا ہوں۔" پھر اٹھ کر ڈریسنگ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "تم اگر کچھ کھانا چاہو تو ابھی بتا دو۔ میں بازار سے لے آؤں گا۔ پھر بعد میں کچھ نہیں ملے گا۔"

"نہیں۔ مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں۔" اس نے پتا نہیں میرا جواب سنا یا نہیں اور میں جیسے انتظار میں تھی۔ وہ جیسے ہی ڈریسنگ روم میں داخل ہوا۔ میں فوراً اٹھ کر اس کے کونے میں آ گئی جہاں میرا دوپٹہ رکھا تھا۔



صبح میں بہت جلدی اٹھنے کی عادی نہیں تھی، لیکن شاید نئی جگہ کے باعث معمول سے پہلے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے احتیاط سے آصف پر نظر ڈالی، اور اسے بے خبر سویا دیکھ

کر بیڈ سے اتر آئی۔ الماری سے کپڑے نکال کر باتھ روم کی طرف جا رہی تھی۔ تب وہ ہلکے سے کھنکارا لیکن میں اس کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ پھر جب میں شاور لے کر نکلی۔ وہ پوری طرح بیدار تو ہو چکا تھا۔ لیکن اسی طرح لیٹا تھا۔ مجھے دیکھ کر تکیہ سیدھا کر کے ذرا سا اونچا ہو بیٹھا، پھر پوچھنے لگا۔

''تم بیڈ ٹی کی عادی تو نہیں ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔''اگر تم پینا چاہو تو میں بنا دیتی ہوں۔''

''تم۔'' وہ یوں بولا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

''کیوں، کیا میں نہیں بنا سکتی؟'' وہ کچھ نہیں بولا۔ ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر اس میں پتا نہیں کیا تلاش کرنے لگا۔ اور مجھے اچانک خیال آیا، تو آئینے کے اندر اسے دیکھ کر بولی۔

''سنو۔ میری رونمائی۔'' ابھی بات میرے ہونٹوں میں تھی کہ کمرے کا دروازہ زور دار آواز کے ساتھ کھلا۔ میں نے فوراً ادھر دیکھا، جانے کون تھی، مجھے نظر انداز کر کے دندناتی ہوئی آصف کے سر پر جا کر تیز لہجے میں بولی۔

''بس آصف! بند کرو یہ ناٹک۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔''

''ناٹک۔'' میں سراسیمہ سی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور آصف سے پوچھا۔

''کون ہے یہ؟''

''میں اس کی بیوی ہوں۔'' آصف کے بجائے اس نے گویا میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا۔ پھر بھی میں نے تصدیق کے لیے آصف کی طرف دیکھا تو وہ بڑے اطمینان سے ایک اجنبی روپ میں میرے مقابل آن کھڑا ہوا۔

''ہاں رباب علی! یہ میری بیوی ہے، میری شریک حیات۔'' کچھ کہنے کے لیے میں نے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ وہ مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔ جو کچھ پوچھنا ہے اپنی ماں سے جا کر پوچھو۔ میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں شیرازی صاحب کا بیٹا ہوں۔ اور تمہاری ماں نے میری بہن کی شادی ایسے شخص سے کرائی تھی، جو پہلے سے شادی شدہ اور بچوں کا باپ تھا۔ یہ بات

تمہاری ماں جانتی تھی، لیکن اس نے ہم سے جھوٹ بولا۔ اس شخص کو کنوارا ظاہر بلکہ ثابت کیا تھا۔''

''تم۔'' اپنی ساری توانائیاں صرف کرنے کے باوجود میں اسی قدر کہہ سکی، تو اس کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس نے پل میں اس کے چہرے کو گرفت میں لے کر شیطانی روپ دے دیا تھا۔

''جتنی چاہے گالیاں دے لو، میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔ کیونکہ میری بہن نے بھی اس شخص کی حقیقت کھلنے پر اسے گالیاں ہی دی تھیں۔'' پھر ساتھ کھڑی لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''چلو ہنی! چلتے ہیں۔''

''تم بھول رہے ہو آصی! یہ ہمارا گھر ہے، ہمیں کہیں نہیں جانا۔ اسے یہاں سے نکالو۔'' وہ یوں بولی جیسے میں کوئی فالتو سامان ہوں، اٹھا کر باہر پھینک دو۔

''نہیں۔'' میرا سر آہستہ آہستہ نفی میں ہلنے لگا۔

''دیکھو بی بی!'' وہ انتہائی نخوت سے مجھے مخاطب کر کے بولی۔''اب یہاں فلمی ڈائیلاگ وغیرہ بولنے کی کوشش مت کرنا کہ مجھے مت نکالو۔ یہیں پڑا رہنے دو، میں تمہاری باندی بن کے رہوں گی وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ مجھ پر یا آصف پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا، کیوں آصف؟''

آخر میں اس نے آصف کی طرف دیکھا۔ اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

''یہاں واویلا مچانے کی ضرورت نہیں۔ اپنی ماں کے سامنے جا کر رونا دھونا، تاکہ اسے بھی احساس ہو۔'' پھر آصف کو مخاطب کر کے بولی۔

''او کے آصی! میں ناشتا بنانے جا رہی ہوں تم جب تک اسے فارغ کرو۔ بلکہ ڈرائیور سے کہو، اسے چھوڑ آئے گا۔ اور ہاں اسے رونمائی دینا مت بھولنا۔''

وہ جاتے جاتے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔ مجھے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ تو میں نے بے حد تاسف اور بے یقینی سے اس شخص کو دیکھا، جس نے میری زندگی کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ وہ ذرا بھی نادم نہیں تھا۔ بس میری حالت کے پیش نظر

سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے تم سے کوئی عداوت نہیں تھی رباب علی، یہ سزا تمہاری ماں کے لیے ہے۔ یہ لو طلاق نامہ۔ میں تمہیں آزاد کر رہا ہوں۔"

اس نے خود ہی میرا ہاتھ اوپر اٹھا کر اس پر سفید رنگ کا لفافہ رکھ دیا۔ تو لاکھ ضبط کے باوجود میری آنکھوں کا لبریز پیمانہ چھلک گیا۔ اور وہ میرے آنسو دیکھنے کے لیے رکا نہیں، اپنی بیوی کے پیچھے نکل گیا۔ تو میں جو اتنی دیر سے پتھر کی مورت بنی کھڑی تھی۔ ایک دم پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ میرے لیے دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔

"سر سے چادر چھن جائے تو عورت کتنی بے مایہ ہو جاتی ہے۔"

رات پہلے مرحلے پر ہی اس نے میرے سر سے چادر کھینچ کر مجھے بے مایہ کیا تھا، اور اب سائبان چھین کر کتنا بے وقعت کر گیا تھا، پھر بھی کہہ رہا تھا۔ "یہ سزا تمہاری ماں کے لیے ہے۔"

کوئی ہے جو اس سے پوچھے کہ ماں کو سزا دینے کے لیے اس نے طلاق کا داغ میری پیشانی پر کیوں سجایا۔ دل کی بستی میری اجاڑی اور کہتا ہے۔ یہ سزا ماں کے لیے ہے۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہ رہی تھی۔ لیکن اس پرائے گھر میں کون تھا جو میرے آنسوؤں پر بند باندھتا۔ بمشکل تمام میں اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی اس کھلے دروازے سے نکل آئی۔ گاڑی کے پاس ڈرائیور جیسے میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔

تمام راستہ میرے آنسو ایک پل کے لیے بھی نہیں رکے تھے، اور میں نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن گھر کے سامنے اترتے ہی میں نے نہ صرف آنکھیں اور چہرا صاف کیا بلکہ انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے ممی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ارے!" ممی نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

"ابھی میں تمہیں فون کرنے کا سوچ رہی تھی۔"

"میں خود آ گئی ہوں۔" میں بے تاثر لہجے میں بولی۔

"اور آصف؟" وہ میرے پیچھے نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"کون آصف؟" میرے اندر کا دکھ تلخی کی صورت میں میرے ہونٹوں پر سمٹ آیا۔ تو ممی چونک کر میری طرف دیکھنے لگیں۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" میری آنکھوں کی سرخی شاید انہیں اب نظر آئی تھی۔ "تم رو رہی ہو؟"

"ہاں۔!" میرے آنسو پھر تواتر سے بہہ نکلے۔ "یہ آنسو میری جھولی میں آپ نے ڈالے ہیں ممی! آپ بیگم شیرازی کو دھوکا دیتے ہوئے یہ بھول گئی تھیں کہ آپ کے اپنے گھر میں بھی بیٹی ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"آصف۔ بیگم شیرازی کا بیٹا ہے۔ اس نے ہم سے جھوٹ بولا تھا کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔ سب ہیں اس کے، بیوی بھی ہے، اور اس نے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے مجھے ایک رات کی دلہن بنایا۔ اور اب یہ طلاق نامہ دے کر۔"

"روبی۔" ممی ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں، تو میں نے ہاتھ میں پکڑا لفافہ ان کی طرف اچھال دیا، اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی اور دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔

یہ میں تھی رباب علی، جس کی آنکھوں میں شب زفاف کے حسین لمحات کے بجائے ساون بھادوں کی جھڑی لگی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں گزری رات کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔ بس اپنے لٹ جانے کا دکھ جو ہر بات پر حاوی ہو گیا تھا۔ مجھے شدت سے رلائے جا رہا تھا۔ ممی وقفے وقفے سے دروازہ پیٹ کر مجھے پکارتی رہیں، لیکن میں نے نہ کوئی جواب دیا، اور نہ ہی دروازہ کھولا۔ دوپہر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد شاید وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہی تھیں، ادھر میں نے بھی اپنے دکھتے سر کو تکیوں میں چھپایا تو بوجھل آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

جس وقت میری آنکھ کھلی کمرا مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ اور اتنا اندھیرا کیوں ہے۔ رفتہ رفتہ ذہن بیدار ہوا تو ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ دل میں اٹھتے درد سے بے چین ہو کر میں نے اندھیرے ہی میں دروازے کے اس پار دیکھنا چاہا۔ لیکن کسی روزن سے روشنی کی ہلکی سی کرن بھی نظر نہیں آئی۔ تب میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ پہلا خیال ممی کا آیا۔ کہیں وہ آصف کی طرف نہ چلی گئی ہوں، ان سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اپنی زیادتی بھلا کر اس کی زیادتی کا حساب لینے پہنچ جاتیں۔

میں نے احتیاط سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ تو لابی اور اس سے آگے لاؤنج

میں بھی اندھیرا تھا۔ میں ساری لائٹس جلاتی ہوئی ممی کے کمرے کی طرف آئی تو ان کا درواز بند تھا۔ پہلے دستک دی اور کوئی جواب نہ پا کر ہینڈل پر ہاتھ رکھا، تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ عجیب پراسرار ماحول لگ رہا تھا۔

''ممی!'' میں نے انہیں پکارا، پھر بڑھ کر لائٹ آن کی تو ان پر نظر پڑتے ہی میری چیخ نکل گئی۔ وہ بیڈ پر اوندھی یوں لیٹی تھیں کہ ان کا ایک بازو نیچے جھول رہا تھا۔

''ممی!'' انہیں سیدھا تکیے پر لٹاتے ہوئے میں مسلسل انہیں پکارتی رہی۔ لیکن وہ میری ہر پکار سے بہت دور جا چکی تھیں۔



ابھی تو میں اپنے ساتھ ہونے والے المیے کا ماتم نہیں کر پائی تھی کہ ممی بھی چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں ایک دم سے تنہا ہو گئی۔ عزیز رشتہ داروں نے اپنا فرض نبھایا تھا۔ کسی نے بھی جھوٹے منہ مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا۔ اور مجھے اس کا گلہ بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے جب میرے باپ کو میرا خیال نہیں تھا، تو کوئی دوسرا کیوں خیال کرتا۔ میری حالت اگر دیوانوں کی سی تھی تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ کوئی غم بانٹنے والا بھی تو نہیں تھا۔ نہ ہی دھیان بٹانے کو کوئی مصروفیت تھی۔ ایک جگہ بیٹھتی تو گھنٹوں بیٹھی رہتی۔ سوتی تو اٹھنا بھول جاتی۔ دو دو دن بغیر کھائے پیئے گزار دیتی۔ میری فرزانگی کا یہ عالم تھا کہ میں دیواروں سے باتیں کرنے لگی تھی۔

''پتا ہے۔ اس رات کیا ہوا تھا۔ اس نے میرے سر سے دوپٹہ کھینچ لیا۔ اور اس رات کی سحر ہوئی تو میرے سر پر چھت بھی نہیں رہی۔''

''اور پتا ہے ممی کیوں چلی گئیں۔ وہ میرا سامنا نہیں کر سکتی تھیں اس لیے۔'' اور یوں ہی دیواروں سے احوال کہتے کہتے میں اپنی پہچان کھو بیٹھی۔



پتا نہیں اس کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ اور پتا نہیں وہ کچھ سوچتی بھی تھی یا نہیں۔ بس ایک دوپٹہ ہاتھوں میں ہوتا۔ جس میں مسلسل گرہیں باندھتی جاتی۔ اور جب آخری سرے تک پہنچ جاتی۔ پھر انہیں کھولنے کا عمل شروع ہو جاتا۔ سارا دن اسی طرح گزر جاتا۔ اکتاتی بھی نہیں تھی۔ بلکہ یوں لگتا تھا جیسے کسی بہت اہم کام میں مصروف ہو۔ کسی وقت آس پڑوس سے

کوئی خاتون آ جاتیں تو دیکھتے ہی پہلے دوپٹے کو گود میں چھپاتی، پھر گھٹنوں کے گرد دونوں بازو لپیٹ کر بیٹھ جاتی۔

''کیا کر رہی تھیں؟'' آنے والی خاتون ہمدردی سے پوچھتیں، وہ خاموش رہتی۔

''تم نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔؟'' جواب ندارد۔

''دیکھو کتنی میلی ہو رہی ہو، جاؤ جا کر نہا لو۔'' وہ خوفزدہ ہو کر زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگتی۔

''ڈرو مت، چلو مجھے دکھاؤ۔ تم نے اپنی گود میں کیا چھپایا ہے۔'' بیچاری خاتون اپنے طور پر اسے بہلانے کی کوشش کرتی۔ لیکن وہ چیخ پڑتی۔

''نہیں خبردار میرے دوپٹے کو ہاتھ مت لگانا۔'' اور ایک بار اسی طرح وہ ایک خاتون پر جھپٹ پڑی تھی۔ جس کی وجہ سے سب نے اس کے پاس آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

اس وقت بھی وہ دوپٹے میں گرہیں لگانے میں مصروف تھی کہ عینی آ گئی۔ بلال بھی اس کے ساتھ تھا۔ اور کیونکہ وہ اس کے حالات سے یکسر لاعلم تھی۔ اس لیے دبے پاؤں آ کر پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ چیخ پڑی۔

''کون ہے؟''

''ارے۔!'' عینی کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اس کے سامنے آ گئی۔ ''تم تو یوں چیخی ہو، جیسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''کون ہو تم۔؟'' وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر اپنے آپ میں سمٹتی ہوئی پوچھنے لگی۔

''کیا مطلب۔ اب مجھے اپنا تعارف کروانا پڑے گا۔''

عینی سمجھی، وہ مذاق کر رہی ہے۔ پھر پلٹ کر بلال سے بولی۔

''بلال یہی ہے روبی!۔ میں نے تم سے کہا تھا ناں، کہ مجھ سے بہت خفا ہو گی، تو اب دیکھو، یہ مجھے پہچاننے سے انکار کر رہی ہے۔''

''السلام علیکم!'' بلال نے آگے بڑھ کر پہلے سلام کیا پھر کہنے لگا۔ ''بھئی، عینی نے آپ کے بارے میں اتنا کچھ بتایا ہے کہ اگر میں کہیں راستے میں بھی آپ کو دیکھتا تو فوراً پہچان لیتا۔'' اس نے اجنبی نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا۔ پھر گود میں سے دوپٹہ نکال

کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

''روبی۔!'' عینی غالباً اس کے ہاتھوں سے دوپٹہ چھیننے یا اسے جھنجھوڑنے کی غرض سے خاصی جھنجھلا کر اس کی طرف بڑھنا چاہتی تھی کہ بلال نے اس کا بازو پکڑ کر روک دیا۔ وہ سائیکالوجسٹ تھا۔ اس لیے پہلے ہی مرحلے پر چونک گیا تھا۔ جبکہ عینی کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہنے لگی۔

''دیکھو، اسے کتنی انجان بن رہی ہے۔'' بلال نے اسے خاموش رہنے کا اشارا کیا پھر ایک طرف لے جا کر آہستہ آواز میں بولا۔

''تمہاری دوست ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے اس کا ذہنی توازن۔''

''بس کرو بلال!'' اس نے فوراً ٹوک دیا۔ ''ہر وقت مریضوں میں رہ رہ کر، تمہیں ہر کوئی پاگل نظر آنے لگا ہے۔ ٹھہرو، میں اس کی ممی کو بلاتی ہوں۔''

وہ بھاگتی ہوئی اس طرف چلی گئی، جہاں اس کی ممی کا آفس تھا۔ جب کہ بلال وہیں کھڑا رہ کر بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔ دوپٹے میں گرہیں لگاتے ہوئے کسی وقت لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر ابھرتا لیکن پھر فوراً ہی کرب کے آثار نمایاں ہو جاتے تھے۔

''وہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' عینی نے واپس آ کر کہا۔ تو بلال اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''میں غلط نہیں کہہ رہا عینی! میری بات سمجھو۔ تمہاری دوست کسی طرح بھی نارمل نہیں لگ رہی۔''

''لیکن یہ ایسی کیوں ہوگئی ہے؟ پتہ نہیں۔ اس کی ممی کہاں چلی گئیں؟'' عینی کچھ پریشان سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''تم اس سے معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ جاؤ، اس کے پاس بیٹھ کر نرمی سے بات کرو۔'' عینی کچھ الجھی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی، کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر پکار کر بولی۔

''روبی! روبی۔! میری بات سنو۔'' اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ مسلسل اپنے کام میں مصروف رہی، اور جب آخری گرہ لگا چکی تو دوپٹہ جو زنجیر کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اسے اوپر اٹھا کر لہراتے ہوئے بولی۔

''دیکھو، میں نے اسے مضبوطی سے باندھا دیا ہے، اب کوئی اسے نہیں کھینچ سکتا۔''

''ارے!'' بلال اس کی بات میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو واقعی بہت مضبوط ہو گیا ہے، لاؤ مجھے دکھاؤ تو۔''

''نہیں۔'' اس نے فوراً ہاتھ نیچے کر لیا۔ اور اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''کون ہو تم؟''

''سنو۔ تمہاری ممی کہاں ہیں؟'' عینی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''ممی مر گئیں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ہاتھوں میں چہرا چھپا کر سسکنے لگی۔ پھر خاصی تاخیر سے ہاتھ نیچے کیے، تو رازداری سے بولی۔ ''پتا ہے ممی کیوں چلی گئیں، اس لیے کہ وہ میرا سامنا نہیں کر سکتی تھیں۔''

''بلال۔!'' ضبط کرتے کرتے بھی عینی رو پڑی۔

''شاید تنہائی نے اسے پاگل کر دیا ہے، پلیز کچھ کرو۔ اسے ٹھیک ہونا چاہیے۔''

''حوصلہ رکھو عینی! یہ ٹھیک ہو جائے گی، لیکن۔'' وہ خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''لیکن کیا۔؟''

''میرا مطلب ہے، یہاں رہ کر ذرا مشکل ہے، اسے کلینک میں ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔''

''کلینک میں نہیں بلال! ہم اسے اپنے ساتھ گھر لے چلتے ہیں۔''

''گھر۔'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''ہاں، گھر میں ٹھیک ہے، میرے ساتھ رہے گی تو ہو سکتا ہے، جلد اپنے آپ کو پہچاننے لگے۔''

''سوچ لو، تمہارے لیے پرابلم بھی بن سکتی ہے۔''

''نہیں بنے گی، اگر بنی تو پھر اسے کلینک لے جانا۔''

''اچھی بات ہے، تم اسے چلنے پر آمادہ کرو۔''

بلال نے جیسے ہی رضامندی ظاہر کی۔ عینی اٹھ کر پہلے اس کے کمرے میں گئی۔ الماری میں سے بیگ نکال کر اس کے کچھ کپڑے وغیرہ رکھے، پھر واپس آ کر اس سے بولی۔

''چلو روبی! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔''

عینی نے اس انداز سے کہا تھا جیسے وہ خود بھی عرصے سے یہیں رہتی آ رہی ہو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

''اٹھوں ناں لیکن ٹھہرو، پہلے میں کمرے لاک کر دوں۔'' عینی نے بیگ وہیں پھر سب کمرے لاک کر کے اس کے پاس آئی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

''کون ہو تم؟'' وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''میں تمہاری دوست ہوں۔ باقی تفصیل گھر جا کر بتاؤں گی۔'' عینی اسے مزاحمت کرنے کا موقع دیے بغیر تقریباً کھینچتے ہوئے باہر لے آئی۔



اسے عینی کے گھر آئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اور غالباً ا احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی گھر میں نہیں ہے۔ سارا دن کمرے میں بیٹھی رہتی، نہ آہٹوں چونکتی نہ پکارنے پر دیکھتی، جب کہ عینی مسلسل کوشش میں لگی ہوئی تھی، کہ کسی طرح وہ بو باتیں کرے، بہت اصرار پر بولتی بھی تو کوئی ایسی بات جو عینی کے سر سے گزر جاتی۔ ابھی بلال نے اس کے علاج کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کی تھی۔ اور اسے عینی ہی نے منع تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بلال پہلے ہی مرحلے پر اسے الیکٹرک شاک لگانے کی بات کر گا۔ اور کیونکہ ایک بار عینی نے اس کے کلینک میں ایک مریض کو شاک لگانے کا منظر ا آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور وہ کچھ اتنی خوفزدہ سی ہو گئی تھی کہ اب روبی کے لیے ایسا تصور اسے دہلا دیتا تھا۔

''اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے عینی! اس روز بلال نے اسے سمجھانا چاہا۔

''ہم اسے بہت معمول شاک لگائیں گے، اس کے بعد کم از کم اتنا تو ہوگا کہ یہ صرف اپنے آپ کو بلکہ۔ تمہیں اور۔ اور بہت سارے لوگوں کو پہچاننے لگے گی۔''

وہ تو ٹھیک ہے، لیکن پلیز ابھی نہیں۔ کچھ دن اور رک جاؤ۔'' وہ منت سے بولی۔

''لیکن کیوں؟''

''میں کوشش کر تو رہی ہوں شاید اسی طرح۔''

''اب تک جو کوششیں کی ہیں ان کا کیا نتیجہ نکلا ہے؟ بہر حال، میں تمہیں چند دل دیتا ہوں۔ اس کے بعد اگر تم نے اس کا علاج کرانا ہے۔ تو ٹھیک ورنہ پھر اسے اس کے گھ

بچ دینا۔'' وہ حتمی انداز میں کہتا ہوا اٹھ کر چلا گیا، تو وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ئے اس کے پاس آ بیٹھی۔

''روبی! مجھے بتاؤ۔ تم کیا سوچتی ہو؟''

''میں۔'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ہاں تم۔ اچھا یہ بتاؤ تم دوپٹے میں گرہ کیوں لگا رہی ہو؟''

پتا نہیں۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''چلو چھوڑو یہ دوپٹہ۔ میرے ساتھ آؤ۔''

''کہاں؟''

''کچن میں۔ ہم دونوں مل کر کھانا پکائیں گے، تمہیں آتا ہے ناں کھانا پکانا۔''

''ہاں۔!'' اس کے اعتراف پر عینی نے خوشی کا اظہار کیا، اور اسے لے کر کچن میں ئی۔ پھر تسلے میں چاول نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

''تم یہ چاول پکا دو۔ میں سالن پکا لیتی ہوں۔ ٹھیک ہے ناں۔'' اس نے اثبات سر ہلایا، پھر سادگی سے پوچھنے لگی۔

''سنو۔ تم کون ہو؟''

''میں عینی ہوں۔'' اب کے اس نے دوست نہیں کہا۔

''اور وہ جو ابھی تمہارے ساتھ بیٹھا تھا؟''

''وہ بلال ہے، میرا شوہر۔'' وہ پرسوچ انداز میں سر ہلا کر چاول چننے میں لگ گئی۔

ئی کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

''تم نے اپنے بارے میں نہیں پوچھا؟''

''میں۔'' اس نے چونک کر دیکھا تو سر چکرانے لگا۔ یکا یک آنکھوں کے آگے ی چھا گئی۔ جلدی سے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر جھٹکے دینے لگی۔

''کیا ہوا ہے۔؟'' عینی نے فوراً بڑھ کر اسے تھام لیا۔ اور اسی طرح سہارا دیے ئے اندر لے آئی۔ پھر بیڈ پر لٹاتے ہوئے بولی۔

''تم بہت کمزور ہو۔ ٹھہرو میں بلال سے کہتی ہوں۔ وہ تمہارے لیے کوئی ٹانک لکھ گا۔'' عینی اسے چادر اوڑھا کر کمرے سے نکل گئی۔ جب اس نے بلال کو اس کے بارے

میں بتایا تو وہ خود اسے چیک کرنے چلا آیا۔ اور جب اس کا چیک اپ کرنے کے بعد سید
کھڑا ہوا تو بے حد خاموش نظروں سے عینی کو دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ اس کی خاموش نظروں سے گھبرا کر تشویش سے پوچھنے لگی۔

''تمہاری دوست ماں بننے والی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

''کیا۔؟''

''ہاں۔ اس کے پیٹ میں چار ماہ کا بچہ ہے۔'' وہ کچھ مشکوک سے انداز میں …
ہوا کمرے سے نکل گیا۔ تو عینی ایک نظر اس پر ڈال کر بلال کے پیچھے بھاگی چلی آئی۔

''سنو بلال!''

''دیکھو عینی۔!'' وہ پلٹ کر قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے گھر میں یہ …
برداشت نہیں کر سکتا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب اپنے دوست سے پوچھو، مجھے تو لگتا ہے اس نے محض ڈھونگ رچایا
ہے۔ اپنی سیاہ کاریوں کو چھپانے کی خاطر ہمیں۔''

''خدا کے لیے بلال ایسی باتیں مت کرو۔'' وہ رونے لگی۔ ''روبی ایسی لڑکی ن…
ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''تو جا کر پوچھو اس سے کہ وہ کس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔'' اس کے …
ہی وہ پورچ کی طرف بڑھ گیا۔ عینی نے اسے گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا، پھر بو…
قدموں سے دوبارہ روبی کے کمرے میں آئی، تو وہ اسی طرح لیٹی تھی۔

''اب میں اس سے کیا پوچھوں؟'' اس نے بے بسی سے سوچا اور وہیں سے …
آئی تو اچانک صائمہ کا خیال آیا جو ان دونوں کی مشترکہ دوست تھی۔ فوراً لابی میں آ کر
کے نمبر ڈائل کرنے لگی، دوسری طرف صائمہ کی امی تھیں۔ اس نے فوراً ان سے صائمہ
بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ دو ماہ پہلے شادی ہو کر دوبئی چلی گئی ہے۔ وہ ما…
ہوئی، لیکن پھر ان سے ہی پوچھنے لگی۔

''آنٹی! وہ ہماری دوست روبی تھی؟''

''ہاں، تقریباً چار ماہ پہلے اس کی ممی کا انتقال ہو گیا۔'' انہوں نے بتایا کہ وہ ا…

بن کر بولی۔

''اوہو۔ کیا ہوا تھا انہیں۔؟''

''پتا نہیں۔ غالباً ہارٹ اٹیک۔ نہیں بلکہ ان کے دماغ کی کوئی نس اچانک پھٹ گئی
تھی۔ بہت اچھی خاتون تھیں۔''

''جی، اور وہ روبی، میرا مطلب ہے، اس کی شادی ہو گئی تھی کیا؟'' وہ اصل بات
کی طرف آ گئی۔

''پتا نہیں۔ شاید ہو گئی ہو۔''

''شاید۔'' اس نے سوچا اور الوداعی کلمات کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ وہ اچانک نہ
صرف پریشان ہو گئی تھی۔ بلکہ الجھ بھی رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا روبی کے بارے میں کس
سے معلوم کرے۔ بلال کی طرف سے بھی فکر مند تھی۔ کیونکہ وہ مرد تھا پہلے مرحلے پر ہی اس
نے غلط انداز سے سوچا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اگر وہ روبی کا شادی شدہ ہونا ثابت نہ کر سکی، تو
وہ اسے گھر سے نکالنے میں دیر نہیں کرے گا۔ جب کہ وہ روبی کو اس طرح حالات کے رحم و
کرم پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ سارا دن اسی طرح پریشانی کے عالم میں گزر گیا۔

بلال کے آنے کا وقت ہو رہا تھا، اور وہ اندر ہی اندر سہمی جا رہی تھی کہ وہ آتے ہی
روبی کی بابت سوال پر سوال کرے گا۔ اور فی الحال اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہ تھا۔
اس نے دیکھا، روبی لاؤنج میں صوفے پر اپنے مخصوص انداز میں دونوں پیر اوپر رکھ کر اسی
دوپٹے میں مشغول تھی۔

''سنو روبی! تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔''

اس نے محض اس خیال سے کہا کہ آتے ہی بلال اسے نہ دیکھے۔ لیکن وہ وہاں سے
اٹھنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ اسی وقت بلال کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو ذرا دیر کو ادھر متوجہ ہوئی،
پھر اسے جھنجھوڑ کر بولی۔ ''تم اپنے کمرے میں جاؤ۔''

''کیوں۔؟'' اس کے اطمینان سے پوچھنے پر وہ خود ہی بھاگ کر کچن میں چلی گئی۔
اور بظاہر کھانا گرم کرنے میں مصروف لیکن سارا دھیان باہر کی طرف تھا۔ اس کا خیال تھا، بلال
وہیں سے پکارتا ہوا آئے گا، اور آتے ہی روبی سے متعلق سوال کرے گا۔ لیکن فوری طور پر یہ
بات یوں ٹل گئی کہ بلال کا کوئی دوست اس کے ساتھ تھا۔ اور وہ اسے لے کر سیدھا ڈرائنگ

روم میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر اس کے پاس آ کر بولا۔

”سنو۔ ابھی اچانک ایک بہت پرانے دوست سے ملاقات ہوگئی۔ میں اسے ساتھ لے آیا ہوں، کھانا تیار ہے ناں۔؟“

”ہاں۔“

”چلو، جلدی سے کھانا لگا کر آؤ۔ میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔“

وہ اپنی بات کہہ کر دوبارہ اندر چلا گیا۔ تو وہ جلدی جلدی کھانا نکال کر ٹیبل پر رکھنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم کی طرف آئی، اور ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا تو بلال نے اندر بلا لیا۔

”یہ آصف ہے میرے کالج کے زمانے کا دوست۔ بلال نے تعارف کرایا، تو وہ سلام کرنے کے بعد کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے۔ باقی باتیں کھانے کی ٹیبل پر ہی کر لیں گے۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ چلو آصف۔“ بلال کھڑا ہوا تو آصف نے بھی اس کی تقلید کی۔

پھر ڈرائنگ روم سے نکل کر لاؤنج میں قدم رکھتے ہی آصف کی نظر اس پر پڑی جو ہر طرف سے بے نیاز دوپٹے کی گرہیں کھولنے میں مصروف تھی۔ آصف کا چونکنا اور ٹھٹھک کر رکنا فطری عمل تھا۔

”ڈرو مت۔ کچھ نہیں کہے گی۔“ بلال کے انداز پر عینی کٹ کر رہ گئی۔ جب کہ آصف سٹپٹا کر بولا۔

”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے، یہ پاگل نہیں ہے بلکہ دیوانگی کا ڈھونگ رچا کر ہم سب کو بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”چلو بلال! کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ عینی نے مداخلت کی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بلال روبی کے بارے میں اس طرح کی مزید کوئی بات کرے۔

”اپنی دوست سے کہو، اگر پسند کرے تو ہمارے ساتھ کھانا کھا لے۔“

اسی وقت آخری گرہ کھول کر اس نے سر اونچا کیا اور باری باری سب کو دیکھنے لگی۔ آصف کو دیکھ کر بھی اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا اور آصف جسے یہ خیال پریشان کر رہا

تھا کہ اسے دیکھتے ہی وہ اور کچھ نہیں تو چونکے گی ضرور۔ اس کے انداز میں مکمل اجنبیت دیکھ کر اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”کون ہیں یہ۔؟“

”میری دوست۔“ عینی اس قدر کہہ کر ڈائننگ روم کی طرف چل پڑی۔ تو بلال بھی آصف کو لے کر اس کے پیچھے آ گیا۔ پھر کھانے کے دوران بلال اسے آصف کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ بھی بظاہر اس کی باتوں میں دلچسپی لیتی رہی۔ کسی کسی وقت خود بھی آصف سے کوئی سوال کر لیتی۔ اور اس کے بارے میں یہ جان کر کہ وہ شادی شدہ ہے کہنے لگی۔

”اپنی مسز کو بھی لے آتے۔“

”اصل میں بلال سے راستے میں ملاقات ہوئی تھی، اور یہ وہیں سے مجھے گھسیٹ لایا۔ پھر کسی دن اسے لے آؤں گا۔“

”ضرور۔“ پھر ان دونوں کو ہاتھ صاف کرتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ”آپ لوگ چائے کہاں پئیں گے۔؟“

”لاؤنج میں لے آؤ۔“ بلال یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تو وہ سر ہلاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد چائے لے کر لاؤنج میں آئی تو بلال غالباً روبی کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اصل میں یہ ماں بننے والی ہے، اس لیے میں۔“ پتہ نہیں اسے آتے دیکھ کر اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی تھی، یا یونہی خاموش ہوا تھا۔ بہر حال اسے بڑا عجیب سا لگا۔ ٹرے ٹیبل پر رکھتی ہوئی بولی۔

”ماں بننا جرم نہیں ہے بلال! بلکہ اعزاز ہے جو ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا۔“

”ہاں لیکن۔“

”پلیز۔“ اس نے فوراً ٹوک دیا۔ ”خود سے کوئی بات فرض مت کرو۔ میں روبی کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سوچ سکتی۔ کیونکہ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔“ پھر دونوں کے سامنے چائے کے کپ رکھ کر پلٹ کر روبی کے پاس جا بیٹھی۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھنے لگی۔

”روبی! تمہاری شادی ہوگئی؟“

''شادی۔'' وہ پرسوچ انداز میں دیکھنے لگی۔

''ہاں بتاؤ۔ کس کے ساتھ ہوئی تھی تمہاری شادی؟'' اچانک اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سمٹ آئیں اور کچھ رازداری سے بولی۔

''پتا ہے۔ اس رات کیا ہوا تھا؟''

''کیا ہوا تھا؟'' عینی نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

''اس نے آتے ہی میرے سر سے دوپٹہ کھینچ لیا تھا۔'' اس کے ساتھ وہ ہاتھوں میں چہرا چھپا کر سسکنے لگی۔ اور آصف جاہ جو اب تک اطمینان سے تھا۔ اچانک سناٹوں کے حصار میں مقید ہوگیا۔ بالکل غیرارادی طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے آبیٹھا۔ تو اس کی سسکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اس نے کہا تھا۔ یہ سزا می کے لیے ہے، لیکن می تو چلی گئیں۔''

''اس سے پوچھو۔'' قدرے اونچی آواز میں بلال کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کہ آصف نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ پھر اٹھ کر دوبارہ پہلے والی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تم تو ڈاکٹر ہو بلال! اور اچھی طرح جانتے ہو گے کہ ایسے مریضوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے اور پھر یہ تو عینی بھابھی کی دوست بھی ہیں۔''

بلال نے گہری سانس لی، پھر کرسی کی بیک سے سر ٹکا کر بغور اسے دیکھنے لگا۔ اس کی سسکیاں دم توڑ چکی تھیں، اور اب وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ رہی تھی۔ عینی نے کچھ دیر سوچا، پھر اٹھ کر بلال کے پاس آتے ہوئے بولی۔

''سنو بلال! تم اسے اپنے کلینک شفٹ کر دو اور جو تم اسے شاک لگانے کی بات کر رہے تھے۔''

''نہیں، اب ایسی حالت میں اسے شاک لگانا ممکن نہیں ہے۔'' وہ اس کی پوری بات سنے بغیر بولا۔ ''بہتر ہے، تم اس کے کسی عزیز رشتہ دار کا پتا کرو، اور اسے وہیں بھیج دو۔''

''ان کے گھر والے کہاں ہیں؟'' آصف چونکا، اور انجان بن کر پوچھنے لگا۔

''میرا مطلب ہے ان کے والدین وغیرہ۔''

''بس اس کی می تھیں، ان کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔'' عینی اس کے بارے میں بتا کر کہنے لگی۔ ''شاید آپ جانتے ہوں مسز شاہین، ان کا میرج بیورو خاصا مشہور تھا۔''

''تو کیا یہ مسز شاہین کی بیٹی ہیں۔'' آصف سوچ کر بولا۔

''ہاں، کیا آپ جانتے ہیں انہیں۔؟''

''بہت اچھی طرح، کیونکہ میری بہن کی شادی انہی کے توسط سے ہوئی تھی۔ اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ میں نے آپ کی دوست کی شادی میں بھی شرکت کی تھی۔''

''اچھا۔ یہ کب کی بات ہے؟'' عینی اچانک پرجوش ہوگئی۔

''غالباً چار ماہ پانچ ماہ قبل۔''

''اس کے شوہر یا سسرال میں سے کسی کا اتا پتا۔''

''سوری۔ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کیونکہ میں تو ایک مہمان کی حیثیت سے شریک ہوا تھا۔'' وہ دامن بچا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اوکے بلال! اب میں چلوں۔''

''اب یہ نہیں کہ غائب ہی ہو جاؤ۔'' بلال اس کے ساتھ اٹھتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔ اب تو گھر دیکھ لیا ہے، جلد ہی آؤں گا۔''

''بھابھی کو بھی ساتھ لانا۔''

''اچھی بات ہے۔ اچھا عینی بھابھی خداحافظ۔'' اس نے پلٹ کر ایک نظر اس پر ڈالی، اور دل پر بوجھ لیے باہر نکلتا چلا گیا۔

روبی کو کھانا کھلانے اور پھر اسے اس کے کمرے میں چھوڑنے کے بعد عینی نے کچن میں جا کر بلال کے لیے کافی بنائی۔ کیونکہ وہ سونے سے پہلے کافی ضرور پیتا تھا۔ اور جب مگ لے کر کمرے میں آئی تو وہ لباس تبدیل کر کے بیڈ پر نیم دراز تھا، اسے دیکھتے ہی تکیے کے سہارے اونچا ہو بیٹھا تو وہ مگ اسے تھما کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔ گوکہ اس وقت اسے الماری میں سے کچھ نہیں لینا تھا۔ پھر بھی وہ اس کے اندر سر گھسا کر کھڑی ہوگئی۔ اصل میں وہ بلال سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی، اور وہ کچھ دیر تک تو اسے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

''آخر تم وہاں کیا کر رہی ہو؟''

''میں اپنی پرانی ڈائری تلاش کر رہی ہوں۔'' اس نے جھوٹ بولا۔

''اس وقت پرانی ڈائری کی کیا ضرورت آن پڑی۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔ الماری بند کر کے اپنی جگہ پر آلیٹی۔

''کیا ہوا، مل گئی ڈائری؟'' وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

''نہیں۔صبح دیکھ لوں گی۔''

''آخراس میں۔''

''اس میں میری دوستوں کے ایڈریس ہیں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بولی۔

''اور میں ان سے رابطہ کر کے روبی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔''

''مثلاً کیا؟''

''یہی کہ اس کی شادی کہاں ہوئی تھی، اور اس کی اس حالت کا ذمہ دار کون ہے۔''

پھر اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بولی۔'' مجھے تو لگتا ہے۔اس کے سسرال والوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔''

''دیکھو عینی! اس کی اس حالت کا کوئی بھی ذمہ دار ہو۔تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔'' بلال کے تنبیہی لہجے پر وہ خاموش ہو رہی تھی۔



''دیکھو بیٹا! میں جانتی ہوں کہ روبی تمہاری دوست ہے۔تمہیں بہت عزیز ہے۔ لیکن اس کے لیے اپنا گھر ڈسٹرب کرنا عقل مندی نہیں ہے۔''

عینی کی زبانی روبی کے بارے میں سن کر اس کی امی نے پہلے تاسف کا اظہار کیا، پھر رسان سے اسے سمجھانے لگیں۔

''جب بلال اس کا اپنے گھر میں رہنا پسند نہیں کر رہا تو تم نے کیوں اسے وہاں رکھا ہوا ہے۔''

''تو کیا میں اسے نکال باہر کر دوں؟'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''نہیں۔اس کو اس کے گھر چھوڑ آؤ۔''

''لیکن امی! وہاں کوئی نہیں ہے۔وہ اکیلی کیسے رہے گی۔''

''جیسے پہلے رہ رہی تھی۔''

''نہیں امی۔! اب میں اسے اس طرح اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔''

''تو پھر اس کا کوئی اور انتظام کرو۔میں یہ قطعی برداشت نہیں کر سکتی کہ تم اس کی وجہ سے اپنا گھر برباد کرو۔''

امی کے سخت رویے نے اسے نہ صرف مایوس بلکہ خاصا دل برداشتہ کیا تھا۔وہ تو

ایک طرح سے ان کے پاس فریاد لے کر گئی تھی کہ وہ بلال کو سمجھائیں گی لیکن انہوں نے الٹا اسے لتاڑ دیا تھا۔اور ان کے پاس سے آنے کے بعد سے وہ مسلسل یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اب کیا کرے۔ادھر بلال کا کہنا تھا کہ وہ روبی کا علاج ضرور کرے گا۔لیکن ڈلیوری کے بعد جب کہ اس کی ڈلیوری میں ابھی چار مہینے تھے۔اور یہ چار ماہ کا عرصہ اسے بہت طویل لگ رہا تھا۔کیونکہ بلال روبی کو مزید چار دن بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔اس وقت بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ روبی کو کس کے پاس بھیجے کہ وہ آصف آ گیا۔اس وقت بلال کلینک سے نہیں لوٹا تھا، اور اس نے جب آصف کو بتایا تو وہ کہنے لگا۔

''پھر تو میں چلتا ہوں۔''

''ارے نہیں آصف بھائی! آپ بیٹھیں۔بلال بھی ابھی آتے ہی ہوں گے۔'' وہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود چائے بنانے چلی گئی۔کچھ دیر بعد چائے لے کر آئی تو روبی پتا نہیں کب ادھر آ نکلی تھی، اور آصف کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔

''تم نے میرا دوپٹا کھینچا تھا۔؟''

''روبی۔!'' عینی نے فوراً ٹوکا اور جلدی سے ٹرے ٹیبل پر رکھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً کھینچتی ہوئی اسے اس کے کمرے میں بند کر آئی۔

''آئی ایم سوری آصف بھائی، پلیز، آپ خیال مت کیجئے گا۔'' واپس آ کر اس نے آصف سے معذرت کی، پھر کپ میں چائے ڈال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

''میں خود اس کی طرف سے بہت فکر مند ہوں۔''

''ٹھیک ہو جائیں گی۔'' آصف کا انداز تسلی دینے والا تھا۔

''ٹھیک تو ہو جائے گی لیکن۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔تب وہ سمجھ کر بولا۔

''کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتائیں۔'' اور وہ بے خیالی میں اسے دیکھے گئی۔انداز ایسا تھا کہ نظریں اس پر جمی تھیں۔اور ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

''عینی بھابھی!'' آصف نے اسے پکارا، اور اس کے چونک کر دیکھنے پر کہنے لگا۔

''میں جانتا ہوں، بلال آپ کی دوست کا یہاں رہنا پسند نہیں کر رہا۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' وہ اس کے سچ کو جھٹلانا چاہتی تھی لیکن وہ فوراً بول پڑا۔

"یہی بات ہے۔اس روز بلال کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔اور اس وقت میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ سمجھی نہیں۔

"میرا مطلب ہے، اگر آپ کہیں تو میں روبی کے لیے کوئی انتظام کر دوں۔"

"کیا کریں گے آپ؟"

"میں تو یہ سوچ سکا ہوں کہ ان کے گھر کا بڑا حصّہ کرائے پر دے دیا جائے۔اور دو کمروں میں ان کی رہائش رکھ کر ساتھ کسی ایسی عورت کا انتظام کر دیا جائے، جو دن رات ان کے ساتھ رہ سکیں۔اس طرح دونوں مسئلے حل ہو جائیں گے، میرا مطلب ہے آمدنی کا بھی، اور ان کی دیکھ بھال کا بھی۔" اس کی تجویز معقول تھی۔

"بہت بہت شکریہ آصف بھائی۔" اس نے پہلے تشکر کا اظہار کیا، پھر پوچھنے لگی۔

"آپ یہ سب کر لیں گے؟"

"ہاں، یہ تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔آپ بالکل فکر نہ کریں۔میں ایک ہفتے کے اندر یہ سارا انتظام کر دوں گا۔"

"ایک بار پھر شکریہ۔"

"ارے نہیں۔!" وہ اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ یہ سب اس کی ہمدردی میں نہیں، بلکہ خود اپنے لیے کر رہا ہے۔



سزا اور جزا کا حق و اختیار صرف اوپر والے کو ہے، اگر انسان کسی وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر یہ اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے تو جس طرح جذبے وقت کے محتاج ہوتے ہیں، اسی طرح انسان ایک مقررہ وقت تک ہی اپنے عمل بد سے تسکین حاصل کر سکتا ہے، اس کے بعد پچھتاوے ہی پچھتاوے، اور گیا وقت تو کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔

آصف جاہ نے بھی ناخدا سے خدا بننے کی کوشش کی تھی۔یہ صحیح ہے کہ اس کی بہن کے ساتھ زیادتی ہوئی لیکن اب تو اسے زیادتی کہنا ہی فضول تھا، کیونکہ وہ اسی شخص کے ساتھ نہ صرف خوش و خرم بلکہ اس کے بچے کی ماں بھی تھی۔جب کہ آصف نے وقتی جذبے یعنی جوش انتقام میں اس لڑکی روبی کی زندگی ہی تباہ کر ڈالی تھی، اور ابتدائی ایام میں تو وہ خاصا خوش اور

پر جوش سا رہا تھا کہ اس نے اپنی بہن کا انتقام لے لیا۔پھر رفتہ رفتہ وہ اس قصے کو اگر بھولا نہیں تو ایک عام سے واقعے کی طرح اس کے نزدیک کوئی اہمیت بھی نہیں رہی تھی۔نہ کوئی پچھتاوا نہ کوئی ملال، جبھی تو روبی کو گھر سے نکالنے کے بعد کبھی خیال تک نہیں آیا تھا کہ پلٹ کر دیکھ ہی لے، اس پر کیا بیتی۔اور غالباً اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی وہ اس طرح سامنے آئے گی، کہ وہ اپنی ہستی کا غرور خاک میں ملتے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔

کسی کی زندگی سے یوں کھیلنا کہ دل میں رتی برابر ملال بھی نہ جاگے تو یہ کہاں تک ممکن ہے بھلا۔

آصف جاہ کی زندگی میں بھی اطمینان بس یہیں تک تھا، اور اب تو ڈھیروں ندامتیں تھیں۔ڈھیروں پچھتاوے اور تلافی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ضمیر بیدار ہو جائے۔تو پھر اس کی آواز کو دبانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔بلال کے گھر میں روبی کو ایسے حال میں دیکھ کر وہ دل پر بوجھ لیے آیا تھا۔اور یہ ایسا بوجھ تھا، جو اسے کسی طرح چین نہیں لینے دے رہا تھا۔گو کہ اس نے اپنے آپ کو بہلانے کی بہت کوشش کی، دل نے بھی بہت تاویلیں گھڑی تھیں۔لیکن سب بے سود۔ایک تو روبی کی حالت تشویش ناک تھی۔دوسرے بلال کا نامناسب رویہ جس نے اس کے اندر احساس جرم کو بیدار کیا تھا۔گزشتہ تمام وقت میں وہ جتنا لاتعلق رہا تھا۔اب اتنا ہی وہ اسے کے ذہن پر سوار ہو گئی تھی۔کسی پل، کسی لمحہ وہ اس کے خیال سے دامن نہیں بچا پا رہا تھا۔سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کرے، جب بھی سوچتا تو پہلا خیال یہی آتا کہ وہ کسی طرح بھی اس کے ساتھ کی گئی زیادتی کی تلافی نہیں کر سکتا۔

"آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟" قزح جسے اس نے اپنی شریک حیات کہا تھا۔اس بے چینی سے ٹہلتے دیکھ کر پوچھنے لگی تو وہ ٹھٹھک کر رکا۔

"کچھ نہیں۔مجھے کیا ہونا ہے۔"

"پھر کیا بات ہے، میرا مطلب ہے تم اتنے پریشان سے کیوں ہو؟" وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولی۔"میں پچھلے کئی دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں، تم پریشان نظر آ رہے ہو۔"

"نہیں۔" اس نے پہلے ٹالنا چاہا پھر فوراً بات بنا کر بولا۔"اصل میں کچھ بزنس پرابلمز ہیں۔"

"لیکن ابھی کچھ دن پہلے تو تم نے کہا تھا کہ تمہاری فلیٹ اسکیم بہت کامیاب رہی ہے۔" وہ فرح کی بات پر خوامخواہ چڑ گیا۔

"میں آفس کی بات کر رہا ہوں۔ آفس میں سو طرح کی پرابلمز ہوتی ہے۔"

"تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔"

وہ جتانے والے انداز میں کہتی ہوئی اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی تو اسے نہ صرف یہ احساس ہوا کہ وہ خوامخواہ اس سے الجھ گیا، بلکہ یہ بھی کہ اس کی پریشانی سب کی نظروں میں آ رہی ہے۔ اور اگر فرح نے اصل بات جان لی تو وہ بجائے اس سے یا روبی سے ہمدردی کرنے کے بات کو غلط رنگ دیتے ہوئے اس کے لیے مزید مسائل کھڑے کر سکتی ہے۔

ویسے بھی اب وہ بہت شکی مزاج ہو گئی تھی، اور اس میں اس کا اتنا قصور بھی نہ تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ تقدیر نے عجیب مذاق کیا تھا۔ پہلی ڈلیوری میں اس کا کیس خراب ہو گیا تھا۔ اور ڈاکٹر نے آصف کو مژدہ سنایا کہ وہ اس کے بچے کو نہیں بچا سکے۔ بات اگر یہیں تک ہوتی تو خدا کی رضا کے سامنے سر جھکا دیا جاتا۔ لیکن اس کے بعد تکلیف دہ انکشاف یہ تھا کہ فرح پھر کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔

اس بات کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ اس لیے ابھی وہ اپنے ساتھ ہونے والے المیے سے سمجھوتا نہیں کر سکی تھی۔ پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میاں بیوی کے بندھن کو پائیداری کی ضمانت اولاد سے ملتی ہے، جب کہ وہ یہ ضمانت ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی۔ یوں اس کا بات بے بات شک کرنا فطری عمل تھا۔ کیونکہ مرد کا تو ویسے بھی کوئی بھروسا نہیں۔ اولاد موجود ہو تب بھی اسے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ پھر بھی یہ خوش فہمی تو رہتی ہی ہے۔ کہ وہ میرا نہیں تو اولاد کا خیال کرے گا، اور اب جب کہ ایسی خوش فہمی کا سہارا نہیں تھا تو وہ ہمہ وقت اندیشوں میں گھری رہتی تھی، یہ یقیناً اس ستم ...... کی سزا تھی، جو انہوں نے ایک بے قصور لڑکی پر توڑا تھا، اور یہ سزا کسی اور نے نہیں، اوپر والے نے ان کے مقدر میں لکھی تھی۔ کہ ایک احساس جرم میں مبتلا اور دوسری اندیشوں میں۔

وہ جانتا تھا کہ اپنے جرم کی مکمل طور پر تلافی نہیں کر سکتا۔ پھر بھی ضمیر پر پڑے بوجھ کو کم کرنے کے لیے اس نے پہلی کوشش یہ کی تھی کہ روبی کو اس کے گھر واپس لے آیا تھا، جیسا کہ اس نے عینی سے کہا تھا۔ اس کے گھر کا بڑا حصہ کرائے پر اٹھا دیا، اور دو کمروں میں

ں کی رہائش رکھ کر، ساتھ میں ایک کل وقتی ملازمہ کا انتظام کر دیا۔ ایسا اس نے بلال کے یے کی وجہ سے کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بلال کی ناگواری کو محسوس کر کے روبی مزید دل داشتہ ہو۔ گو کہ ابھی وہ کسی بات کو محسوس نہیں کرتی تھی، لیکن کسی دن اچانک ایسا ہو سکتا تھا۔ د بلال کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے کسی دن اس کی تمام حسیات اچانک کام کرنے لگیں، اور وہ یں محسوس کرے گی جیسے طویل نیند سے بیدار ہوئی ہو۔

"روبی! اب تم یہاں رہو گی۔" وہ اسی پرانے گھر میں اس کی زندگی کی نیا رخ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اماں کو تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یہ تمہارا خیال رکھیں گی۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، ان سے کہہ دینا۔ سمجھ رہی ہو نا؟"

وہ خاموشی سے اس پر سے نظریں ہٹا کر اس عورت کو دیکھنے لگی۔ جسے وہ اماں کہہ رہا تھا۔ پھر سادگی سے پوچھنے لگی۔

"میرا دوپٹہ تو نہیں چھینیں گی۔"

"ایسی باتیں مت کرو۔" وہ عاجزی سے بولا۔ پھر سمجھاتے ہوئے بولا۔

"تم اچھی لڑکی ہو اور سمجھ دار بھی۔ تمہیں بچوں جیسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ پتا ہے، اس طرح لوگ تمہارا مذاق اڑائیں گے، اپنے آپ کو نہ صرف سمجھو، بلکہ اس قابل بناؤ کہ لوگوں کا سامنا کر سکو۔"

"تم کون ہو۔؟" اس کی باتوں کے جواب میں وہ اسی سادگی سے بولی، تو وہ اماں کی موجودگی کے باعث سٹپٹا ہو گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"میں تمہارا دوست ہوں، کیا تمہیں یاد نہیں ہے، ہم دونوں ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔" وہ یوں سر ہلانے لگی، جیسے وہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔ تب اس نے اماں کو چائے کے لیے کہا۔ پھر خود بھی ان کے پیچھے اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ اور اس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہنے لگا۔

"کوئی چھ ماہ پہلے روبی کی شادی ہوئی تھی، اور شادی کے مہینے بھر بعد ہی بے چاری بیوہ ہو گئی۔ اس کی ممی بیٹی کا یہ دکھ برداشت نہیں کر سکیں۔ اور مالک حقیقی سے جا ملیں۔ یکے بعد دیگرے صدمات نے اس کی یہ حالت کر دی کہ یہ کسی کو پہچانتی ہی نہیں۔"

"بے چاری، کوئی رشتہ دار نہیں ہے اس کا؟" اماں تاسف کا اظہار کرتے ہوئے

پوچھنے لگیں۔

''سب ہیں۔لیکن آپ تو جانتی ہیں آج کل کون کسی کا ہے۔''

''ہاں، اب تو خون ہی سفید ہو گئے ہیں۔''

''بس یہی بات ہے، حالانکہ بہت بے ضرر سی لڑکی ہے، کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی، بہر حال آپ اس کا خیال رکھیے گا۔'' پھر جیب سے پین نکال کر دیوار پر اپنا فون نمبر لکھتے ہوئے بولا۔''ویسے تو میں آتا رہوں گا، پھر بھی احتیاطاً یہ اپنا ٹیلی فون نمبر لکھ رہا ہوں اگر کسی وقت کوئی ضرورت پڑے تو اس نمبر پر مجھے فون کر لیجیے گا۔''

وہ انہیں اچھی طرح سمجھانے کے بعد وہاں سے آیا تھا۔

اُس کا خیال تھا۔ وہ روبی کو گزشتہ کوئی بات یاد دلانے کے بجائے، ایک نیا روپ دے کر زندہ رہنے کے ڈھنگ سکھا دے گا۔ ویسے بھی ماضی تکلیف دہ تھا، اور اسے دفن کر دینا ہی بہتر تھا۔ اور جب وہ نئے انداز سے جینا سیکھ لے گی، تب وہ خود ہی اپنے لیے نئی راہیں بھی تلاش کر لے گی۔ بہر حال اُس رات وہ قدرے مطمئن تھا۔ جبھی دیر تک فرح کے ساتھ ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ اور فرح جو پچھلے کئی دنوں سے اسے الجھا ہوا دیکھ کر بے شمار اندیشوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ بھی کچھ مطمئن ہو گئی، پھر بھی کہے بغیر رہ نہیں سکی۔

''لگتا ہے، تم اپنی الجھنوں سے نکل آئے ہو۔''

''کیسی الجھنیں۔'' وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

''یہ تو میں نہیں جانتی لیکن۔''

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا آفس پرابلم تھی۔'' وہ فوراً ٹوک کر بولا۔''ویسے تم بہت وہمی ہو گئی ہو۔''

''حالات نے مجھے وہمی بنا دیا ہے۔ آصی!'' وہ بے حد آزاد ہو کر اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگی۔''ہماری شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے، ڈیڑھ دو سال اور اتنا عرصہ تو مستقبل کے خواب سجانے میں گزر جاتا ہے، جب کہ میرے خواب سجنے سے پہلے ہی ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں۔ میں اپنے کل پر نظر ڈالتی ہوں تو سوائے اندھیروں کے کچھ بھی نہیں، آس کی کوئی ننھی سی کرن بھی نہیں، جسے میں اپنی مٹھی میں بند کر سکوں۔''

اس کے ساتھ ہی وہ ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رو پڑی۔

''بیوقوف ہو تم!'' وہ اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا۔''ہم خدا کے کاموں میں دخل نہیں دے سکتے۔ پھر یہ سوچو کہ اس نے ہمیں اور کتنی نعمتوں اور آسائشوں سے نوازا ہے۔ جو اولاد والوں کو میسر نہیں۔ اس بات کو روگ مت بناؤ کہ ہمارے نصیب میں اولاد نہیں۔''

''تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ مرد ہو۔ دوسری شادی کر کے اولاد حاصل کر سکتے ہو؟'' بالآخر خدشہ اس کے لبوں پر آ ہی گیا۔

''پاگل ہو تم۔'' وہ پیار بھری خفگی سے بولا۔''مجھے تو لگتا ہے تمہیں اولاد سے زیادہ یہ بات پریشان کرتی ہے کہ میں کہیں دوسری شادی نہ کر لوں۔''

''ہاں۔ میں یہ سوچ کر ہی پریشان ہوتی ہوں، ابھی شاید تمہیں اس کمی کا احساس نہیں ہے، لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد جب تم خود اولاد کی ضرورت محسوس کرو گے تو پھر تمہیں۔''

''بس کرو۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔''تم نے خوامخواہ کی فکریں اپنے اوپر مسلط کر رکھی ہیں، اور اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔''

قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں، اور تمہیں مجھ پر اور میری محبت پر بھروسا ہونا چاہیے۔ وقت تو واقعی بڑا ظالم ہے فری۔ کبھی کبھی وہ کچھ دکھاتا ہے۔ جس کا کہ گمان بھی نہیں ہوتا۔''

وہ اپنے خیال میں گم ہو کر بولا، پھر اس پر نظر پڑی تو فوراً سنبھل کر کہنے لگا۔

''تم ان فکروں میں اپنے آپ کو ہلکان مت کرو۔ بس، یہ یقین رکھو کہ میں کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو لو اور پھر اچھی سی چائے بنا لو۔''

وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ اور جب چائے لے کر واپس آئی تو وہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

''سنو۔!'' وہ چائے کا کپ اسے تھما کر بولی۔''ایک بات مانو گے؟''

''ہاں کہو۔'' وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہم کوئی بچہ گود لے لیتے ہیں۔" اور اچانک آصف کا ذہن بھٹک گیا۔ اسے روبی کا خیال آیا۔ جو ماں بننے والی تھی۔ اس کے بچے کی ماں۔ اور اس نے سوچا۔ کوئی اور بچہ کیوں، اپنا بچہ کیوں نہیں۔

"کیا سوچنے لگے؟" وہ اس کا گھٹنا ہلا کر بولی۔ تو وہ چونک کر دیکھنے لگا۔

"کچھ نہیں۔"

"تو پھر میری بات کا جواب دو۔"

"کون سی بات۔"

"یہی کہ ہم بچہ۔"

کم آن یار! تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے ابھی میں ہاں کہوں گا، اور ابھی تم کہیں سے بچہ لے آؤ گی۔"

"تم ہامی تو بھرو۔"

"نہیں۔"

"کیا نہیں۔"

"میرا مطلب ہے سوچوں گا۔ اور اب پلیز اس موضوع کو ختم کرو۔"

وہ اسے خالی کپ تھما کر لیٹ گیا۔ اور اسے تو اس نے موضوع ختم کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ لیکن خود مسلسل اسی نہج پر سوچنے لگا تھا۔



دو چار روز تک تو وہ بہت خاموشی سے اماں کو سارا کام کاج کرتے دیکھتی رہی تھی، پھر اسے عجیب سا لگنے لگا، یعنی اپنے آپ میں شرمندگی محسوس ہونے لگی، کہ ایک بوڑھی عورت تو سارا دن کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی ہے، اور وہ آرام سے بیٹھی دیکھا کرتی ہے۔ تب اسی وقت سے وہ ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ اس کا ذہن رفتہ رفتہ بیدار ہونے لگا۔ کوئی بھی کام کرتے ہوئے اسے اس کام کے حوالے سے اچانک کوئی بات یاد آ جاتی۔

"ممی ناشتے میں سلائس بالکل پسند نہیں کرتی تھیں۔" صبح اماں کے ساتھ مل کر ناشتا بناتے ہوئے وہ آپ ہی آپ کہنے لگتی۔ "ان کا کہنا تھا۔ اچھا ناشتا بندے کو سارا دن فریش رکھتا ہے۔"

"یہ سوٹ ممی نے مجھے میری برتھ ڈے پر دیا تھا۔" وہ خود سے ایسی کئی باتیں کرتی۔ لیکن جب اماں خاص طور سے کوئی بات پوچھتیں، تب وہ سوچ میں پڑ جاتی، پھر الجھ کر کہتی۔

"پتا نہیں۔"

"پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ کسی کسی دن عینی آ جاتی تھی۔ اپنے طور پر وہ بہت کوشش کرتی۔ اسے گزری باتیں یاد دلانے کی، لیکن ایسے وقت میں ...... اسے چپ لگ جاتی۔ کچھ حیران ہو کر عینی کو دیکھے جاتی۔ اور کبھی اکتا کر کہتی۔

"پتا نہیں تم کیسی باتیں کرتی ہو۔"

اور آصف جاہ روزانہ نہیں تو ہر دوسرے دن اس کے پاس ضرور آتا تھا۔ اور عینی کے برعکس وہ اسے گزری باتیں یاد دلانے کے بجائے آنے والے دنوں کی باتیں کرتا۔ وہ اس سے خاصی مانوس ہو گئی تھی، اور جیسا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ اس کا دوست ہے، اس کے ساتھ پڑھتا رہا ہے، تو وہ ایسا ہی سمجھتی تھی۔ اسے اچھا اور مخلص دوست سمجھتے ہوئے اس کی ممنون تھی کہ وہ ایسے وقت میں جب کہ وہ بالکل تنہا تھی، کچھ وقت کے لیے اس کے پاس آ بیٹھتا تھا۔

"تم نے مجھے بہت سہارا دیا ہے آصف!" اس روز وہ اس سے کہنے لگی۔ "ورنہ ممی کے بعد تو میں بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ اگر عزیز رشتہ داروں کی طرح تم بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتے تو میں پاگل ہو جاتی۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہے کہ۔"

"نہیں۔" اس نے ٹوک دیا۔ "دوست ہونے کے ناتے میں نے اپنا فرض نبھایا ہے۔"

"یہ فرض تو اوروں کا بھی تھا۔ پھر سب نے منہ کیوں موڑ لیا؟"

"تم اس بات کو محسوس مت کرو، بلکہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ تمہیں سب کی پہچان ہو گئی ہے۔"

"ہاں اور میرا خیال ہے۔ ممی بھی سب کو پہچانتی تھیں، جب ہی سب سے کم کم ہی ملتی تھیں۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔" وہ جب ماضی کے بارے میں کوئی بات کرنے لگتی، وہ اسی طرح موضوع بدل دیتا تھا۔ اس وقت بھی خوبصورتی سے بات بدل گیا۔

"یہ بتاؤ۔ تم نے اپنے آئندہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

''کیا سوچوں۔؟'' وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

''اپنے لیے سوچو، کیا اس طرح تم ساری زندگی گزار سکتی ہو؟''

''پتا نہیں۔'' وہ عاجزی سے بولی تو وہ اس کی کیفیت سمجھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں اب چلوں گا۔''

''پھر کب آؤ گے؟''

''کل۔'' وہ سوچ کر بولا۔''تمہیں یاد ہے ناں کل تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔''

''ہاں۔تم نے بتایا تو تھا۔'' وہ یاد کرتے ہوئے بولی۔

''او کے، پھر کل آؤں گا۔'' وہ اسے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔تو وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی، پھر اندر چلی آئی۔

اگلے دن وہ وقت سے پہلے تیار ہو کر اس کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ عینی آ گئی۔ اسے تیار دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''تم کہیں جا رہی تھیں کیا؟''

''ہاں۔آج مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔''

''ارے تمہیں یاد ہے۔'' عینی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔''میں بھی اسی لیے آئی تھی کہ تمہیں چیک اپ کے لیے لے جاؤں گی۔''

''کل آصف آیا تھا۔'' وہ سادگی سے بتانے لگی۔

''اُس نے کہا تھا کہ وہ آج مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا۔''

''اچھا۔!'' عینی سوچ میں پڑ گئی تو وہ کہنے لگی۔

''اچھا ہوا تم آ گئیں۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ آصف کے ساتھ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔'' پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔''اصل میں کسی وقت ڈاکٹر، آصف کی موجودگی میں کوئی ایسی بات کہہ جاتی ہے کہ مجھے بے حد شرم آتی ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' عینی مسکراہٹ دبا کر بولی۔''ڈاکٹر کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔ ویسے آصف بھائی بہت اچھے ہیں۔''

''ہاں۔!'' اس نے اعتراف کیا۔اسی وقت آصف کی آمد پر دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''کیسی ہیں عینی بھابھی؟'' وہ سلام کرنے کے بعد پوچھنے لگا۔

''ٹھیک ہوں۔'' عینی مسکرا کر بولی۔''ہم ابھی آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے۔''

''اچھا۔!'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔شاید اسے یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ اس کے حوالے سے گئے دنوں کی کوئی بات زبان پر نہ لے آئے۔ اور اسے انجان دیکھ کر مطمئن ہو کر بولا۔

''بلال نہیں آیا آپ کے ساتھ؟''

''نہیں، اس وقت تو وہ کلینک میں ہوتے ہیں۔''

''چائے لاؤں۔'' وہ باری باری دونوں کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''نہیں۔چائے رہنے دو۔'' عینی نے اسے منع کیا، پھر آصف سے کہنے لگی۔

''میں روبی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے خیال سے آئی تھی۔لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ آپ۔''

''ہاں، ڈاکٹر نے آج کی تاریخ دی تھی۔اور کل میں نے انہیں یاد دلایا تھا۔'' وہ سرسری انداز میں بولا۔

''تھینک یو۔اور اب میرا خیال ہے، میں آ ہی گئی ہوں تو میں ہی لے جاتی ہوں۔''

''ایز یو لائک۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔

''چلیں پھر۔؟'' عینی، روبی سے پوچھنے لگی۔

''چلو۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر تینوں ساتھ باہر آئے تو وہ عینی کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے وقت ٹھہر سا گیا ہو۔'' واپسی میں عینی کہنے لگی۔

''جب کہ میں چاہتی ہوں۔ یہ وقت جلدی سے گزر جائے۔ میرا مطلب ہے۔تم ڈلیوری سے فارغ ہو جاؤ پھر تمہارا دوسرا علاج شروع ہو۔''

''دوسرا علاج۔'' وہ چونک کر دیکھنے لگی، اور عینی اپنی دھن میں کہے گئی۔

''ہاں! میں نے بلال سے بات کی تھی، وہ یہی کہتا ہے ڈلیوری کے بعد ہی ممکن ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم، میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ الجھ کر بولی، تب عینی ایک

دم چپ ہوگئی۔

"بتاؤ ناں کیا ہوا ہے مجھے۔تم کس علاج کی بات کر رہی ہو۔" وہ اصرار سے پوچھنے لگی۔تب عینی بات بنا کر بولی۔

"تم کمزور بہت ہوگئی ہو، اور ڈاکٹر کا کہنا ہے۔ ڈلیوری کے بعد ہی تمہیں ٹانک وغیرہ دیے جاسکیں گے۔"

"اچھا۔!" وہ بِرر میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔

"اپنا خیال رکھا کرو ناں!" عینی۔اسے اپنا جائزہ لیتے دیکھ کر بولی، تو وہ اثبات میں سر ہلا کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔



حسب معمول عینی نے سونے سے پہلے بلال کے لیے کافی بنائی، اور مگ لے کر کمرے میں آئی تو وہ کسی مریض کی فائل اسٹڈی کر رہا تھا۔اس نے بہت خاموشی سے مگ اس کے سامنے رکھا، پھر خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک چپ چاپ اسے دیکھتی رہی، پھر پوچھنے لگی۔

"کیا تم زیادہ دیر تک بیٹھو گے؟"

"نہیں۔" وہ سر اونچا کر کے اسے دیکھ کر بولا۔"کوئی کام ہے کیا؟"

"کام تو نہیں، البتہ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں کہو۔" اس نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھی پھر اس کی طرف متوجہ ہوا تو کہنے لگی۔

"میں آج روبی کے پاس گئی تھی۔ اصل میں اسے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔"

"پھر۔کیا کوئی پرابلم ہے؟"

"نہیں۔ بلکہ مجھے تو آج روبی بہت بہتر نظر آئی میرا مطلب ہے، بلال کہ کسی طرح بھی ہی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ نارمل نہیں ہے۔ باتیں بھی ٹھیک ٹھاک کر رہی تھی۔ بس کسی وقت جب میں گزشتہ دنوں کی کوئی بات کرتی تو وہ خاموش ہو جاتی۔ ورنہ تو۔"

وہ خاموش ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ہوں۔" اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر بلال کرسی کی بیک سے پشت ٹکا کر سیدھا ہو بیٹھا، پھر کہنے لگا۔

"اصل میں ایسے مریض بظاہر ٹھیک ٹھاک ہی نظر آتے ہیں۔ بلکہ وہ خود بھی اپنے آپ کو نارمل ہی سمجھتے ہیں لیکن ہوتا یوں ہے کہ زندگی کے کچھ دن، مہینے یا سال اچانک ان کی یادداشت میں کہیں کھو جاتے ہیں۔ اور ایسا یونہی نہیں ہوتا۔کوئی واقعہ، حادثہ یا ایسی کوئی بات جس کا گمان نہ ہو۔ اس کے ہونے سے جو شاک پہنچتا ہے، اس سے بعض لوگ فوری متاثر ہوتے ہیں۔اور بعض رفتہ رفتہ۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے روبی کے ساتھ بھی ایسی ہی کوئی بات ہوئی ہے۔لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ غیر متوقع بات یا حادثے سے اس کا ذہن فوری متاثر ہوا ہے یا رفتہ رفتہ۔اس کے بارے میں کوئی بتانے والا بھی تو نہیں ہے۔ بہر حال دوسرے امراض کی طرح اس مرض کے لیے بھی فوری علاج سود مند ثابت ہوتا ہے، ورنہ مریض کے ساتھ یہ مسئلہ رہتا ہے کہ وقفے وقفے سے زندگی کا کوئی دور اس کی یادداشت سے محو ہو جاتا ہے۔"

"تو کیا روبی کے ساتھ بھی ایسا ہوگا؟" وہ اس کے خاموش ہونے پر پوچھنے لگی۔

"ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ ابھی تو اس کا علاج شروع بھی نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب بھی وہ ٹھیک ہوئی۔ اپنے آپ کو اسی مقام پر محسوس کرے گی۔ جہاں سے اس کا ذہن متاثر ہوا تھا۔"

"اور یہ درمیانی عرصہ۔"

"یہ سب اسے یاد نہیں رہے گا۔لیکن اگر اس کی قوت ارادی مضبوط ہوئی تو وہ خود اپنے حالات کی کڑی سے کڑی ملا کر سمجھنے کے قابل ہو سکے گی۔"

پھر کچھ سوچ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بہر حال، تم اس کی طرف سے زیادہ پریشان مت ہو۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اور یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ اسے شاک ہی لگایا جائے۔ ہوسکتا ہے، صرف میڈیسن میں اس کے لیے شفا ہو۔"

"خدا کرے ایسا ہو، اور وہ جلد ٹھیک ہو جائے۔"

اس نے بڑے خلوص سے دعا کی۔ اور شاید قبولیت کی گھڑی تھی کہ نہ الیکٹرک

شاک، نہ میڈیسن وہ جس طرح غفلت کے اندھیروں میں ڈوبی تھی، اسی طرح ایک دن بیدار ہوگئی۔ ہوا یوں کہ اس رات اماں نے اس سے کہا کہ وہ ان کی بیٹی کے نام خط لکھ دے، جو اندرون سندھ کہیں بیاہی ہوئی تھی۔ اور جس طرح کوئی کام کرتے ہوئے اسے اس کام کے حوالے سے اچانک کوئی بات یاد آجاتی تھی، تو اس وقت بھی خط لکھتے ہوئے وہ کہنے لگی۔

"میں ڈیڈی کو خط لکھنے کا بس سوچتی ہی رہ گئی۔ اصل میں ممی کا خیال رہا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہوں۔ لیکن اب تو ممی بھی نہیں ہیں جو ان کی خفگی کا خیال ہو، اب مجھے ڈیڈی کو خط لکھ دینا چاہیے، ہوسکتا ہے، وہ انتظار میں ہوں۔" پھر بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ اماں پوچھنے لگیں۔

"تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"کینیڈا میں۔" پھر تفصیل سے بتانے لگی۔ "میں اس وقت چھوٹی تھی جب ڈیڈی کینیڈا گئے تھے، اور انہوں نے کہا تو یہ تھا کہ سال بھر کے بعد مجھے اور ممی کو بھی اپنے پاس بلائیں گے۔ لیکن ہوا یوں کہ سال بھر بعد انہوں نے وہاں دوسری شادی کرلی، اور یہاں سے بالکل لاتعلق ہوگئے۔ بے چاری ممی بہت عرصے تک کڑھتی رہی تھیں۔ خیر، یہ بھی اچھا ہوا کہ انہوں نے اس بات کو ساری زندگی کا روگ نہیں بنایا۔ بڑے حوصلے سے زندہ رہیں۔ لیکن ان کے سارے حوصلے اس وقت ٹوٹ گئے جب میں۔"

گہرے دکھ کے احساس میں گھر کر اس نے بیڈ کی پٹی پر سر رکھا، اور پلکیں موندلیں، اماں اسے سوتا سمجھ کر بہت خاموشی سے اٹھ کر چلی گئیں۔ لیکن وہ سوئی کب تھی۔ وہ تو اب بیدار ہو رہی تھی۔ بند پلکوں کے اندر کتنے چہرے تھے، اور ان سب میں نمایاں اس شخص کا چہرہ جو محبتوں کا فریب دے کر اس کی زندگی سے کھیل گیا تھا۔

"آصف جاہ!" اس کے ہونٹ بہت آہستہ سے ہلے تھے۔



رات بھر وہ نہیں سوئی تھی۔ صبح کہیں جا کر اس کی آنکھ لگی تھی۔ جب اماں معمول کے مطابق اسے اٹھانے آئیں۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ پھر انہوں نے نہ صرف اس وقت بلکہ وقفے وقفے سے اسے اٹھانے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ اسی طرح سوئی رہی۔ کسی وقت ان کے پکارنے پر آنکھ کھول کر دیکھ لیتی۔ پھر کروٹ بدل کر سو جاتی۔

صبح سے دوپہر ہوگئی، اور دوپہر سے سہ پہر، تب اماں پریشان ہوگئیں۔ انہیں

آصف کا خیال آیا تو فوراً اس کے دیئے ہوئے نمبر پر فون کیا۔ مگر وہ آفس میں موجود نہیں تھا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے عینی کو فون کر کے فوراً آنے کے لیے کہا۔ تو وہ بے چاری پریشان ہو کر اسی وقت چلی آئی۔

"کیا ہوا ہے روبی کو؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔

"پتا نہیں۔ صبح سے بے خبر پڑی ہے۔ تم خود جا کر دیکھ لو۔" اماں نے کہا تو عینی بہت عجلت کا مظاہرہ کرتی ہوئی اس کے کمرے میں آگئی۔ پہلے آہستگی سے اس کی کلائی اور پیشانی چھو کر دیکھی، بخار نہیں تھا۔ تب مطمئن ہو کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا کندھا ہلا کر پکارنے لگی۔

"روبی! روبی! اٹھ جاؤ بھئی۔" اس نے کسمسا کر ذرا سی آنکھیں کھولیں اور عینی پر نظر پڑتے ہی وہ خوشگوار حیرت میں گھر کر بولی۔

"عینی! یہ تم ہی ہوناں۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔"

"اس کا مطلب ہے۔ ابھی تم خواب میں بھی مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔" عینی اس کی کیفیت سے بے خبر سرسری انداز میں بولی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھنے لگی۔

"تم باہر سے کب آئیں؟ کیا بلال بھی تمہارے ساتھ آیا ہے؟" عینی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"میں نے تمہیں بہت مس کیا عینی، پتا ہے میں بالکل تنہا ہوگئی ہوں۔ ممی کی ڈیتھ کے بعد بس چند دن ہی عزیزوں نے میرا ساتھ دیا۔ پھر سب مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔"

وہ بے حد آزردہ ہو کر بتا رہی تھی۔ تب عینی کو بلال کی بات یاد آئی۔ کچھ روز پہلے ہی تو اس نے بتایا تھا۔

"جب بھی وہ ٹھیک ہوئی۔ اپنے آپ کو اسی مقام پر محسوس کرے گی۔ جہاں سے اس کا ذہن متاثر ہوا تھا۔"

"روبی!" فرط جذبات سے عینی نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے، اسی وقت اماں چائے لے کر آگئیں۔ تو وہ انہیں دیکھ کر عینی سے پوچھنے لگی۔

"یہ کون ہیں؟" عینی نے پہلے اٹھ کر اماں کے ہاتھوں سے چائے کی ٹرے لے کر

انہیں جانے کا اشارا کیا۔ پھر اس سے کہنے لگی۔

''یہ اماں ہیں۔ میرا مطلب ہے، بے سہارا عورت ہے، ہم نے انہیں تمہارے لیے یہاں رکھا ہے تا کہ تم بھی اکیلی نہ رہو۔''

''اچھا۔ کب؟''

''ابھی کچھ دن پہلے۔'' پھر اس کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''ممی کی ڈیتھ کے بعد تو تمہیں اپنا بھی ہوش نہیں رہا۔ میں نے اور آصف بھائی نے مل کر تمہارے لیے یہ سب کیا ہے۔ یعنی ان دو کمروں کے علاوہ باقی گھر کرائے پر اٹھا دیا ہے، اور تمہارے ساتھ رہنے کے لیے آصف بھائی اماں کو لے آئے۔''

''کون آصف؟''

''تم نہیں جانتیں۔ آئیں گے تو مل لینا۔ لو چائے پیو۔'' عینی نے کپ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ تو وہ ایک دو سپ لینے کے بعد بولی۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم کافی دنوں سے آئی ہوئی ہو۔''

''ہاں۔ اور یہاں آتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری ممی کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ میں فوراً تمہارے پاس آئی، لیکن تمہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔'' پھر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔ ''کیا ہوا تھا آنٹی کو؟''

''کیا بتاؤں۔ وہ جو زندگی بھر اپنی تنہائیوں سے لڑتی رہیں۔ میری تنہائی کا سوچ کر ہی ڈھے گئیں۔ جانتی ہو میرے ساتھ کیا ہوا؟''

عینی نفی میں سر ہلاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ تب تمام حالات بتا کر آخر میں وہ کہنے لگی۔

''ممی کی موت کا ذمہ دار صرف وہ شخص نہیں، میں بھی ہوں۔ میں اگر آرام سے انہیں بتاتی کہ ہمارے ساتھ فریب ہوا ہے تو شاید انہیں اتنا شاک نہ لگتا۔ لیکن میں نے آتے ہی انہیں الزام دے دیا تھا کہ میری تباہی کی ذمہ دار وہ ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنے کو کمرے میں بند کر لیا۔ پھر۔''

وہ گھٹنوں پر پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، کچھ دیر تک تو عینی نے اسے

رونے دیا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے برابر آ بیٹھی، اور اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنا کر بولی۔

''بس کرو روبی! اس طرح مت روؤ۔ ایسی حالت میں تمہیں ڈیپریسڈ نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے ایک دم سر اٹھا کر پہلے عینی کو دیکھا، پھر اپنے آپ کو، اور اس احساس نے۔ اب کچھ ہی عرصے میں وہ ماں بننے والی ہے۔ اسے اندر تک سلگا کر رکھ دیا۔

''میں ماں بنو گی، اس شخص کے بچے کی جس نے مجھے بے سائبانی بخشی، ہرگز نہیں۔''

''ایسے مت کہو۔'' عینی نے اسے سمجھانا چاہا۔ لیکن وہ بھڑک اٹھی۔

''تم شاید میرے کرب کا اندازہ نہیں کر سکتیں عینی! اس نے پہلے میرے گرد اپنی محبتوں کا جال بچھایا تھا۔ اور جب میں پوری طرح اس میں دھنس گئی۔ تب میرے بال و پر کاٹ کر اس نے آزادی کا پروانہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اتنا بے مایہ کیا اس نے مجھے، کہ سینت سینت کر رکھی محبتیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں، اور دوسرے ہی پل اس روئے زمین پر وہ مجھے سب سے قابل نفرت شخص نظر آیا۔ میں یقین کے ساتھ کہوں گی کہ محبت کے مقابلے میں اس کے لیے میری نفرتیں شدید تر ہیں، اور تم ہی بتاؤ۔ میں ایسے شخص کے بچے کی ماں بننا کیسے قبول کر لوں۔ نہیں۔ مجھے یہ منظور نہیں ہے۔''

''میں تمہاری کیفیت سمجھتی ہوں روبی! اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر ابتدائی ایام کی بات ہوتی تو کچھ سوچا جا سکتا تھا۔ جب کہ اب تو بہت کم وقت رہ گیا ہے، غالباً ڈیڑھ دو ماہ۔''

''عینی نے اس کی توجہ اس طرف دلائی، تو وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگی، پھر انتہائی عاجزی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''لیکن عینی! میں ایسا نہیں چاہتی، اس لیے کہ میں کبھی بھی اس بچے پر مامتا نچھاور نہیں کر سکوں گی۔ اس کے برعکس مجھے ہمیشہ خیال رہے گا کہ یہ اس شخص کا بچہ ہے جو۔''

''پلیز۔'' عینی نے ٹوک دیا۔ ''اس طرح مت سوچو۔''

''میں اس سے ہٹ کر نہیں سوچوں گی۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔ تو عینی کچھ دیر تک اس پر نظریں جمائے بیٹھی رہی پھر کہ

"ایک بات ہو سکتی ہے۔"

"کیا۔؟"

"تم بچہ اسے دے دینا۔"

"بچہ اسے دے دوں۔" اس کے اندر باہر سناٹوں کا راج ہو گیا۔ جب کہ عینی اپنی کہے گئی۔

"ٹھیک تو ہے جب تمہیں بچے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ ہی تم اس پر ممتا نچھاور کرنے کو تیار ہو تو پھر یہی بہتر ہے۔"

اس نے یونہی سر ہلا دیا۔ تب عینی گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بلال کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔"

"پھر آؤ گی ناں۔؟" وہ اس کے ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں۔ اور تم پلیز اپنا خیال رکھو۔ میرا دھیان ہر وقت تمہاری طرف رہتا ہے۔"

"شکریہ عینی! تم نے واقعی دوستی کا حق ادا کر دیا۔" اس نے عینی کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ تو پلکیں نم ہو گئیں۔

"بس، اب رونا مت۔"

"نہیں۔" وہ قصداً مسکرائی پھر اسے باہر تک چھوڑ کر واپس پلٹی تو وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ شاید اسے خیال نہیں رہا تھا، کہ یہ حصہ کرائے داروں کی حدود میں شامل ہے۔

"ارے، آپ یہاں۔؟" وہ جانے کیا کچھ سوچ جا رہی تھی کہ اس آواز پر چونکی اور ذرا سی گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا جانے کون تھا۔ اس کے دیکھنے پر کہنے لگا۔

"پلیز آپ اندر آ جائیں۔"

"جی۔!" وہ کھڑی تو ہو گئی، لیکن فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون ہے، اور یہاں کیا کر رہا ہے۔

"میں بھابی کو بلاتا ہوں۔" وہ اسے شش و پنج میں دیکھ کر بھابی کو آواز دینے لگا، تب اچانک اسے یاد آیا کہ اس کے گھر کا یہ حصہ کرائے داروں کے تصرف میں ہے۔ اسی

وقت اندر سے اس کی بھابی آ گئیں تو وہ انہیں دیکھ کر بولی۔

"آئی ایم سوری، میں بے خیالی میں یہاں آ بیٹھی تھی۔"

"آپ کا اپنا گھر ہے، جہاں دل چاہیے بیٹھیں۔"

"بس وہ۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"اندر آئیں ناں۔" بھابی زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں۔ اور اس کے برابر بیٹھتی ہوئی کہنے لگیں۔

"آپ تو کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہیں۔ میں ایک دو بار آپ کی طرف آئی تھی۔ آپ سو رہی تھیں۔ پھر آصف صاحب نے بھی بتایا تھا کہ آپ تنہائی پسند ہیں۔ اس لیے بھی میں۔" انہوں نے قصداً بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تنہائی پسند تو نہیں ہوں میں۔" اسے کہنا پڑا۔

"بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔"

"ارے۔ میں نے آپ سے چائے وغیرہ کا تو پوچھا نہیں۔"

"چائے رہنے دیں۔ میں ابھی پی کر آ رہی ہوں۔"

اُس نے انہیں اٹھتے ہوئے روک دیا۔ پھر پوچھنے لگی۔

"یہاں آپ کے ساتھ کون کون رہتا ہے۔"

"بس میں اور میرے میاں۔"

"اور وہ۔؟" اس کا اشارا اس کی طرف تھا، جس نے ابھی انہیں بھائی پکارا تھا۔

"وہ سلمان ہے میرا دیور۔ یوں تو ہر دوسرے دن آتا ہے، مگر رہتا یہاں نہیں ہے۔" اس نے وجہ نہیں پوچھی، اور موضوع بدل کر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد آئندہ آتے جاتے رہنے کا کہتی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔ اب اسے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ کہ وہ اتنے دنوں سے اپنے اطراف سے غافل کیسے رہی۔

"بیٹا! تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ کیا تمہیں بھوک نہیں لگی؟" اماں اسے اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے آج آصف بھی نہیں آیا۔ ورنہ اس

سے کہتی۔ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔'' وہ تیسری بار یہ نام سن رہی تھی، پہلے عینی، پھر بھابھی اور اب اماں۔

''کون آصف۔؟'' اس نے سوچا، پھر اماں سے پوچھا، تو وہ الٹا اسے حیرت سے دیکھنے لگیں، تب وہ الجھ کر پوچھنے لگی۔

''آپ کس آصف کی بات کر رہی ہیں؟''

''لو' وہ خود ہی آ گیا۔'' اماں کے کہنے پر اس نے فوراً گردن موڑ کر دیکھا، تو لمحہ بھر کو سناٹے میں آ گئی یعنی اس کی یہ جرأت۔

''آئی ایم سوری۔ جس وقت اماں کا فون آیا۔ میں آفس میں نہیں تھا۔ پھر مجھے ان کا میسج ملا۔ اس کے بعد میں نے بہت کوشش کی فوراً آنے کی لیکن۔''

اس نے کندھے اچکا کر گویا بات مکمل کی پھر پوچھنے لگا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' وہ باوجود کوشش کے بولنے کے قاصر رہی، تو اماں کی طرف دیکھنے لگی۔

''صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں۔ عینی آئی تھی تو بس اس کے ساتھ ایک پیالی چائے پی۔'' اماں نے بتایا تو وہ تشویش سے بولا۔

''کیا بات ہے، بھوک نہیں لگتی تمہیں؟'' اس کی خاموشی حیرتوں کی مرہون منت تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس طرح کیسے بات کر رہا ہے۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

''اس وقت تو دیر ہو گئی ہے۔'' وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ ڈاکٹر بھی جا چکی ہوں گی۔ کل میں جلدی آؤں گا پھر۔''

''اماں۔!'' ساری توانائیاں صرف کر کے اس کے حلق سے یہی آواز نکل سکی۔ اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چاہتی تو یہ تھی کہ بڑھ کر اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پوچھے کہ اسے یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ لیکن کمزوری کے باعث اس وقت اس نے اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کیا تو اس کی طرف بڑھنے کے بجائے اپنے کمرے کی طرف جاتی ہوئی بولی۔

''میں سونے جا رہی ہوں اماں! مجھے صبح سے پہلے مت اٹھائیے گا۔''

''روبی!'' اس نے غالباً روکنا چاہا، لیکن اس نے ان سنی کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔



صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوتے ہی اس نے عینی کو فون کر کے آنے کے لیے کہا۔ اصل میں وہ رات بھر بے حد پریشان رہی تھی۔ بے شمار الجھنیں تھیں۔ جنہیں سلجھانے کی کوشش میں صبح ہو گئی تھی۔ لیکن اس الجھی ڈور کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ تب اسے عینی کا خیال آیا۔ شاید وہ اسے اس الجھن سے نکال سکے، جس وقت عینی آئی، اس وقت بھی وہ اسی طرح پریشان بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' عینی اس کی سرخی مائل آنکھوں کو دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگی۔

''میں رات بھر بہت پریشان رہی ہوں، عینی پلیز، میری مدد کرو۔'' وہ عاجزی سے بولی تو عینی اسے ڈانٹنے لگی۔

''میں تمہیں کہہ کر گئی تھی کہ اب ذہن پر کوئی بوجھ مت ڈالنا۔ پھر تمہیں کیا پریشانی رہی؟''

''وہ۔ کل تمہارے جانے کے بعد آصف آیا تھا۔''

''کون، آصف بھائی۔؟''

''ہاں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کس رشتے سے تمہارا بھائی ہے۔ لیکن تم سن لو کہ، وہ وہی آصف جاہ ہے جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا۔''

''کیا۔؟'' عینی اچھل پڑی۔

''مجھے بتاؤ عینی! اب وہ کس ارادے سے یہاں آتا ہے۔ سب کچھ تو تباہ کر چکا۔ اب کیا رہ گیا ہے۔''

''ایک منٹ۔'' عینی نے اسے بولنے سے روکا، پھر کتنی دیر سوچنے کے بعد کہنے لگی۔ ''میرا خیال ہے آصف بھائی اپنے کیے پر پشیمان ہیں۔ جب ہی تمہیں اس حال میں دیکھ کر انہوں نے تمہاری مدد کی۔ غالباً وہ اپنے رویے کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ تلافی ممکن تو نہیں ہے پھر بھی کسی حد تک دل پر پڑا بوجھ تو کم ہو سکتا ہے۔ تمہارا ان سے تنفر ہونا فطری

بات ہے، لیکن یہ سوچنا صحیح نہیں ہے کہ وہ دوبارہ بھی کسی غلط ارادے سے یہاں آئے ہوں، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ پشیمان ہو کر۔"

"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔" وہ طنز کرتی ہوئی کہنے لگی۔ "تمہارا قصور نہیں ہے عینی۔!" پہلی بار تو میں نے، ممی نے بھی اس پر آنکھ بند کر کے اعتبار کر لیا تھا۔ کیونکہ اس کی شخصیت بظاہر بڑی اجلی اجلی سی ہے۔ لیکن اب میں اس کے دھوکے میں آنے والی نہیں ہوں۔ تم اگر یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ کم کرنے کے لیے میرے ساتھ کوئی بھلائی کرنا چاہتا ہے، تو یہ خیال دل سے نکال دو عینی۔!"

"اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو اسے یہاں آنے سے روک دو۔ ویسے کل تم نے اسے کیا کہا تھا۔"

"کل تو میں کچھ بھی نہیں کہہ سکی، کیونکہ میں اچانک اسے دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔ پھر اس کا انداز ایسا تھا، جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو، میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے، اس لیے میں فوراً اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔" قدرے توقف کے بعد پوچھنے لگی۔

"تمہیں اس نے میرے بارے میں کیا بتایا تھا۔ میرا مطلب ہے مجھ سے کیا تعلق جوڑا تھا؟"

"کوئی تعلق نہیں، صرف اتنا کہا تھا کہ مسز شاہین نے اس کی بہن کی شادی کروائی تھی، یوں تھوڑی بہت ان سے جان پہچان تھی، اور اسی ناتے اس نے تمہاری شادی میں بھی شرکت کی تھی۔"

"اچھا۔!" وہ تلخی سے ہنسی۔ "ویسے ایک طرح سے ٹھیک ہی کہا ہے، کہ اس نے شادی میں شرکت کی تھی۔"

"ہاں۔!" عینی اس کی بات سمجھ کر بولی۔ "بہر حال اب تم ان سب باتوں میں مت الجھو، میں ابھی جاتے ہی اسے فون کر کے منع کر دوں گی، کہ وہ آئندہ یہاں نہ آئے، کیونکہ تم نے اسے پہچان لیا ہے، اور نہیں چاہتیں کہ۔"

"نہیں عینی۔!" اس نے اچانک کسی خیال کے تحت ٹوک دیا۔ پھر سوچتے ہوئے بولی۔ "ابھی اسے کچھ مت بتاؤ، میں ابھی اس پر کچھ ظاہر نہیں کروں گی۔ آخر پتا تو چلے کہ"

واقعی اپنے کیے پر پشیمان ہے، یا اس کا کوئی اور مقصد ہے۔"

"اور کیا مقصد ہوگا بھلا؟"

"پھر بھی تم، اسے کچھ مت بتانا۔"

"اچھی بات ہے۔" عینی گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جاتے جاتے بولی۔

"سنو، تم اکیلی لڑکی ہو۔ اپنے لیے کوئی مصیبت مت کھڑی کرنا۔"

اس نے مسکرا کر سر ہلایا، پھر اسے برآمدے سے ہی خدا حافظ کہہ کر واپس آئی تو اماں کے ساتھ کھانا پکانے میں لگ گئی۔

شام میں آصف آیا تو وہ اس سے اسی طرح ملی۔ اپنے کل کے رویے کی معذرت بھی کی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ جتنی دیر وہ بیٹھا رہا۔ وہ اندر ہی اندر اپنے آپ سے لڑتی رہی تھی۔ کبھی اسے ان دنوں کا خیال آتا۔ جب اس نے کہا تھا۔

"اپنی ممی سے کہیے گا۔ زیادہ تردد نہ کریں، لڑکی ان کے اپنے گھر میں موجود ہے اور مجھے پسند بھی ہے۔"

اور کبھی شب زفاف کے آغاز پر سر سے آنچل کھینچنا، اور پھر اس رات کے اختتام پر رونمائی کی صورت ہاتھ میں آزادی کا پروانہ تھما دینا، پھر اس کی بیوی کی باتیں۔

"یہاں فلمی ڈائیلاگ بولنے کی کوشش مت کرنا، کہ میں تمہاری باندی بن کر رہوں گی وغیرہ وغیرہ۔"

اس کے اندر جوار بھاٹا اٹھتا رہا۔

"یہ سزا تمہارے لیے نہیں۔ تمہاری ماں کے لیے ہے۔"

کس قدر مشکل تھا اپنے آپ پر ضبط کرنا کہ اس کی آرزوؤں، اس کے خوابوں اور اس کی ممی کا قاتل سامنے بیٹھا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ جیسے دنیا میں اس کا سب سے بڑا ہمدرد وہی ہو، اور وہ اسے برداشت کر رہی تھی۔

پھر ہر دوسری شام اسے اسی طرح اپنے آپ پر ضبط کرنا پڑتا۔ وہ بہت خاموشی سے اس کی باتیں سنتی اور جیسا کہ عینی نے کہا تھا کہ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہو کر آیا ہے، اور اس کے ساتھ کوئی بھلائی کرنا چاہتا ہے، تو اس کی باتوں سے بھی ایسا ہی لگتا تھا۔ لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی، جو اس کی اجلی صورت کے اندر چھپے کالے من کو دیکھ چکا تھا۔ اور اب کسی طرح

بھی اس کا اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ محبت، انسانیت سب سے اس کا اعتماد اٹھ چکا تھا، اور اس کا خیال بلکہ اسے یقین تھا کہ اس کے خلوص کے پیچھے اب بھی کوئی غرض چھپی ہے، جسے جاننے کے لیے وہ اسے برداشت کرتی تھی۔

بہر حال آصف جاہ سے قطع نظر زندگی کے دوسرے معمولات میں وہ نہ صرف دلچسپی لینے لگی تھی، بلکہ اپنے آئندہ کے بارے میں بھی سوچنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا، وہ ڈلیوری کے بعد ممی کی جمع پونجی سے یا تو کوئی بوتیک کھول لے گی، یا پھر کوئی جاب تلاش کرے گی۔ بچے کے بارے میں وہ ابھی تک عینی کی بات سے متفق تھی، کہ وہ بچہ اس کے باپ یعنی آصف جاہ کے حوالے کر دے گی۔ کیونکہ اس کے باپ یعنی آصف جاہ کے حوالے کر دے گی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ اس بچے کے لیے کبھی بھی اچھی ماں نہیں بن سکے گی۔

اس وقت وہ ڈاکٹر کے پاس سے آ رہی تھی عینی اسے باہر ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی، اور وہ جیسے ہی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ دوسری طرف سے سلمان اچانک سامنے آ گیا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتے ہوئے اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تو اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اور اس کے قریب سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔

''بات سنیں۔'' چند قدم چلی تھی کہ اس نے پکار لیا۔ وہ یونہی پلٹ کر دیکھنے لگی تو وہ جو غالباً باہر جا رہا تھا۔ اس کی طرف آتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''کیا آپ آدم بے زار ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کو انسانوں سے خوف آتا ہے کیا؟''

''نہیں تو۔''

''تو پھر لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتی ہوں گی۔'' وہ قیاس کرتا ہوا بولا۔

''ایسی بھی نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے، جو آپ اتنی الگ تھلگ سی رہتی ہیں۔''

''وہ۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

''یقین کریں۔ میری بھابھی بہت اچھی ہیں۔ خوش مزاج ملنسار، مہمان نواز وغیرہ وغیرہ۔''

''میں جانتی ہوں۔'' وہ یونہی کہہ گئی۔

''آپ کیسے جانتی ہیں۔ جب کہ آپ تو ان کے پاس آتی بھی نہیں۔''

''آؤں گی۔'' وہ جلدی سے کہہ کر روش پار کر آئی۔ اور اس روز اسے احساس ہوا کہ اس نے واقعی اپنے آپ کو بہت محدود کر رکھا ہے، پھر اگلے روز سے ہی وہ دن میں جس وقت بھی فارغ ہوتی۔ بھابھی کے پاس جا بیٹھتی۔ وہ واقعی بہت اچھی خاتون تھیں۔ ہنس مکھ اور قدرے لاپرواسی۔

''کتنا عرصہ ہوا ہے آپ کی شادی کو؟'' وہ بھابھی سے پوچھنے لگی۔

''پانچ چھ سال۔''

''بچے وغیرہ نہیں ہیں۔''

''بس خدا کی مرضی۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے، وہاں نہیں، اور جہاں ضرورت نہیں۔'' وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔ غالباً اشارا اس کی طرف تھا۔ وہ اپنی جگہ پہلو بدل گئی، تب وہ کہنے لگیں۔

''میں غلط نہیں کہہ رہی، اب بھلا بتاؤ تمہاری گود بھرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب شوہر ہی نہیں رہا تو۔''

وہ پھر خاموش ہو گئیں۔ شاید اس کی آزردگی کے خیال سے قدرے توقف کے بعد تعزیتی انداز میں پوچھنے لگیں۔

''کیا ہوا تھا تمہارے شوہر کو؟''

''جی۔!'' وہ بالکل نہیں سمجھی۔

''آصف صاحب بتا رہے تھے کہ تم شادی کے مہینہ بھر بعد ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔''

''کیا۔؟'' حیرت اور تاسف کے ملے جلے احساس میں گھر کر وہ کتنی دیر تک انہیں دیکھے گئی۔ پھر جب ذرا سنبھلی تو پوچھنے لگی۔

''اور کیا کیا بتایا ہے آصف صاحب نے میرے بارے میں۔؟''

''یہی کہ شوہر کے انتقال کے بعد تم بالکل تنہا ہو گئی ہو۔''

''ہاں۔ تنہا تو میں ہو گئی ہوں۔'' اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ پھر اس سے وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ دوبارہ آنے کا کہہ کر چلی آئی۔



اب تک تو یہ تھا کہ زیادہ تر آصف ہی باتیں کرتا تھا۔ وہ سنتی تھی۔ اور اس کی جواب طلب بات پر بھی بہت مختصر جواب دیتی۔ لیکن اس روز وہ ایک دم اسے کریدنے لگی۔

''تم جو ہر دوسرے دن یہاں آتے ہو، تو تمہاری بیوی خفا نہیں ہوتی، یا اسے معلوم ہے؟''

''اسے یہ معلوم ہے کہ میں اپنے کسی دوست کے پاس جاتا ہوں۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ دوست مذکر ہے یا مؤنث۔''

''اچھا۔!'' وہ ذرا سا ہنسی۔ ''اور اگر اسے معلوم ہو جائے تب؟''

''کون بتائے گا اسے، تم۔؟'' وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''ہو سکتا ہے، میں بتا دوں۔''

''ایسا غضب مت کرنا۔ وہ پہلے بھی مجھ پر بہت شک کرتی ہے۔''

''واقعی۔!'' اس نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''لیکن کیوں میرا مطلب ہے اتنی محبت کے باوجود۔''

''ہاں، میری محبت کے باوجود اس کے دل میں یہ خوف سا گیا ہے کہ کہیں میں دوسری شادی نہ کرلوں۔''

''دوسری شادی۔!'' اس نے زیر لب دہرایا۔ پھر پوچھنے لگی ''کیا تمہارا ایسا کوئی ارادہ ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر اسے یہ خوف کیوں ہے؟'' اور آصف جاہ کو بتانا پڑا۔

''اصل میں وہ بانجھ ہو چکی ہے، اس لیے سوچتی ہے کہ کہیں میں اولاد کی خاطر دوسری شادی نہ کرلوں۔ حالانکہ میں بار بار اسے یقین دلا چکا ہوں کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔''
اس کے ذہن میں اچانک جھماکا سا ہوا، اور وہ بغور اسے دیکھنے لگی۔ جو بظاہر سرسری انداز میں کہہ رہا تھا۔

''اب اس کی خواہش ہے کہ ہم کوئی بچہ گود لے لیں، اور مجھے اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے، لیکن میں سوچتا ہوں اپنا بچہ۔''

وہ ایک دم خاموش ہو گیا، جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ وہ کوئی غلطی کرنے جا رہا

تھا۔ اور وہ بہت دنوں سے جس بات کی کھوج میں تھی، وہ جان گئی۔

''تو اصل بات یہ ہے آصف جاہ!'' اس نے دکھ سے سوچا۔ ''تمہاری ہمدردیاں، خلوص، سب اس غرض کی مرہون منت تھیں، اور میری نادانی دیکھو۔ انجانے میں اس عورت کی جھولی بھرنے جا رہی تھی۔ جس نے تمہارے ساتھ شریک ہو کر مجھے تہی دامن کیا تھا۔ اور وہ اس کا تفاخر اور معنی خیز مسکراہٹ۔

''اسے فارغ کرو، اور وہاں اسے رونمائی دینا مت بھولنا۔''

''روبی!'' وہ اچانک اسے گم سُم دیکھ کر تشویش سے بولا۔ ''کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''آں۔!'' وہ چونکی۔ اب اسے کیا بتاتی کہ اچانک اس کے وجود میں درد کی شدید لہریں اٹھنے لگی ہیں۔

''تم ٹھیک تو ہوناں!'' وہ اس کے زرد پڑتے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔

''ہاں۔ تم پلیز وہاں سے بھابھی کو بلا لاؤ۔'' اس نے کہا اور چہرا گھٹنوں میں چھپا لیا۔ تو وہ صورت حال سمجھ کر ہی جلدی سے بھابھی کو بلا لایا۔ پھر اسی وقت بھابھی اسے ہاسپٹل لے گئیں، جہاں کچھ دیر بعد ہی اس نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا تھا۔

آصف جاہ بے حد خوش تھا۔ کچھ بھی سہی، بہر حال وہ باپ بنا تھا۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ وہ اپنی اس خوشی پر شادیانے نہیں بجوا سکتا تھا، جبکہ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ ایک ایک کو بتائے، اور سب کی مبارکباد وصول کرے، خوشی بھی تو ایسی تھی، جو چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اپنے گھر میں وہ دروازے ہی سے فرح کو پکارتا ہوا آیا تھا۔ اور اس کے سامنے آنے پر اسے کندھوں سے تھام کر گول گول چکر بھی دے ڈالے۔

''کیا ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آ گئی ہے؟'' وہ اپنا آپ چھڑا کر بولی۔

''اس سے بڑھ کر۔'' وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ مستی میں گنگنایا۔

''اچھا۔!'' وہ ہنسی۔ ''سچ بتاؤ بات کیا ہے۔''

''تمہارے لیے خوشخبری ہے۔'' وہ مرد تھا۔ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ کب گھوڑے کی چال چلنی ہے اور کب پیادے کی۔

''خوشخبری۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی غالباً خود ہی قیاس کرنے لگی تھی۔ تب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتا ہوا بولا۔

"بیوقوف۔ کیا اتنے دنوں سے تم بچے کے لیے نہیں کہہ رہیں۔"

"ہاں۔" خوشی سے بھرپور چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ "کیا تم نے کسی سے بات کی ہے۔؟"

"ابھی بات تو نہیں کی لیکن۔" وہ اسی نہج پر سوچنے لگا۔

"تم نے کسی ادارے کا سوچا ہے یا۔"

"ایک منٹ۔" وہ اس کی بے صبری پر ٹوکتے ہوئے بولا۔ "تم تحمل سے میری بات سنو تو میں بتاؤں۔"

"ہاں۔" وہ خاموش ہو کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئی، تب فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس انداز سے بات کرے کہ وہ مطمئن بھی ہو جائے اور کوئی اعتراض بھی نہ اٹھائے۔

"بتاؤ ناں۔" وہ زیادہ دیر صبر نہیں کر سکی، اسے سوچتے دیکھ کر پھر بول پڑی تو وہ سنبھل کر کہنے لگا۔

"وہ ایسا ہے فرح کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے جس لڑکی سے شادی...... کی تھی۔ آج معلوم ہوا ہے کہ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔" وہ یونہی اس پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ تب وہ سٹپٹا کر بولا۔

"میں نے سوچا کہ کسی اور سے بچہ لینے کے بجائے کیوں نہ ہم اس سے بات کریں۔"

"ہاں۔!" وہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی، پھر کہنے لگی۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہارا بچہ ہے۔؟"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے ہو سکتا ہے اس کی کہیں اور شادی ہوئی ہو۔"

"بیوقوف ہو تم۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔ "اتنی جلدی دوسری شادی اور پھر بچہ کیسے ہو سکتا ہے، جبکہ مجھ سے طلاق کے بعد اسے عدت کی مدت بھی گزارنی تھی۔"

"ہاں۔" وہ سر ہلانے لگی۔

"پھر کیا خیال ہے؟"

"خیال تو برا نہیں، لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا وہ بچہ ہمیں دینے پر آمادہ ہو جائے گی۔"

"پتا نہیں۔ اگر تم کہو تو میں کوشش کر دیکھوں۔"

"کر دیکھو، بلکہ یہ زیادہ اچھا ہے۔" فرح نے کہا تو وہ یہ مرحلہ بخوبی طے کر لینے میں خاصا مطمئن ہو گیا تھا۔



"میں بچہ اس کے باپ کے حوالے کر دوں گی۔ یہ میں نے اس وقت سوچا تھا۔ جب ابھی بچہ میری گود میں نہیں آیا تھا۔ جب کہ اب مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی ہے کہ میں نے کیسے یہ بات سوچ لی تھی۔ بچے پر نظر پڑتے ہی یوں لگا، جیسے بے آب و رنگ زندگی میں اچانک ایسا خوش نما پھول کھلا ہو، جس کی آبیاری میں میں بخوشی عمر تمام کر سکتی ہوں۔ بچے کا باپ کون ہے، اور اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا، یہ ساری باتیں کہیں پس منظر میں چلی گئی تھیں۔ تخلیق کے مراحل سے گزر کر جو ایک نیا انوکھا احساس ملا تھا۔ وہ سب پر حاوی تھا۔ میں ماں بنی ہوں، اور یہ بچہ صرف میرا ہے۔" تقریباً پانچ چھ روز ہاسپٹل میں رہ کر جس روز میں گھر آئی، اسی روز عینی میرے پاس آ کر کہنے لگی۔

"بچہ آصف بھائی کو دے دو۔"

"نہیں۔" پہلے ہی مرحلے پر میرا لہجہ سخت ہو گیا۔

"میں بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔"

"لیکن اس وقت تو تم نے۔"

"اس وقت کی بات چھوڑو۔" میں فوراً ٹوک کر بولی۔

"اس وقت مجھے اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔"

"اس وقت تمہیں ہوش نہیں تھا، اور اب تم جذباتی ہو رہی ہو۔ جب کہ میں سمجھتی ہوں، تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ تم بچہ آصف کو دے دو۔"

عینی کا انداز سمجھانے والا تھا۔ میں کتنی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ میں اس پر شبہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن جیسے اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔

"ایمانداری سے بتاؤ، عینی! کیا تمہیں آصف نے کہا ہے کہ میں بچہ اسے دے

دوں۔"

"نہیں۔ اس سے تو میری ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"پھر تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟" میں نے اس پر نظریں جما کر پوچھا تو وہ کہنے لگی۔

"تمہارے لیے۔ صرف تمہارے لیے روبی!"

"میرے لیے۔"

"ہاں۔ اور تم خود سمجھ سکتی ہو۔ کہ کبھی جو تم اپنے لیے سوچنا چاہو گی، تو محض بچے کی وجہ سے نہیں سوچ پاؤ گی۔ اور تنہا زندگی گزارنا آسان نہیں ہے۔ پھر ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔" میں خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی روبی! اور یقین کرو۔ میں نے یہی ساری باتیں سوچ کر تمہیں بچہ آصف کو دینے کے لیے کہا تھا۔ اگر تمہیں برا لگا تو آئی ایم سوری۔"

"نہیں عینی! مجھے تمہاری بات بری نہیں لگتی۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

"بس یونہی مجھے خیال گزرا کہ شاید آصف نے تم سے کہا ہو۔"

"کیا آصف نے تم سے کہا ہے۔" وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔

"ابھی تو نہیں کہا، لیکن کہے گا ضرور۔" میرے یقین پر وہ چونک کر دیکھنے لگی، تو مجھے کہنا پڑا۔

"میں نے تم سے کہا تھا ناں۔ کہ وہ صرف پشیمان ہو کر میرے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ در پردہ۔ کوئی غرض ضرور چھپی ہے، تو یہی غرض ہے، عینی کہ وہ بچہ حاصل کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اس کی اپنی بیوی بانجھ ہو چکی ہے۔"

"کیا واقعی؟" عینی الجھنے لگی۔

ہاں، اور یہ بات وہ مجھے انجانے میں بتا گیا ہے۔"

قدرے توقف کے بعد میں آصف جاہ کو سوچتے ہوئے بولی۔

"آصف جاہ کے بارے میں، میں یہی کہوں گی کہ شاید زندگی میں پہلی بار اسے میرے ساتھ نیکی کرنے کا خیال آیا تھا۔ لیکن اس میں بھی وہ غرض کی ڈنڈی مار گیا۔ ہاں عینی شروع میں وہ واقعی اپنے کیے پر پشیمان تھا، اور تلافی کی غرض سے ہی اس نے میرے ساتھ یہ

سب کیا۔ پھر وہ مجھے نئے سرے سے زندہ رہنے کا ڈھنگ بھی سکھانا چاہتا تھا۔ لیکن جب اس کی بیوی بانجھ ہوئی، اور اس کے بعد اس نے کسی کا بچہ گود لینے کی خواہش کا اظہار کیا تو غالباً اسی وقت سے آصف کی نیت میں فرق آ گیا۔ اور اس نے سوچا ہوگا، کسی اور کے بجائے مجھ سے اپنا بچہ کیوں نہ لے لے، اس روز وہ مجھ سے یہ بات کہتے کہتے رہ گیا تھا۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں بھی یہی کہوں گی کہ بچہ اسے کبھی مت دینا۔" پھر تاسف سے بولی۔ "کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں، جو صرف اپنے لیے سوچتے ہیں۔ اور مجھے حیرت ہو رہی ہے آصف پر، بظاہر کتنا اجلا اجلا نظر آتا ہے۔"

"ہاں۔!" میرے اندر سے گہری سانس خارج ہوئی۔ "اس کے ظاہر سے ہی تو ہم نے دھوکا کھایا۔"

"خیر دفع کرو اسے۔ یہ بتاؤ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" عینی موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"پہلے تو میرا خیال تھا۔ میں کوئی جاب کر لوں گی، یا بوتیک کھولنے کی کوشش کروں گی۔ لیکن پھر ایک دن مجھے ڈیڈی کا خیال آیا، تو میں نے انہیں خط لکھا اور اپنے تمام حالات بتا کر ان سے مشورہ مانگا تھا، کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"پھر انہوں نے کیا کہا۔؟" میں سانس لینے کو رُکی تھی کہ وہ فوراً پوچھنے لگی۔

"پہلے تو انہوں نے خفگی کا اظہار کیا ہے کہ میں نے اتنی دیر سے انہیں کیوں بتایا۔ یعنی جب ممی کی ڈیتھ ہوئی، مجھے اسی وقت انہیں اطلاع دینی چاہیے تھی۔ بہر حال اب ان کا کہنا ہے کہ میں فوراً ان کے پاس چلی آؤں، اس کے لیے وہ خود ہی انتظام کر رہے ہیں۔ یعنی ویزا اور ٹکٹ وغیرہ کے سلسلے میں۔ بس یوں سمجھو جس روز مجھے یہ چیزیں موصول ہو گئیں، میں چلی جاؤں گی۔" اسے خاموشی سے دیکھتے پا کر مجھے کہنا پڑا۔

"میرا خیال ہے عینی! یہی مناسب ہے، جب میرے اپنے موجود ہیں، تو پھر میں کیوں اپنے آپ کو تنہا رکھوں۔"

"تمہارے لیے یہی ٹھیک ہے روبی! اس ٹینشن زدہ ماحول سے نکلو گی، تب ہی تو زندگی کو زندگی کی طرز پر گزار سکو گی۔ اور یہاں رہ کر تم لاکھ اپنے آپ کو بہت بہادر پوز کرو، پھر بھی ایک انجانا سا خوف سائے کی طرح تمہارے پیچھے لگا رہے گا۔"

"ہاں، میں نے بھی یہی سوچا ہے، اور اسی لیے میں شدت سے اپنی ٹکٹ وغیرہ کی منتظر ہوں۔"

"چلو، جہاں رہو، خوش رہو۔" عینی دعا دیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر بچے کی کاٹ کے پاس جا کر اسے پیار کیا۔ اس کے بعد سیدھی کھڑی ہوئی تو کہنے لگی۔ "ماشاء اللہ تمہارا بچہ بہت پیارا ہے۔"

"تمہارے آنگن میں ایسا چاند کب اتر رہا ہے۔؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"زیادہ دن نہیں ہیں۔ میرا سراپا نہیں دیکھ رہیں، اور پتا ہے، بلال کہتے ہیں، میں کوئی عجیب وغریب مخلوق نظر آنے لگی ہوں۔" میں ہنس پڑی، پھر اسے برآمدے تک چھوڑ کر واپس اندر آ گئی۔

پھر ٹکٹ وغیرہ سے پہلے مجھے کافی کام نمٹانے تھے۔ جو کچھ سامان میرے پاس تھا۔ وہ میں نے ایک کمرے میں رکھوا کر کمرہ لاک کر دیا۔ اماں کے بارے میں، میں نے بھابھی سے پوچھ لیا کہ اگر انہیں کل وقتی ملازمہ کی ضرورت ہو تو وہ اماں کو رکھ لیں۔ یوں بھابھی نے آمادگی ظاہر کر کے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ پھر بھابھی سے میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میرے جانے کے بعد وہ پورا گھر استعمال کر سکتی ہیں۔ کرائے کے لیے میں نے انہیں اپنا اکاؤنٹ نمبر دے دیا۔ کہ وہ ہر ماہ کرایہ اس میں جمع کروا دیں گی۔

اس روز میں بچے کے نام کا اندراج پاسپورٹ میں کروا کے آ رہی تھی، کہ راستے میں سلمان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی عجیب آدمی تھا، میں جتنا کترا کر نکلنا چاہتی وہ دھڑتے سے پکار لیتا۔

"جی۔!" اس کے پکارنے پر میں رک کر دیکھنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہیں؟"

"گھر۔"

"چلیے، میں بھی اسی طرح جا رہا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تو میں محض بحث وتکرار سے بچنے کی خاطر بیٹھ گئی۔

"یہاں کس کام سے آئی تھیں؟" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"پاسپورٹ پر بچے کا نام لکھوانا تھا۔"

"کہیں جا رہی ہیں کیا۔؟"

"جی۔ اپنے ڈیڈی کے پاس کینیڈا۔"

"اچھا۔" وہ پتا نہیں کیوں خوش ہوا تھا۔ پھر گھر کے سامنے گاڑی روکی۔ تو میں شکریہ کہہ کر جلدی سے اتر کر اس سے پہلے اندر چلی آئی۔ بچے کے ساتھ اماں بھی سو رہی تھیں۔ میں نے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا، اور کچن میں آ کر خود ہی کھانا گرم کر کے نکالا، اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگی، کھانے سے فارغ ہو کر چائے کا پانی چولہے پر رکھا ہی تھا کہ آصف آ گیا۔ مجھے اس کی آمد سخت ناگوار گزری۔ لیکن ابھی کیونکہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین نہیں ہوا تھا۔ مجھے جبراً اسے برداشت کرنا پڑا۔

"بیٹھو، چائے پیو گے؟" میں نے اسٹول کی طرف اشارا کیا۔ تو وہ وہیں بیٹھ گیا۔ پھر میرے تھکے تھکے چہرے پر نظر ڈال کر پوچھنے لگا۔

"کہیں گئی تھیں؟"

"ہاں، پاسپورٹ آفس گئی تھی، اور بہت جلد ڈیڈی کے پاس کینیڈا جانے والی ہوں۔"

"بچہ بھی تمہارے ساتھ جائے گا؟" اس نے بوکھلا کر پوچھا، اور میں نے محظوظ ہو کر جواب دیا۔

"ظاہر ہے، یہاں بچے کو چھوڑنے کا سوال کیا؟"

"ہاں۔!" وہ اپنی بوکھلاہٹ پر خجل سا ہوا، پھر سنبھل کر بولا۔ "ویسے اکثر لوگ بچوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے، لو چائے پیو۔" میں نے مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ اچانک تم نے کینیڈا جانے کا فیصلہ کیسے کر لیا؟" اس نے ایک دو سپ لینے کے بعد پوچھا۔

"بس، میں نے ڈیڈی کو اپنی تنہائی کے بارے میں لکھا تھا۔ انہوں نے کہا میرے پاس آ جاؤ۔" میں نے سرسری انداز میں بتایا۔

"یہاں تم تنہا تو نہیں ہو۔ میرا مطلب ہے عینی بھابھی اور بلال، پھر میں بھی ہر [illegible]ے دن آ جاتا ہوں۔"

''اس کے باوجود میں جانا چاہتی ہوں۔'' میرے حتمی انداز پر وہ کتنی دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

''یہاں گرمی ہے، آؤ باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''ہاں چلو۔'' میں نے دونوں مگ دھو کر ریک پر رکھے، پھر اس کے ساتھ لاؤنج میں آ بیٹھی۔

''بچہ کہاں ہے؟ اور اماں۔!''

''میں آئی تو دونوں سو رہے تھے، میں نے اٹھایا نہیں۔''

''تم کہاں گئی تھیں۔؟''

''پاسپورٹ آفس۔ بچے کے نام کا اندراج کروانا تھا۔'' میں قصداً اس موضوع کی طرف آئی تھی۔

''تو واقعی تم جا رہی ہو؟'' اس کی اضطراری کیفیت مجھ سے چھپی نہیں تھی۔

''تمہارا کیا مطلب ہے، میں مذاق کر رہی ہوں؟''

''لیکن وہاں جا کر تم کرو گی کیا؟''

''یہاں کیا کر رہی ہوں؟'' میں نے اس سے پوچھا، اس کی بے بسی پر مجھے بہت مزا آ رہا تھا۔

''کوشش کرو تو بہت کچھ کر سکتی ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جتنا عرصہ تمہیں وہاں کے ماحول کو سمجھنے اور پھر ایڈجسٹ ہونے میں لگے گا۔ اتنے عرصے میں تو تم یہاں۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔'' اس کے باوجود میں پھر یہی کہوں گی، کہ میں جانا چاہتی ہوں۔ اس لیے کہ میں یہاں زیادہ عرصہ تک صرف دوستوں کے سہارے نہیں رہ سکتی۔ عینی ابھی کچھ آزاد سی ہے، اس لیے اکثر میرے پاس آ جاتی ہے، لیکن جب وہ بچوں میں گھر جائے گی تو اسے شاذو نادر ہی میرا خیال آیا کرے گا۔ اور تم کب تک اپنی بیوی سے چھپاؤ گے۔ جس روز اسے پتا چل گیا کہ ہر دوسرے دن تم اپنے جس دوست کے پاس جاتے ہو، وہ مذکر نہیں مونث ہے تو وہ تم پر پہرے بٹھا دے گی۔''

قدرے توقف کے بعد میں سوچ کر بولی۔

''پھر یہ تو نہیں ہے کہ میری زندگی کی ناؤ اب اسی دھارے پر بہتی چلی جائے گی۔

یعنی صرف میں اور بچہ۔

نہیں آصف! میں بچے کو کمزوری اور مجبوری بنا کر خود پر زندگی کے راستے تنگ نہیں کروں گی۔ اسی لیے میں بچے کو لے کر جا رہی ہوں تا کہ وہ ڈیڈی اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ مانوس ہو جائے۔ اور کبھی جو میں اپنے لیے کوئی دوسری راہ منتخب کروں تو وہ محسوس نہ کرے۔''

میں خاموش ہوئی تو وہ بولنے کی کوشش کرنے لگا۔ پتا نہیں وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا، یا الفاظ کے ساتھ نہیں دے رہے تھے، بہر حال میں جانتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ پھر بھی اس کے منہ سے سننے کے لیے منتظر بیٹھی رہی۔

''ایک بات کہوں روبی!'' کافی تاخیر سے وہ بول پایا۔

''کہو۔'' میں بظاہر بہت سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ابھی تم نے کہا ہے کہ تم بچے کو کمزوری اور مجبوری بنا کر خود پر زندگی کے راستے تنگ نہیں کرنا چاہتیں۔ اس کا مطلب ہے، تم بچے کو پاؤں کی زنجیر سمجھتی ہو، یا راہ کی رکاوٹ، اگر ایسی بات ہے تو اسے مجھے دے دو۔''

''کیا۔؟'' میں نے قصداً حلق سے حیرت نما چیخ نکالی۔ کیونکہ اس کی بات غیر متوقع نہیں تھی۔

''میری بات کا برا ماننے کے بجائے سنجیدگی سے سنو!'' وہ عاجزی سے بولا۔'' آخر تم اسے اپنے ڈیڈی کے پاس بھی تو چھوڑ گی، اور ان کے بارے میں، میں یہی کہوں گا کہ جب انہیں تمہارا خیال نہیں رہا تو تمہارے بچے کا کیا خیال کریں گے۔''

''اور تم اپنے بارے میں کیا کہو گے؟'' میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ سٹپٹا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

''تم جانتی ہو، ہماری اولاد نہیں ہے، اور ہو گی بھی نہیں۔ ایسے میں اگر تم بچہ میری گود میں ڈال دو گی تو۔''

''نہیں آصف۔'' میں نے فوراً ٹوک دیا۔'' یہ ممکن نہیں ہے۔''

''میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ لیکن پلیز تم سوچنا ضرور۔ یقین کرو، میں بچے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔ اسے کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ بولتا چلا گیا۔

میں بچے کے لیے یہ کروں گا، وہ کروں گا۔ اور میں چپ چاپ اسے دیکھے گئی عجیب دیوانہ سا لگ رہا تھا۔

میں اسے بانہوں کے جھولے میں سلاؤں گا۔

میں اسے اچھے اسکول میں پڑھاؤں گا۔

اور جب بڑا ہوگا تو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھیجوں گا۔

میرا سب کچھ۔ سب کچھ اسی کا ہوگا۔ اسی کا ہے بچے کا۔ میرے اپنے بچے کا۔'' وہ اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔

''خدا کے لیے روبی میرا بچہ دے دو۔'' اس کی حالت بالکل ایسی لگ رہی تھی، جیسے کسی ہیروئن کے عادی کو فوری ڈوز نہ ملے۔ اور یہ میں تھی رباب علی۔ پتا نہیں اتنے ستم سہہ کر بھی دل اسی طرح موم کیوں تھا۔ پتھر کیوں نہیں ہوگیا تھا۔

''بس کرو آصف جاہ!'' میں نے اسے بولنے سے روکا، اور اٹھ کر اندر چلی آئی۔ اماں بچے کے کپڑے بدل رہی تھیں۔ میں نے اسی طرح بچے کو اپنی آغوش میں بھرلیا، اور ان سے کہا۔

''اماں، باہر آصف بیٹھے ہیں۔ ان سے کہیے چلے جائیں۔'' اماں اٹھ کر چلی گئیں، تو میں بچے میں مصروف ہوگئی۔



پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ آصف اس دن کے بعد سے پھر نہیں آیا۔ مجھے اس کا انتظار تو نہیں تھا۔ لیکن شاید میں اس کی ہر دوسرے دن کی آمد کی عادی ہوگئی تھی۔ جبھی اس کی غیر حاضری کو محسوس کر رہی تھی۔ پھر اماں بھی صبح شام اس کے بارے میں پوچھتی تھیں کہ وہ اچانک کہاں چلا گیا ہے۔ اس روز تو وہ باقاعدہ اس کے بارے میں کرید کرید کر پوچھنے لگیں۔ تب میں اکتا کر بھابھی کی طرف چلی آئی۔

''لگتا ہے، بچے نے تمہیں بہت مصروف کر دیا ہے۔'' وہ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

''بس، کچھ ایسا ہی ہے۔'' مگر آپ کے ساتھ تو ایسی کوئی مصروفیت نہیں ہے، پھر بھی آپ نہیں آتیں۔'' میں نے جواباً شکوہ کیا تو وہ مسکرا کر بولیں۔

''بڑے بچوں کی مصروفیات کم ہیں کیا؟''

''میرے میاں اور دیور۔'' ان کی وضاحت پر میں ہنس پڑی۔

''تمہارے باہر جانے کا کیا ہوا؟'' ان کے پوچھنے پر میں نے بتایا۔

''کل ڈیڈی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کاغذات بھیج دیے ہیں۔ اب دیکھیں، یہاں مجھے کب ملتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، اب تم کچھ دنوں کی مہمان ہو۔''

''جی۔''

''چلو، اچھا ہے۔ تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ گی۔ ویسے ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گی۔'' انہوں نے کہا تو میں نفی میں سر ہلا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''دیکھو۔ تم میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہو۔ اس لیے میں تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ زندگی کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا عقل مندی نہیں ہوتی۔ تم اگر بچے کی ماں بن گئی ہو تو یہ سوچ کر مت بیٹھ جانا کہ تم نے اپنی زندگی میں جو کرنا تھا کرلیا، جو پانا تھا پالیا۔ نہیں ابھی پانے کے لیے بہت کچھ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بچے کے لیے ماں اپنی تمام آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیتی ہے لیکن اس سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ خصوصاً آج کے دور میں تو کچھ بھی نہیں۔ ابھی دیکھو خون کیسے سفید ہوگئے ہیں۔ رشتوں کی پہچان مٹ گئی ہے، تو سوچو بیس سال بعد کیا ہو گا۔ تم پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہو۔ سمجھ سکتی ہو کہ اس معاشرے میں تنہا عورت کا کیا مقام ہے۔ لوگ بیوہ سمجھ کر منہ پر ہمدردی ضرور کرتے ہیں لیکن۔''

''میں بیوہ نہیں ہوں۔'' بلاارادہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''کیا۔؟'' ان کے متعجب ہونے پر میں چہرا ہاتھوں میں چھپا کر رو پڑی۔

''ارے ارے۔'' انہوں نے مجھے رونے سے باز رکھنا چاہا۔ لیکن میں روتی چلی گئی۔ گزشتہ کئی دنوں سے دل بوجھل ہو رہا تھا، اور شاید رونے کو بہانا بھی ڈھونڈ رہا تھا۔ گو کہ مجھے رونے کے لیے بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں کون تھا سبب پوچھنے والا۔ لیکن شاید مجھے ایک مہربان کاندھے کی ضرورت تھی۔ بھابھی نے میرا سر اپنے کندھے سے لگایا۔ تو میں نے سارے آنسو بہا ڈالے۔ یہاں تک کہ آنکھیں خالی ہوگئیں۔ تب بھابھی اٹھ کر میرے لیے پانی لے آئیں۔ اور اپنے ہاتھ سے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔'' گلاس خالی کر کے میں قدرے نارمل ہو کر

بولی۔ تو انہوں نے ایک بار پھر مجھے گلے لگالیا۔ پھر میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولیں۔

''اب بتاؤ، قصہ کیا ہے؟ کہاں ہے تمہارا شوہر؟''

''وہ میرا شوہر نہیں ہے، اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔'' پھر میں نے انہیں اپنی ساری کہانی کہہ سنائی۔ اس دوران وہ متحیر سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ آخر میں جب میں نے انہیں بتایا کہ آصف اب چاہ رہا ہے کہ میں بچہ اسے دے دوں، تو وہ ایک دم جذباتی ہو کر بولیں۔

''اس کی یہ جرأت، تمہیں چاہیے تھا اسی وقت اس کا منہ توڑ دیتیں۔ وقت کی لگامیں اب تمہارے ہاتھ میں ہیں روبی، اور اس سے بڑھ کر انتقام اور کیا ہوگا، کہ تم ساری زندگی اس بچے کی صورت مت دکھانا۔''

''اوں ہوں۔'' یہ آواز میرے عقب سے آئی تھی۔ میں نے فوراً گردن گھما کر دیکھا۔ سلمان جانے کب یہاں آ کھڑا ہوا تھا۔ اور میں یہ سوچ کر کہ کہیں اس نے میری ساری باتیں تو نہیں سن لیں، خجل سی ہوگئی، اور وہ سامنے آتے ہوئے بھابھی سے بولا۔

''عورتیں واقعی بہت جذباتی ہوتی ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' بھابھی اسے گھورنے لگیں۔

''یہ کیا سبق پڑھا رہی ہیں آپ انہیں؟''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔''

''آپ بالکل بھی ٹھیک نہیں کہہ رہیں۔'' وہ انہی کے انداز میں بولا۔ پھر مجھے مخاطب کر کے پوچھنے لگا۔

''آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''پتا نہیں۔'' میں نے سچ مچ اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کیا۔

''کم از کم آپ یہ تو ضرور چاہتی ہوں گی، کہ آصف جاہ ہمیشہ کے لیے آپ کی زندگی سے نکل جائے۔''

''ہاں، ایسا میں چاہتی ہوں۔'' میں نے اس کی تائید کی تو وہ سامنے صوفے پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اسے معاف کر دیں۔ یقین کریں۔ زندگی

بھر کے لیے پرسکون ہو جائیں گی۔ جب کہ وہ احساس جرم میں گرفتار ہو کر ہمیشہ خود کو ملامت کرتا رہے گا، اور یہی سزا اس کے لیے بہت ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے یہ اپنا بچہ اس کے حوال کر دے۔'' بھابھی تنک کر بولیں

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ یہ ان پر منحصر ہے، ویسے اس موقع پر مجھے ایک حدیث یاد آ رہی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔'' تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرنے والے نہ بنو کہ کہنے لگو اگر اور لوگ احسان کریں گے، تو ہم بھی احسان کریں گے، اور اگر دوسرے لوگ ظلم و جبر کا رویہ اختیار کریں گے تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے، بلکہ اپنے دلوں کو اس پر پکا کر لو کہ اگر اور لوگ احسان کریں، تب تم بھی احسان کرو، اور اگر اور لوگ برا سلوک کریں، تب بھی تم ظلم و بربریت سے بچو، بلکہ احسان و مروت کرو۔''

میں ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ اور وہ کہنے لگا۔

''ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم معاف کرنا جانتے ہی نہیں۔ جب ہی نفرتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ذرا سوچیں ابتدا کہاں سے ہوئی۔ اگر غور کریں تو آپ کی ممی سے کوئی اتنی بڑی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن خمیازہ آپ کو بھگتنا پڑا۔ اسی طرح سلسلہ جاری رہا تو نسلوں تک چلے گا۔ اس کے برعکس ایک ذرا سی معافی سارے قصے کو یہیں ختم کر دے گی۔''

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جاتے جاتے کہنے لگا۔

''تم اچھی لڑکی ہو، اپنا ظرف بڑا کر لو۔ اور یقین رکھو، اب جس راستے پر بھی قدم رکھو گی، سچی خوشیوں کے ننھے منے چراغ تمہیں اپنی راہوں میں ملیں گے۔''

میری نظروں نے بہت خاموشی سے اس کا تعاقب کیا تھا۔



جیسے ہی مجھے ڈیڈی کی طرف سے کاغذات موصول ہوئے۔ میں نے پاسپورٹ پر ویزا لگوانے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ مجھے زیادہ معلومات نہیں تھیں، اس لیے ہر کام بہت مشکل لگ رہا تھا۔ انہی دنوں عینی کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی تھی، اس لیے وہ میرا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔ اور گو کہ بھابھی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر کوئی پرابلم ہو تو میں ان سے کہوں، وہ سلمان سے کہہ کر سب کام کروا دیں گی، اور بارہا مجھے خیال بھی آیا۔ لیکن پھر میں نے سوچا، مجھے زندگی کی دشواریوں کو یہیں سے سمجھ لینا چاہیے۔ آخر میں کب تک دوسروں کا

سہارا ڈھونڈتی رہوں گی۔

بہر حال ہفتہ دس دن کے بعد میرے کاغذات مکمل ہو گئے، اب یہاں مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ اس لیے اگلا پورا دن میں نے عینی کے ساتھ گزارا۔ وہ بلاشبہ ایسی دوست تھی، جسے زندگی میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں اس کی مقروض تھی۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ کبھی اس کا قرض نہیں اتار سکوں گی۔ اس سے رخصت ہوتے وقت میں بے اختیار رو دی تھی، اور آنکھیں تو اس کی بھی چھلکی تھیں۔ پھر بھی وہ مجھے ٹوکنے لگی۔

"بیوقوف نئی زندگی کی ابتداء میں رویا نہیں کرتے۔"

"نئی زندگی۔"

"ہاں، اب تمہیں نئی امنگوں کے ساتھ جینا ہے اور بہت حوصلے سے، سمجھیں تم۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو پلکوں پر اٹکے موتی پھوار کی صورت برسنے لگے۔

پھر اگلا سارا دن پیکنگ میں گزر گیا۔ رات میں اطمینان سے بیٹھی تو کچھ دیر اماں کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی، اور جب وہ بھی سونے کے لیے چلی گئیں، تب ایک دم تنہا ہو گئی۔ یہ اس گھر بلکہ اس دیس میں میری آخری رات تھی، اور میں نہیں جانتی تھی کہ دوبارہ یہاں آؤں گی یا نہیں۔

میں اسی گھر میں پیدا ہوئی، یہیں پلی بڑھی تھی، اور یہ فطری بات تھی کہ اب جب یہاں سے جا رہی تھی تو گزرے ماہ و سال کا ہر پل نگاہوں میں آ سمایا تھا۔ اسی گھر میں، میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال ممی اور ڈیڈی کے ساتھ بہت خوش و خرم اور بے فکری سے گزارے تھے، پھر ڈیڈی کینڈا چلے گئے تو اس کے بعد پھر کبھی ویسی خوشیوں کے قافلے اس گھر میں نہیں اترے تھے۔ گو کہ ممی نے اپنے آپ کو بہت سنبھال لیا تھا۔ اور مجھے بھی انہوں نے کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ پھر بھی ایک خلا ہمیشہ رہا۔ پتا نہیں ممی محسوس کرتی تھیں، یا نہیں، کیونکہ انہوں نے مجھ پر کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ لیکن میں نے ہر مقام پر ڈیڈی کو مس کیا۔

اسکول جاتے ہوئے۔

ہر امتحان میں کامیابی پر۔

اپنی برتھ ڈے پر، اور جب بھی تنہا بیٹھی ان ہی کا خیال آتا تھا۔ اور خصوصاً کسی بھی غیر متوقع بات پر میں سوچا کرتی تھی۔ اگر ڈیڈی یہاں ہوتے تو یوں ہوتا اور یوں نہ ہوتا وغیرہ

وغیرہ۔ اور جب ہر بات اور کاش سے شروع ہو کر ایک حسرت ناک آہ پر ختم ہو تو انسان اندر ہی اندر ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ تو ہر طرف کانچ ہی کانچ تھے، ٹوٹے کانچ۔ جن کی چبھن روح تک میں اتری تھی۔ اور پھر وہی بات۔

"اگر ڈیڈی یہاں ہوتے تو میرے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔"

"میرے خدا۔ خودترسی کتنی اذیت دیتی ہے اور میں یہ اذیت سہہ رہی تھی۔"

"اس تمام عرصے میں میں نے کیا پایا؟" شاید میں نے خود سے سوال کیا تھا، اور آپ ہی آپ میری نظریں بھٹکتی ہوئی کاٹ پر جا ٹھہریں، جس میں بچہ بے خبر سو رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ آئی اور سوئے ہوئے بچے کو اٹھا کر بازوؤں میں بھینچ لیا۔ غالباً بچہ نیند خراب ہونے پر کسمسا کر رویا تھا۔ لیکن مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر ٹوٹے کانچ اسے چھو گئے ہوں۔

"میری جان۔!" میں نے جلدی سے اسے تکیے پر لٹایا، اور ہر جگہ سے چھو کر دیکھنے لگی۔

"کاش، میرے ڈیڈی یہاں ہوتے۔"

"اگر ڈیڈی۔" یہ میری نہیں، بچے کی آواز تھی۔ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"تو کیا میری طرح یہ بھی۔" میں نے سوچنا چاہا لیکن میرا نفی میں ہلتا چلا گیا۔

"خدا کے لیے روبی، میرا بچہ مجھے دے دو۔" آصف جاہ فریاد کر رہا تھا۔

"نہیں۔" چیخیں میرے اندر ہی کہیں دب گئیں۔

"اوں ہوں۔" یہاں کون تھا، جو مجھے نئی راہ دکھا رہا تھا۔

"اور اگر اور لوگ برا سلوک کریں، تب بھی تم احسان کرو۔"

"ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم معاف کرنا جانتے ہی نہیں، جبھی نفرتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔"

"بس کرو۔" میں رو پڑی۔ "زندگی کی اندھیر نگری میں ایک یہی چراغ ہے، اسے بھی دوسرے کی جھولی میں ڈال دوں۔"

"ہاں۔!" کتنے اطمینان سے کہا گیا۔ "تم اپنا ظرف بڑا کر لو، اور یقین رکھو۔ اب جس راستے پر بھی قدم رکھو گی، سچی خوشیوں کے ننھے منے چراغ تمہیں اپنی راہوں میں ملیں گے۔"

میں نے بے بسی سے بچے کے ساتھ تکیے پر سر رکھا اور سوگئی۔

میری فلائیٹ چار بجے تھی، اور وقت گزر کے نہیں دے رہا تھا۔ جب کہ میں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ میرے اندر عجیب سی بے کلی آسمائی تھی۔ میر وقت گزاری کے لیے بھابھی کی طرف آئی تو وہ پتا نہیں کن کاموں میں مصروف تھیں۔ کبھی اس کمرے میں کبھی اس کمرے میں، کبھی کچن کی طرف دوڑتیں، مجھے اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس ہونے لگا۔ تو میں کھڑے کھڑے انہیں الوداعی کلمات کہہ کر واپس آ گئی۔ اماں سے دوپہر کے کھانے کا پوچھ کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی، کہ پیچھے سے آصف جاہ کی آواز آئی۔

''سنو روبی!'' میں فوراً پلٹی اور آصف جاہ کے ساتھ فرح کو دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔

''تم آج جا رہی ہو؟ وہ فرح کو ساتھ لے کر آگے آتے ہوئے میں پوچھنا چاہتی تھی، تمہیں کیسے معلوم ہوا، لیکن پتا نہیں میری آواز کہاں کھو گئی تھی۔

''سنو۔'' اس کے اشارے پر فرح میرے قریب چلی آئی۔ ''ہم کسی اچھے سلوک کے مستحق تو نہیں ہیں، پھر بھی اگر تم ہمیں معاف کر دو تو۔''

''تم ہمیں دھکے دے کر نکالنے کا حق رکھتی ہو، لیکن اس سے پہلے مجھے اپنے بچے کو سینے سے لگا لینے دو۔''

آصف عاجزی سے بولا۔ اور وہ اس کی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''ہم تمہارے پاس بڑی امید لے کر آئے ہیں روبی! یہ بچہ ہماری جھولی میں ڈال دو۔''

''خدا کے لیے ہمیں مایوس مت کرنا۔''

''یقین کرو۔ میں اسے تم سے بڑھ کر چاہوں گی۔''

وہ دونوں منت کر رہے تھے، اور میرا ذہن بھٹکنے لگا۔ یہ وہی عورت تھی جس کے لہجے میں تمسخر تھا۔

''اب یہاں فلمی ڈائیلاگ بولنے کی کوشش مت کرنا، کہ میں تمہاری باندی بن کے رہوں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''کیا میں اس کے الفاظ اسے لوٹا دوں۔'' میں نے سوچا۔

''اوں ہوں۔'' پھر وہی آواز۔ ''اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اسے معاف کر دیں۔ یقین کریں زندگی بھر کے لیے پرسکون ہو جائیں گی۔ جب کہ وہ احساس جرم میں گرفتار ہو کر ہمیشہ خود کو ملامت کرتے رہیں گے، اور یہی سزا ان کے لیے بہت ہے۔''

''ہم پہ یہ احسان کر دو روبی!'' وہ گڑگڑا رہے تھے۔

''اور اگر اور لوگ برا سلوک کریں، تب بھی تم احسان کرو۔''

''میں کیا کروں۔؟'' میں نے انتہائی دکھ سے سوچا اور بے خیالی میں بچے کو زور سے سینے میں بھینچا، تو وہ رونے لگا۔ شاید میرے اندر ٹوٹے کانچ پھر اس کی نرم جلد کو چھو گئے تھے۔

''ایک ذرا سی معافی سارے قصے کو یہیں ختم کر دے گی۔'' کوئی دھیرے دھیرے مجھے اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ ''اپنا ظرف بڑا کر لو۔''

''میں نے تمہیں معاف کیا آصف جاہ! اور تمہاری شریک حیات کو بھی۔''

میرے ہونٹوں سے الفاظ ٹوٹ کر نکلے۔ تو وہ دونوں اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ شاید جی جان سے منتظر تھے کہ میں آگے کیا کہتی ہوں۔ اور میں کیا کہتی۔ اپنی بات کو سچ ثابت کرتے ہوئے بہت خاموشی سے اپنا بچہ اس عورت کی جھولی میں ڈال دیا۔ جس نے اپنے گھر میں مجھے ایک رات سے زیادہ برداشت نہیں کیا تھا۔

صبح سے وقت ٹھہرا ہوا لگ رہا تھا۔ اور اب جبکہ میں اسے روکنا چاہتی تھی، تو گھنٹے بھی جیسے سیکنڈوں میں بدل گئے تھے۔ ایرپورٹ پر مجھے خدا حافظ کہنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بھی نہیں، جن کی اندھیر نگری کو میں اپنا چراغ بخش آئی تھی۔ اور وہ بھی نہیں، جس نے مجھے معافی کا سبق پڑھایا تھا۔ بہر حال تمام مراحل سے گزر کر جب میں ایر ہوسٹس کی راہنمائی میں اپنی سیٹ پر بیٹھی تو بے حد آزردہ تھی۔ میرا دل پھوٹ پھوٹ رونے کو چاہ رہا تھا۔ بمشکل خود پر ضبط کے پہرے بٹھا کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ جہاز رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ اور ہر شے بہت پیچھے رہ جانے کے خیال سے میری آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی اتر آئی، جس نے پلکوں تک کو گیلا کر دیا۔ اسی وقت جہاز زمین سے ناتا توڑ کر فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ تو میں سیدھی ہو بیٹھی اور پلکوں کی نمی انگلیوں پر سمیٹ رہی تھی۔ کہ قریب سے ٹوکا گیا۔

''اوں ہوں۔!'' میں نے فوراً دیکھا تو وہ ہلکے سے مسکرایا۔

''سفر کی ابتدا پر روتے نہیں ہیں۔'' میں خاموش رہی تو پوچھنے لگا۔

''بچہ کہاں ہے؟''

''اپنے باپ کے پاس۔'' میرا انداز جتانے والا تھا۔ اور وہ سمجھ کر بولا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ بچہ اسے دے دیں۔''

''میں نے خود دے دیا ہے۔''

''کیوں؟''

''ظرف جو بڑا کر لیا تھا۔ وہ سوالی بن کر آئے تھے، خالی لوٹانا اچھا نہیں لگا۔''

وہ مجھ پر سے نظریں ہٹانا بھول گیا، اور میں نے آنکھوں کو چھلکنے سے روکنے کی خاطر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

''سنو۔!'' خاصی تاخیر سے وہ بولا۔ ''معافی اور احسان اچھا عمل ہے، پھر تم آزردہ کیوں ہو۔''

''میں آزردہ نہیں ہوں۔''

''تو پھر آنسو پونچھ لو۔ میں تمہیں نئی زندگی کی نوید دینا چاہتا ہوں۔'' میں نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا، تو وہ قدرے سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

''میں دو سال کی ٹریننگ کے لیے کینیڈا جا رہا ہوں، اور یہی عرصہ میں تمہیں سوچنے کے لیے دے رہا ہوں۔'' اس عرصے میں تم میرے بارے میں ہر پہلو سے سوچ سکتی ہو۔''

''نہیں۔'' میں اس پر سے نظریں ہٹا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

''کیا نہیں۔؟''

''مجھے کچھ نہیں سوچنا۔''

''تمہاری مرضی۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن یہ طے ہے کہ ٹریننگ مکمل ہوتے ہی واپسی سے پہلے میں تمہارے دروازے پر دستک ضرور دوں گا۔'' وہ قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اب تم جس راستے پر بھی قدم رکھو گی۔ سچی خوشیوں کے ننھے منے چراغ تمہیں اپنی راہوں میں ملیں گے۔ تو میں نے غلط نہیں کہا تھا، خود ہی سوچو۔ تم

نے اپنے چراغ سے دوسرے کے گھر کو اجالا بخشا ہے۔ تو کیسے ممکن ہے کہ بدلے میں تمہاری راہیں اندھیری رہیں۔ تو اے میری ہمسفر تمہارے راستے میں پہلا چراغ میں رکھ رہا ہوں، اپنی محبت کا۔ کیا تمہیں اپنے آس پاس اجالے اترتے محسوس نہیں ہو رہے۔'' میں اس کی روشن آنکھوں میں بس ایک پل کو دیکھ سکی۔

''اوں ہوں۔ منہ مت موڑو، میں تمہاری کیفیت کو جانتا ہوں، تمہاری آزردگی محسوس کرتا ہوں، اور میں یہ نہیں کہہ رہا کہ جو کچھ تم پیچھے چھوڑ آئی ہو۔ اسے دل سے نکال پھینکو۔ نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نئی حقیقتوں کو بھی قبول کرو۔ یہ یاد رکھو کہ انسان نہ تو صرف ماضی میں رہ سکتا ہے اور نہ ہی حال میں مست ہو کر ماضی کو فراموش کر سکتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں۔''

اس نے کچھ دیر خاموش رہ کر میرے جواب کا انتظار کیا، پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''بہرحال میں سمجھتا ہوں۔ دو سال بہت ہوتے ہیں اس عرصے میں تم اس قابل ضرور ہو جاؤ گی، کہ اپنے آس پاس اترتے اجالوں کو محسوس کر سکو۔ اور میں چاہوں گا کہ نئے اجالوں میں سب سے پہلے تمہاری نظر جس شخص پر پڑے، وہ میں ہوں۔ میں سلمان احمد۔''

وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا تو میں ذرا سا سر ہلا کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک یہ احساس نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ اور اب سفید اور سرمئی بادلوں کو دیکھ کر اچانک یہ احساس جاگا کہ میں کتنی بلندیوں پر پرواز کر رہی ہوں۔



محبتوں کے ہی درمیان

"اٹھیں مسعود بھائی! دوا پی لیں۔" اس نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے کہا تو مسعود آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"جلدی اٹھیں، مجھے اور بھی کام ہیں۔" وہ پانی کا گلاس اور دوا کی شیشی لیے اس کے بیڈ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"اتنے سارے کاموں میں تمہیں یہ ایک کام کیسے یاد رہ جاتا ہے۔"

وہ کہنیوں پر وزن ڈال کر ذرا سا اونچا ہوا، پھر پیچھے کھسک کر تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

"کون سا کام؟"

"مجھے دوا دینے کا، وہ بھی وقت پر۔ میرا خیال ہے اس پوری دنیا میں تمہیں کوئی کام اتنی پابندی سے وقت پر نہیں ہوا ہوگا، جتنی پابندی سے تم مجھے دوا دیتی ہو۔" اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر ایک گھونٹ پینے کے بعد کہنے لگا۔

"یا تو تم صرف اس ایک کام پر مامور ہوتیں، تب تو بات بھی تھی، لیکن یہاں تو عالم یہ ہے کہ گھر کا سارا کام۔"

"گھر کا کام کوئی اتنا زیادہ تو نہیں ہوتا۔" وہ فوراً بول پڑی اور کپ میں دوا ڈال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"پھر بھی آخر کو انسان ہو، بھول بھی سکتی ہو۔"

"میں سب کچھ بھول سکتی ہوں۔" یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی، لیکن ایک ہی کام نہیں بھول سکتی۔" وہ کہہ رہی تھی اور ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

"سمیعہ! تم مسعود کا ہر طرح سے خیال رکھنا۔ خاص طور سے دوا کی طرف سے کبھی لاپروائی نہ ہو۔"

"میں کبھی لاپروائی نہیں کروں گی احسن بھائی!" اس نے وعدہ کیا تھا۔

"کیوں؟" مسعود نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ گلاس اور کپ اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پر رکھے، پھر بڑے خلوص سے کہنے لگی۔

"تاکہ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں۔"

"تم کیا سمجھتی ہو، یہ دوائیں مجھے اچھا کر دیں گی۔

بے وقوف! دوا تو اس وقت سے میرے منہ کو لگی ہے جب ابھی تم پیدا بھی نہیں ہوئی ہو گی، اگر ان میں میرے لیے شفا ہوتی، تو میں کب کا ٹھیک ہو گیا ہوتا۔"

"آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"اچھا!" وہ ہنسا، پھر بیڈ کی پٹی پر سر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم نے کبھی بجھتے دیے کو دیکھا ہے، جسے کچھ دیر اور روشن رکھنے کی خاطر ہاتھ کی اوٹ میں لے لیا جاتا ہے، میں اسی دیے کی مانند ہوں۔"

"مسعود بھائی!" وہ اس کے افسردہ اور مایوس لہجے سے ڈر گئی۔

"آپ جانتے ہیں، ہم سب آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔"

"ہاں اور تم سب کی محبتیں ہی تو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔" اس نے ذرا سی گردن موڑی اور اس کے ڈرے ہوئے زرد چہرے پر نظر پڑی۔ تو مسکرا کر بولا۔

"بے وقوف ہو تم! میں بالکل ٹھیک ہوں، تم دیکھ نہیں رہیں، میں پہلے سے کتنا بہتر ہو گیا ہوں۔"

وہ بغور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ گزرتے ماہ و سال نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ اول روز سے اس نے جس دبلے پتلے اور لاغر سے مسعود کو دیکھا تھا۔ وہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ اور اسے یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ کہنے لگا۔

"میں خود اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کرتا ہوں اور پتا ہے، صبح جب میں واک کے لیے جاتا ہوں تو پہلے چند قدم کے بعد ہی میں تھک جاتا تھا۔ جب کہ اب میں ایک

فرلانگ سے زیادہ فاصلہ طے کر لیتا ہوں۔''

''سچ!'' وہ خوش ہو گئی۔

''ہاں، یہ سب تمہاری دواؤں اور دعاؤں کا کمال ہے۔''

''دوائیں تو ڈاکٹر لکھ دیتا ہے۔''

''مجھے پلاتی تو تم ہو، وہ بھی اتنی پابندی سے۔'' پھر اچانک جیسے کچھ یاد آیا تو پوچھنے لگا۔

''ارے ہاں، میں نے سنا ہے چچا جی آرہے ہیں؟''

''جی ٹھیک سنا ہے آپ نے۔''

''پھر تو تم ان کے ساتھ چلی جاؤ گی؟''

''نہیں، ویسے بھی ابو جی یہیں آرہے ہیں۔تایا جی نے ساتھ والا پورشن ٹھیک ٹھاک کرا دیا ہے۔''

''اچھا، ویسے میرا خیال ہے، چچا جی زیادہ دن اس پورشن میں رہیں گے نہیں۔'' اس نے پرسوچ انداز میں اپنا خیال ظاہر کیا تو وہ کہنے لگی۔

''ابو جی یہاں رہیں یا کہیں اور، میں بہر حال یہیں رہوں گی۔''

''بیوی بچوں کو لے کر آرہے ہیں؟'' وہ پوچھنے لگا

''جی، اور اب پلیز آپ آرام کریں۔''

''تم اگر کھڑے کھڑے تھک گئی ہو تو بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں، مجھے کھانا پکانا ہے، فارغ ہو جاؤں گی تو پھر آپ کے پاس آکر بیٹھوں گی۔''

''کوئی اچھی سی کتاب ضرور لیتی آنا۔'' اس نے کہا۔

وہ سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل کر آئی تو برآمدے میں تائی جی مل گئیں۔

اسے دیکھتے ہی وہ پوچھنے لگیں۔

''مسعود کو دوا دے دی؟''

''جی۔''

''بخار تو نہیں تھا اب اسے؟''

''نہیں، اب تو کافی بہتر نظر آرہے ہیں۔'' اس نے اپنے تئیں خوشخبری سنائی، لیکن جب تائی جی کا وہی سپاٹ چہرا دیکھا تو چپ چاپ وہاں سے کھسک آئی۔

دس سال ہو گئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے اور اتنے طویل عرصے میں وہ اب تک تائی جی کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ پتا نہیں انہیں اظہار کرنا نہیں آتا تھا، یا وہ اظہار کرنا نہیں چاہتی تھیں کہ کبھی کوئی غم، کوئی خوشخبری یا کسی اور بات کا ردعمل ان کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

اول روز اس نے ان کا جو سپاٹ چہرا دیکھا تھا آج بھی ویسا ہی تھا۔ وہ تو اب تک یہ بھی نہیں سمجھ سکی تھی کہ تائی جی اس کے یہاں آنے اور پھر رہنے سے خوش ہیں یا ناخوش، اور ان کے اسی انداز کی بدولت دس سال سے ان کے پاس رہنے بلکہ انہیں ماں کا درجہ دینے کے باوجود وہ ان کے بہت زیادہ قریب نہیں ہو سکی تھی۔ بلکہ ہمیشہ کچھ خائف سی رہی، گو کہ تائی جی بے سبب کسی بات پر روک ٹوک نہیں کرتی تھیں۔ اس گھر میں سے اسے مکمل آزادی حاصل تھی، بلکہ جب سے اس نے لڑکپن کو خیر باد کہا تھا، تب سے زیادہ تر کام اس کی مرضی اور پسند سے ہوتے تھے۔ اس کے باوجود کہیں کوئی کمی ضرور تھی، جس سے اس کی شخصیت دب کر رہ گئی تھی۔ نہ وہ اعتماد جو اسکول اور کالج میں پڑھنے والی لڑکیوں کو حاصل ہوتا ہے اور نہ وہ بے ساختگی جو اس عمر کی لڑکیوں کا خاصا ہوتی ہے اس کے برعکس ایسی جھجک جس نے اسے حد درجہ لحاظ اور مروت بخش کر ایک طرح سے حکم کی غلام بنا دیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر بات نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی اس نے انکار کرنا سیکھا تھا۔

سر اٹھا کر بات کرنا اور کسی بھی بات پر انکار تو اس نے اس وقت بھی ...... نہیں کیا تھا، جب وہ چھوٹی تھی اور امی ابو کے ساتھ رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ خاصی کم گو اور سہمی ہوئی سی بچی ہوا کرتی تھی اور اس میں حالات کا عمل دخل زیادہ تھا۔ ابو جی کی معمولی نوکری اور امی کو مسلسل اور مستقل بیماری جس سے گھر کے اندر ہمہ وقت ایک سکوت چھایا رہتا۔ ابو جی خود بہت دھیمی آواز اور لہجے میں بات کرتے اور اسے بھی شور کرنے سے منع کرتے تھے۔ کبھی اچانک اس کے ہاتھ سے کوئی برتن گر جاتا تو ابو جی بھاگے چلے آتے۔

''بیٹا! تمہیں خیال کرنا چاہیے، تمہاری امی بیمار ہیں۔ ابھی اتنی مشکل سے انہیں نیند آئی تھی اور تم نے اٹھا دیا۔''

''میں نے تو نہیں اٹھایا۔'' وہ معصومیت سے کہتی تو ابو جی اسے گود میں اٹھا لیتے۔

"شور سے ان کی آنکھ کھلی ہے اور بیٹا شور سے انہیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ یہ سب سمجھنے سے قاصر تھی، لیکن بار بار ابو جی کے سمجھانے سے اس کے ننھے سے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر وہ شور کرے گی تو امی کو تکلیف ہوگی اور وہ اپنی پیاری امی کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی جبھی جہاں اور بہت ساری باتوں میں احتیاط کرنے لگی، وہاں اپنی آواز کو بھی دھیما کر لیا تھا۔

اس وقت بلکہ برسوں وہ نہیں جان سکی کہ اس کے گھر کی خاموش فضاؤں میں اچانک شور کیسے اٹھا تھا۔ نہ کوئی آندھی آئی تھی نہ طوفان، پھر سب کچھ کیسے بہہ گیا۔ امی جو چپ چاپ پلنگ پر لیٹی رہتی تھیں، وہ چار کندھوں پر سوار ہو کر ایسی گئیں، کہ پھر پلٹ کر ہی نہیں آئیں۔

کافی وقت گزرنے کے بعد وہ یہ تو جان گئی کہ جہاں امی گئی ہیں، وہاں سے کبھی کوئی پلٹ کر نہیں آتا، لیکن اور بہت ساری باتیں سمجھنے سے وہ قاصر تھی کہ وہ گھر جہاں خاموشیوں کی حکمرانی تھی۔ ابو جی جیسے توانا مرد بھی چلتے ہوئے اپنے قدموں کو احتیاط سے رکھتے۔ بولتے تو قصداً آواز دھیمی کر لیتے۔ محض امی کی وجہ سے کہ وہ جو ابھی سوئی ہیں، اٹھ نہ جائیں اور جب وہ ہمیشگی کی نیند سوئیں تو ساری احتیاطوں کا دامن تار تار ہو گیا۔ اتنا شور اٹھا کہ کوئی بات سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ سہمی ہوئی ابو کے سینے میں دبکی، پلکوں کی جھریوں سے ایک ایک کو دیکھتی رہی تھی۔ پتا نہیں کون تھے وہ سب، جنہیں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سب کے سروں پر اونچے شملے تھے اور وہ سب ایک ہی مطالبہ کر رہے تھے۔

"سمیعہ کو ہمیں دو، ہماری ثریا کی نشانی ہے۔"

ابو جی نے اس کے گرد گرفت مضبوط کر لی تھی، اور کسی طرح اسے ان سب کے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

پھر کچھ دن بعد ہی وہ اسے لے کر تایا جی کے پاس آ گئے۔

تایا جی، ابو جی کا پرتو تھے۔ وہی لہجہ، وہی انداز، البتہ تائی جی کا رویہ اس وقت بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بظاہر انہوں نے اسے گود میں بھی اٹھایا اور سینے سے بھینچ کر پیار بھی کیا، لیکن ان کا سپاٹ لہجہ اور ہر تاثر سے عاری آنکھیں اور چہرا اسے اپنائیت کا احساس دلانے سے قاصر رہا تھا۔

تایا جی کے دو بیٹے تھے۔ بڑے احسن بھائی تھے جو ان دنوں سینئر کیمبرج میں تھے۔ پھر مسعود، جسے اس نے امی کی طرح چپ چاپ پلنگ پر لیٹے دیکھا تھا۔ بے حد لاغر، اس سے تین چار سال بڑا ہونے کے باوجود اس کا ہم عمر لگ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب جانے سے ڈر رہی تھی، جیسے اسے کبھی کبھی امی کے قریب جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ ویسی ہی ویران آنکھیں، سوکھے چہرے پر کھڑی ناک اور پپڑی زدہ ہونٹ اور دروازے کے پاس رک گئی تھی۔

"یہ مسعود ہے میرا چھوٹا بھائی۔" احسن بھائی نے اسے اندر بلایا۔ پھر مسعود کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولے تھے۔

"یہ مجھے بہت پیارا ہے، اپنے آپ سے بڑھ کر پیارا۔"

"یہ اس طرح کیوں لیٹے ہیں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

"اس کی طبیعت خراب ہے۔"

"امی کی طرح۔" وہ فوراً بول اٹھی۔

"نہیں، یہ بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔" احسن بھائی نے بھی اسی کی طرح فوراً جواب دیا تھا۔

کیسے ٹھیک ہوں گے؟"

"دوا سے اور تم دیکھنا کچھ دنوں بعد یہ تمہیں اپنے پیروں پر چلتا ہوا...... نظر آئے گا۔"

"اچھا!" وہ خوش ہو گئی تھی اور کچھ دنوں بعد جب اس نے واقعی مسعود کو چلتے ہوئے دیکھا تو اس کا ڈر آپ ہی آپ ختم ہو گیا تھا اور اس نے بے حد خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے تائی جی سے کہا تھا۔

"مسعود بھائی اب چلنے لگے ہیں، آپ انہیں اسکول میں داخل کرا دیں۔"

"جواب میں تائی جی نے گہری سانس لے کر ایسی نظروں سے اسے دیکھا تھا کہ اس کے تالیاں بجاتے ہاتھ وہیں رک گئے تھے اور کہیں کسی غلطی کے سرزد ہونے کے خیال سے اس نے سر بھی جھکا لیا تھا۔ تب تائی جی کو اس پر بے طرح رحم آیا۔ اسے سینے سے لگا کر پیار کیا تو چپ چاپ کتنے موتی ان کی پلکوں سے ٹوٹ کر اس کے بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔

اب وہ اسے کیسے بتائیں کہ اللہ میاں نے ان کے مقدر میں مسعود کی صورت ایک

مستقل آزمائش رقم کر دی ہے۔ وہ دمے کا مرض لے کر ہی پیدا ہوا تھا اور ابھی چار سال کا تھا کہ پولیو کا شکار ہو گیا۔ تایا جی نے علاج میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، جس سے وہ اپاہج ہونے سے تو بچ گیا تھا، لیکن جو پیدائشی سانس کا مرض تھا، اس کے سبب وہ اکثر ہی کسی نہ کسی بیماری کا شکار رہتا اور یقیناً اس میں قوت مدافعت کی زبردست کمی تھی، جو معمولی سا بخار بھی ہفتوں اسے بستر پر لٹائے رکھتا تھا۔ تائی جی اس کی تیمارداری کرتے کرتے نڈھال ہو جاتیں، پھر بھی اس نے کبھی انہیں مسعود کی بیماری کے دنوں میں چین سے بیٹھتے نہیں دیکھا تھا اور پھر وہ کوئی بہت چھوٹا بچہ نہیں تھا، اس لیے اس کے اکثر کام تائی جی نہیں کر سکتی تھیں۔ ایسے میں احسن بھائی اپنے سب کام چھوڑ کر اس کے پاس چلے آتے اور پھر رفتہ رفتہ احسن بھائی نے اس کی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔ اسے نہلانا، کپڑے بدلنا، بستر صاف رکھنا اور فارغ وقت میں اسے پڑھانا، شروع شروع میں وہ احسن بھائی کو یہ سارے کام کرتے دیکھتی رہتی تھی پھر آہستہ آہستہ ان کے ساتھ شریک ہو گئی۔ اس کے بیڈ پر چادر بچھا دیتی، کمرا صاف کر دیتی۔ کیاری سے پھول توڑ کر گلدان میں سجا دیتی اور جو کام مسعود کہتا، وہ خوشی خوشی کر دیتی۔ ویسے بھی وہ ابو جی کے ساتھ مل کر امی کی تیمارداری کر کے کافی کچھ سیکھ چکی تھی، اس لیے اب اسے کوئی خاص وقت نہیں ہوتی تھی۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ غالباً ماہ و سال کا چکر چلا تھا۔ جب اس نے آٹھویں کلاس پاس کی تو ابو جی کو کمپنی کی طرف سے جدہ جانے کا چانس ملا۔ وہ اسے بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے، لیکن تایا جی نے اسے نہیں جانے دیا۔ ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ ابو جی تو سارا دن آفس میں رہتے ...... اس دوران وہ اکیلی لڑکی کیا کرے گی۔ گو کہ وہ اپنوں ہی کے درمیان تھی، لیکن کوئی کتنا ہی قریب اور عزیز کیوں نہ ہو...... ماں باپ کی جگہ نہیں لے سکتا۔ جس طرح تائی جی، امی کی جگہ نہیں لے سکی تھیں۔ اسی طرح تایا جی بھی ہزار شفقتیں لٹانے کے باوجود ابو جی نہیں ہو سکتے تھے۔ یوں ابو جی کے جانے سے سب کے درمیان رہتے رہتے ہوئے بھی اس کے اندر ایک دم تنہا ہو جانے کا احساس گھر کر گیا۔

"بے وقوف ہو تم!" احسن بھائی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"چچا جی کے ساتھ جا کر تم اور زیادہ تنہا ہو جاتیں یہاں تو ہم سب ہیں۔"

"میں بھی ابو جی کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔"

"پھر......!"

"ابو جی بھی نہ جاتے، کیا ضرورت تھی جانے کی؟"

"اس طرح مت سوچو، یہاں رہ کر کیا ملا انہیں، ایک اپنا گھر تک تو بنا نہیں سکے اور پھر کون سا بہت زیادہ عرصے کے لیے گئے ہیں۔ دو سال کا کنٹریکٹ ہے۔ پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے دو سال۔"

"میں کیا کروں، میرا ان کے بغیر دل نہیں لگتا۔" وہ رونے لگی تھی۔

"یہ کیا حماقت ہے، تم تو خاصی سمجھدار لڑکی ہو، اس طرح روؤ گی تو وہاں چچا جی کا بھی دل نہیں لگے گا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے آئیں گے، پھر جانتی ہو کیا ہو گا؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ان کی اپنا گھر بنانے کی خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکے گی اور پھر وہ تمہاری خاطر ہی تو اتنی دور گئے ہیں تاکہ تمہیں اچھا گھر اور اچھی زندگی دے سکیں۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"دل لگا کر پڑھو، وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلے گا۔ ادھر میٹرک کرو گی۔ ادھر چچا جی آ جائیں گے۔"

احسن بھائی کے سمجھانے سے وہ کافی بہل گئی تھی۔ پھر ابو جی بھی ہر ہفتے فون ضرور کرتے اور ان کے خط بھی باقاعدگی سے آتے تھے۔ ابتدائی چند مہینوں تک تو یہ سلسلہ اسی طرح باقاعدگی سے چلا پھر شاید ابو جی بہت زیادہ مصروف ہو گئے تھے کہ ان کے خطوط میں باقاعدگی نہ رہی اور فون بھی آتا تو بہت عجلت میں صرف تایا جی سے بات کر لیتے اور وہ کیونکہ اس دوران یہاں کافی حد تک ایڈجسٹ ہو چکی تھی۔ اس لیے ابو جی کی طرف سے ہونے والی بے قاعدگی کو زیادہ محسوس نہیں کر سکی اور وہ تو یہ بھی محسوس نہیں کر سکی تھی کہ وہ جب بھی ابو جی کا ذکر کرتی ہے۔ کوئی نہ کوئی درمیان سے بات اچک کر کوئی اور موضوع چھیڑ دیتا ہے۔ بہر حال ان تمام باتوں کے باوجود وہ یہ نہیں بھولی تھی کہ وہ جیسے ہی میٹرک کرے گی۔ ابو جی آ جائیں گے۔ اس لیے وہ جو پڑھنے کی طرف کچھ زیادہ راغب نہیں تھی۔ خوب دل لگا کر پڑھنے لگی تھی۔

احسن بھائی ان دنوں میڈیکل کے دوسرے سال میں تھے۔ خود ان کا کہنا تھا کہ

انہیں میڈیکل میں جانے کا کوئی شوق نہیں تھا، لیکن صرف مسعود کی خاطر انہوں نے میڈیکل جوائن کیا تھا تاکہ وہ خود اس کا علاج کر سکیں۔ آخر ہر دوسرے ہفتے اسے بخار کیوں ہو جاتا ہے وہ کیوں اتنا کمزور لاغر سا ہے۔ اس کے جسم میں کس چیز کی کمی ہے، جو وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو پاتا۔ یہ ساری باتیں وہ خود جاننا چاہتے تھے اور پھر تائی جی کی مایوسی بھی ان سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ وہ انہیں یقین سے کہتے۔

''آپ دیکھئے گا، مسعود کی مکمل شفا میرے ہاتھوں میں لکھی ہے۔''

اب بھی وہ اس کی دیکھ بھال ڈاکٹری اصولوں کے مطابق کرتے تھے۔ وقت پر دوا اور پرہیزی کھانا بلکہ جب سے سمیعہ کچن کے کام کرنے لگی تھی، مسعود کے لیے پرہیزی کھانا وہی بناتی تھی، کہیں کوئی لاپروائی نہیں تھی، پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ ٹھیک ہو کے نہیں دے رہا تھا۔

پہلے اسکول، پھر تائی جی کے ساتھ گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹانا اس کے بعد مسعود کی دیکھ بھال میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوئی تو گزرے ماہ و سال شمار کرتے ہوئے تائی جی سے کہنے لگی۔

''ابو جی کو گئے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں۔ اب تو وہ آنے والے ہوں گے۔''

''جواب میں تائی جی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ تب اسے پوچھنا پڑا تھا۔

''ابو جی نے اپنے آپ کے بارے میں کچھ لکھا ہے، کب آئیں گے وہ؟''

''ابھی ان کا آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' تائی جی نے سرسری انداز میں بتایا تھا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ وہاں بہت اچھی طرح سیٹ ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ بالکل نہیں سمجھی تھی۔ تائی جی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔

''انہوں نے گزشتہ سال وہاں شادی کر لی تھی اور اب تو ماشاء اللہ تمہارا ایک بھائی بھی ہے۔''

''تائی جی لاکھ اس بات کو ہلکے پھلکے انداز میں بیان کریں یا سو طرح کے بہلاوے لیکن وہ اب چھوٹی سی سمیعہ نہیں تھی، جسے ایک ذرا سی بات سمجھنے میں برسوں لگے تھے کہ ا کے گھر کی خاموشی فضاؤں میں اچانک شور کیے اٹھا تھا۔ اب تو جو شور اس کے اندر اٹھا، وہ ا کی پوری ہستی کو ہلائے دے رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تائی جی کی طرف دیکھنے لگی، جو ہہ رہی تھیں۔

''اچھا ہے، بلال احمد نے گھر بسا لیا۔ کم از کم بڑھاپے کا آسرا تو ہو گیا ناں، ورنہ ر چار چھ سال اور اسی طرح گزار دیتا تو مشکل ہو جاتی۔ پھر کوئی بیٹا بھی نہیں تھا اور بیٹیاں ب تک ساتھ دیتی ہیں؟'' اس کی کیفیت سے بے خبر وہ اپنی کہے گئیں۔

''تمہارے لیے بھی اچھا ہے، اگلے گھر جاؤ گی تو یہ فکر تو ساتھ نہیں ہو گی کہ ابو جی کیلے ہیں۔ ایک طرح سے اطمینان ہی ہو گا، ہیں ناں؟''

اس سے تصدیق چاہی تو اس کا دل چاہا، اندر کا سارا شور چیخوں کی صورت میں باہر لے آئے اور پھر اتنا روئے کہ آنکھ میں کوئی آنسو نہ رہے، لیکن وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے دئے ہلکے سے سر ہلا کر ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

دکھ صرف اتنا نہیں تھا کہ ابو جی الگ دنیا بسا کر اس میں مگن ہو گئے تھے۔ اس سے یادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ ایک سال بعد جب وہ بیٹے کے باپ بن ئے تھے۔ تب تائی جی یوں بتا رہی تھیں، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ہو سکتا ہے ان کے لیے کوئی ات نہ ہو، لیکن وہ اس بات کو آسانی سے قبول نہیں کر پائی تھی ...... کئی دن تک وہ ہر شے سے لکہ آپ سے بھی بیگانہ ہو گئی تھی، بس کچھ دھندلے عکس تھے، اس کی جھلملاتی آنکھوں میں سما ئے تھے۔

امی کا خاموش اور بیمار وجود جس میں ذرا سا شور ارتعاش پیدا کر دیا کرتا تھا۔ کبھی جو ہ بولنے کی کوشش کرتیں، تو کھانسی کے شدید دورے سے ان کا وجود جھٹکے کھانے لگتا تھا۔ اسی طرح ایک روز جھٹکے کھاتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا تھا۔

''بیٹی! اپنے ابو جی کا خیال رکھنا۔''

''میں خیال رکھ سکتی تھی، لیکن انہوں نے خیال نہیں کیا۔'' اس نے تصور میں امی کو مخاطب کرتے ہوئے برسوں پہلے کہی بات کا جواب دیا، ساتھ ہی شکوہ بھی کیا اور بے حد آزردہ

ہو کر تھوڑی گھٹنوں پر ٹکائی تھی۔ اس وقت وہ برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی۔ احسن بھائی اپنے کمرے سے نکلے تو اسے یوں بیٹھے دیکھ کر پہلے ٹھٹکے پھر اس کے پاس آ بیٹھے تھے۔

"کیا بات ہے، یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" وہ اس سے پوچھنے لگے۔

"بس یونہی۔" وہ ان کی طرف دیکھنے سے گریزاں رہی اور انگلی سے فرش پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی تھی۔

"کسی نے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں، مجھے کہاں کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی ہلکی سی سرزنش بھی نہیں کرتا۔ سب اتنی محبت کرتے ہیں، تایا جی تائی جی، مسعود بھائی اور آپ۔"

آپ کہتے ہوئے اس نے یونہی سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا اور وہی ایک لمحہ جیسے تاک میں تھا دل کی سرزمین پر اس نرمی سے پھوار برسائی کہ اندر باہر ہر طرف کلیاں چٹخنے لگی تھیں، جن کی صدائیں احسن بھائی نے واضح طور پر سنی تھیں اور جہاں وہ اچانک بیدار ہونے والی کیفیت سے گھبرائی وہاں احسن بھی پریشان ہو گئے تھے۔ پریشانی کی بات تو تھی کہ کل تک یہ لڑکی ان کی اُنگلی تھام کر چلتی تھی اور اب کندھے برابر ہو کر دل کے تاروں کو چھیڑ گئی تھی۔ انہوں نے بہت چاہا کہ ہمیشہ کی طرح بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی آزردگی کا سبب پوچھیں، لیکن ابھی ابھی جو ایک نیا احساس جاگا تھا، وہ بقیہ تمام احساسات پر یوں غالب آیا کہ وہ مزید کچھ کہے بغیر اس کے پاس سے اٹھ گئے تھے۔

پھر اگلے کئی دن تک وہ اگر اپنے آپ کو سمجھاتی رہی تھی تو احسن بھائی بھی اپنی سی ہر کوشش کر کے ہارے تھے اور مزے کی بات تو یہ تھی کہ دونوں ہی ایک دوسرے پر اپنا آپ عیاں کرنے سے گریزاں تھے۔ وہ اپنے اندر چٹکتی کلیوں سے پریشان ہو کر سوچتی۔

اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ میں ان کے بارے میں اس انداز سے سوچنے لگی ہوں تو پتا نہیں وہ کیا سوچیں۔ ہو سکتا ہے۔ ڈانٹیں، سرزنش کریں یا پھر خفا ہوں اور ان کی خفگی کے خیال سے، وہ ان سے چھپی چھپی پھرتی۔

اس روز مسعود کے کمرے سے نکلتے ہوئے، ان سے سامنا ہو گیا۔ وہ کترا کر نکل جانا چاہتی تھی، کہ وہ سامنے آ گئے، ہمیشہ سے مختلف ان کا انداز چونکانے والا تھا۔

"کہاں ہوتی ہو آج کل؟" ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ اس بات کی غماز تھی کہ

اپنے ساتھ ساتھ اس کے جذبوں سے بھی آگاہ ہو چکے ہیں اور وہ نادان اب بھی ان کی خفگی کے خیال سے اپنا آپ چھپانے کی سعی میں مصروف.....!

"یہاں، اسی گھر میں رہتی ہوں۔"

"ہاں، لیکن نظر نہیں آتیں۔"

وہ خاموش رہی، تب وہ موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"تمہارا رزلٹ کب آ رہا ہے؟"

"غالباً اگلے ہفتے۔"

"پھر آگے کیا ارادہ ہے؟"

"کچھ نہیں میرا مطلب ہے، میں نے سوچا نہیں۔"

"پھر کون سوچے گا۔" وہ شہادت کی انگلی اس کی پیشانی پر ٹکا کر اس کا چہرا اونچا کرتے ہوئے بولے تھے۔

"پتا نہیں۔"

"بے وقوف! تمہیں خود سوچنا ہے، اپنے لیے راستے کا تعین تمہیں خود کرنا ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں کرنا، میں آگے نہیں پڑھوں گی۔"

"کیوں؟" وہ واقعی حیران ہوئے تھے۔

"بس میرا دل نہیں چاہتا۔ میٹرک بھی میں نے اس لیے کیا تھا کہ آپ نے کہا تھا، کہ جیسے ہی میٹرک کروں گی، ابو جی آ جائیں گے، لیکن وہ نہیں آئے اور وہ کبھی نہیں آئیں گے۔" وہ آنسو جنہیں وہ تایا جی کے سامنے روک چکی تھی، وہ اب بہہ نکلے۔

"سمیعہ!" ان کے لہجے میں وہی بڑا پن سمٹ آیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے کمرے میں لے آئے۔

"اتنی سی بات پر رونے لگیں؟"

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے احسن بھائی!" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

"ابو جی نے وہاں دوسری شادی کر لی ہے، انہیں اب میری پروا نہیں رہی۔"

"اس طرح مت سوچو پاگل لڑکی، تمہاری پروا ہے۔" وہ نرمی سے اسے سمجھانے

''انہوں نے شادی کی ہے، کوئی جرم نہیں کیا۔ تم اس بات کو اتنی سنجیدگی سے اور غلط انداز سے مت سوچو۔ یہ خیال مت کرو کہ اب انہیں تمہاری پروا نہیں رہی ہوگی۔ تمہاری حیثیت اور اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔''

''میری کوئی اہمیت ہوتی تو وہ مجھ سے یوں غافل ہو جاتے؟''

''کون کہتا ہے کہ وہ تم سے غافل ہیں۔ ان کے خط، ٹیلی فون اور تحائف کیا یہ ساری باتیں ان کی غفلت کی نشاندہی کرتی ہیں؟''

''وہ خود کیوں نہیں آتے؟'' ''انہیں ہمیشہ تو وہاں نہیں رہنا۔ اور اب تم اپنے آنسو صاف کر لو۔ مجھے تمہارا رونا بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔'' وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''جانے سے پہلے یہ سنتی جاؤ کہ تمہیں ہر صورت اپنی تعلیم جاری رکھنی ہے، یہ میری خواہش ہے۔''

اور پھر ان کی خواہش پر ہی اس نے کالج میں ایڈمیشن لیا تھا اور ابھی وہ انٹر کے دوسرے سال میں تھی کہ احسن بھائی کو اسپیشلائزیشن کے لیے اسکالر شپ مل گیا۔ یہ ان کی خواہش بھی تھی اور اس کے لیے انہوں نے محنت بھی بہت کی تھی۔ ان کا خیال تھا وہ مسعود کی تمام رپورٹیں اور اب تک کا علاج باہر کے ڈاکٹروں کے سامنے رکھیں گے اور اگر ممکن ہوا تو مسعود کو وہیں بلا کر اس کا علاج کرائیں گے، پھر جانے سے پہلے، جہاں انہوں نے اسے دل لگا کر پڑھنے کی تاکید کی تھی، وہاں مسعود کا خیال رکھنے کو بھی کہا تھا اور یہ دونوں کام اس نے پوری ایمانداری سے کیے تھے۔

گزشتہ ماہ اس نے بی۔اے کا امتحان دیا تھا اور مسعود کی طرف سے تو وہ کبھی غافل نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے جاتے سمے اس کے خوابوں کو زبان دیتے ہوئے کہا تھا۔

''سمیعہ! مسعود اچھا ہو جائے پھر ہم نئے سفر کا آغاز کریں گے۔''

''ہم۔!''

''ہاں ہم دونوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرائے تھے۔

گزشتہ تمام عرصے میں کوئی اظہار نہیں، کوئی اقرار نہیں، اس کے برعکس اپنے

جذبوں کو پوشیدہ رکھنے کی سعی لاحاصل۔ اسے یہ ڈر کہ وہ خفا نہ ہوں، اور انہیں یہ خوف کہ بھرم نہ ٹوٹ جائے اور وقت رخصت ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر...... جہاں انہوں نے نئے سفر کی نوید دی۔ وہاں اس نے جھکی پلکوں کے ساتھ اپنے اندر چٹکتی ساری کلیاں ان کے دامن میں ڈال دی تھیں۔

ابو جی دو سال کے معاہدے پر جدہ گئے تھے اور اب پورے سات سال بعد لوٹے تھے۔ اس عرصے میں وہ چھوٹی سے بڑی ہوئی، جبکہ ابو جی اپنی عمر سے کئی سال آگے جا کھڑے ہوئے تھے۔ گو کہ اس وقت بھی ان کی صحت اچھی تھی لیکن حالات نے ان کے چہرے پر تفکرات اور غم کا جو جال بن دیا تھا۔ اس سے وہ اپنی عمر سے کہیں بڑے نظر آتے تھے اور اب قابل رشک صحت اور چہرے کی سرخی یقیناً بے فکری اور پیسے کی فراوانی کی مرہون منت تھی اور ان کے پہلو میں کھڑی امی کی جگہ وہ دوسری عورت اگر ان سے عمر میں کافی چھوٹی تھی بھی تو اتنا فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابو جی اگر اکیلے ہوتے تو وہ بے اختیار ان کے سینے میں جا چھپتی لیکن اس دوسری عورت کی وجہ سے ایک جھجک مانع آ گئی اور وہ کچھ فاصلے پر رک کر صرف سلام کر سکی۔

''ارے سمیعہ بیٹا!'' ابو جی خود ہی آگے بڑھ آئے اور اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔ ''کتنی بڑی ہو گئی ہے میری بچی۔ کون سی کلاس میں پڑھتی ہو بیٹا؟''

''جی بی۔اے کر لیا ہے۔''

''اچھا! میرا خیال تھا تم ابھی میٹرک میں ہو گی۔ خیر ان سے ملو۔'' وہ پلٹ کر بیوی کی طرف یوں دیکھنے لگے، جیسے پوچھ رہے ہوں تم اپنے آپ کو کیا کہلوانا پسند کرو گی۔

''میں تمہارا ام۔'' خاتون نے مسکراتے ہوئے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور عربی لہجے میں اردو بولی تو وہ خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی۔ سیاہ رنگ کا گاؤن جس نے ان کے پیروں تک کو چھپا رکھا تھا کہ آدھی پیشانی بھی چھپ گئی تھی۔ اسے لگا جیسے اچانک سیاہ بدلیوں میں سے چاند جھانکنے لگا ہو اور ان کی مسکراہٹ ٹھنڈی میٹھی چاندنی کا پتا دے رہی تھی۔

''تمہارا اسم؟'' انہوں نے پوچھا تو وہ اپنی محویت سے چونک کر بولی۔

''سمیعہ!''

"مجھے معلوم تھا۔" ان کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"اور دیکھو۔ تمہارے نام سے ملتا جلتا تمہاری بہن کا نام ہے۔ سامعہ۔"

وہ پہلی بار دونوں بچوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ پانچ سالہ خالد اور چار سالہ سامعہ تائی جی کے پاس کچھ سمٹے سے بیٹھے تھے۔

"یہ میرے بہن بھائی ہیں۔" اس نے سوچا اور شاید کچھ کشش محسوس ہوئی تھی، جب ہی ان کے پاس جا بیٹھی۔ سامعہ کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا اور خالد کو اپنے قریب کھینچ کر بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"پڑھتے ہو؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کون سی کلاس میں؟"

"پہلی میں۔"

"اور سامعہ؟"

"سامعہ ابھی نہیں پڑھتی۔"

"کیوں؟"

"بابا نے کہا تھا اسے پاکستان جا کر اسکول داخل کریں گے۔" وہ خاصے اعتماد سے بول رہا تھا اور یوں جیسے اس سے صرف غائبانہ تعارف ہی نہیں بلکہ کافی حد تک واقف ہو۔

"اچھا تو تم پاکستان آئے ہو؟" وہ محظوظ ہو کر بولی۔ پھر تائی جی کے پکارنے پر ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"بیٹا! چائے وغیرہ لے آؤ۔" انہوں نے کہا تو اسے اپنی لاپروائی پر خاصی شرمندگی ہوئی اور فوراً سامعہ کو وہیں بٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ پھر جب وہ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لے کر آئی تو مسعود بھی اپنے کمرے سے نکل کر وہیں آ بیٹھا تھا اور ابو جی اس سے حال احوال پوچھ رہے تھے۔ مسعود نے اسے دیکھا تو کہنے لگا۔

"سمیعہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ مجھے دوا دینا تو کبھی بھولی ہی نہیں۔"

"بس کریں مسعود بھائی! آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔"

"یہ وہم نہیں حقیقت ہے کہ ٹھیک وقت پر تم دوا لیے میرے سرہانے موجود ہوتی ہو۔" اس نے ایک نظر مسعود پر ڈالی پھر ٹرالی تائی جی کے سامنے گھسیٹ کر خود رات کے

کھانے کی تیاری کے سلسلے میں دوبارہ کچن میں چلی گئی۔



مسعود نے ٹھیک کہا تھا کہ چچا جی زیادہ دن اس پوزیشن میں نہیں رہیں گے۔ دوسرے دن ہی ابو جی کیلئے اپنا گھر لینا کوئی بڑی بات یا مشکل کام نہیں تھا۔ چاہتے تو کہیں بھی کھڑے کھڑے گھر خرید سکتے تھے اور شاید وہ ایسا ہی چاہتے تھے لیکن تایا جی نے سمجھایا کہ پہلے اپنا بزنس سیٹ کرلیں۔ اس کے بعد اطمینان سے گھر خریدیں۔ یوں ابو جی اپنا بزنس سیٹ کرنے میں لگ گئے۔ اور وہ گو کہ اپنے طور پر فیصلہ کر چکی تھی کہ ابو جی کے ساتھ نہیں جائے گی لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ اگر ابو جی نے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو وہ انکار بھی نہیں کر سکے گی۔ اس لیے فی الحال ابو جی کے یہیں رہنے پر قدرے مطمئن ہو گئی تھی۔

اس کے معمولات وہی تھے۔ بس دن میں کسی کسی وقت ابو جی کی طرف چلی جاتی۔ کھانا پکانے اور دیگر کاموں میں آنٹی کا ہاتھ بٹاتی اور شام میں کچھ دیر خالد اور سامعہ کو پڑھا دیتی تھی۔ آنٹی مزاجاً اچھی خاتون تھیں۔ اس کے ساتھ دوستانہ ماحول میں اور نرمی سے بات کرتیں۔ ان کی ایک عادت جو اس نے ابھی تک تو محسوس نہیں کی تھی اور اگر محسوس کی بھی تھی تو برا نہیں مانا تھا۔ وہ ان کا ہر بات میں ٹوکنا تھا۔

"تم نماز نہیں پڑھتیں چلو پہلے نماز پڑھو۔"

"تمہارے بال کیوں کھلے ہیں۔ انہیں باندھو اور دوپٹے سے اچھی طرح ڈھکو۔"

"بری بات کھڑے ہو کر پانی نہیں پیتے۔"

ایسی بہت ساری باتیں جن پر وہ خود سختی سے عمل پیرا تھیں، اسے سمجھاتیں اور ٹوکتیں۔ اور ان باتوں پر برا ماننے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتی اور کوشش کرتی کہ انہیں ایک بات کے لیے دوبارہ نہ ٹوکنا پڑے۔ اور اس روز جب انہوں نے اسے تایا جی کے گھر اور خاص طور سے مسعود کے پاس جانے سے منع کیا تو وہ کچھ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"مسعود تمہارا عم زاد ہے۔" آنٹی اپنے طور پر اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگیں۔ "وہ تمہارے لیے نامحرم ہے اور تمہارا اکیلے اس کے کمرے میں جانا اچھی بات نہیں ہے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آنٹی!" وہ تاسف سے بولی۔

''میں غلط نہیں کہہ رہیں اور نہ ہی میں آپ کی نیت پر شبہ کر سکتی ہوں، لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ میں شروع سے یہاں رہ رہی ہوں۔ تایا جی اور تائی جی نے مجھے ماں باپ کی طرح پرورش کیا ہے اور مسعود بھائی۔'' اس کی آواز حلق میں دب گئی۔

''یہ سب ٹھیک ہے لیکن۔''

''بس کریں آنٹی!'' وہ رندھی آواز میں بولی۔

''مجھے تایا جی کے گھر جانے سے منع مت کریں۔''

''میں تمہیں ان کے گھر جانے سے منع نہیں کر رہی لیکن مسعود۔''

''میں مسعود بھائی سے بھی غافل نہیں ہو سکتی۔''

وہ ان کی بات کاٹ کر فوراً بولی اور پلٹ کر درمیانی دروازہ پار کر گئی۔

یہ پہلا اختلاف تھا یعنی اس نے ان کے ٹوکنے کا برا مانا اور ان کی بات بھی نہیں مانی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا کہ انہوں نے کہا نماز پڑھو وہ فوراً وضو کرنے چل دیتی وہ کہتیں۔ کھڑے ہو کر پانی نہیں پیتے۔ وہ فوراً بیٹھ جاتی لیکن اب وہ کہہ رہی تھیں۔ مسعود کے کمرے میں مت جاؤ اور اس بات پر فوری عمل ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ جب سے وہ گھر کے کام اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مسعود کی دیکھ بھال کرنے لگی تھی تب سے تائی جی تو ایک طرح سے بری الذمہ ہی ہو گئی تھیں۔ انہیں تو مسعود کی دوا کے اوقات بھی معلوم نہیں تھے اور ایسے میں اس کا اچانک تایا جی کے گھر سے یا صرف مسعود کی ذات سے ناطہ توڑ لینا عجیب سی بات تھی۔ آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے اور پھر وہ اس گھر میں چھوٹی سے بڑی ہوئی تھی۔ کہیں کسی مقام پر اسے کسی چیز کی کمی نہیں محسوس ہونے دی گئی۔ پھر وہ کیسے ایک دم سے منہ موڑ لیتی۔ جہاں آنٹی کی اور بہت ساری باتیں مانتے ہوئے بھی وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوئی تھی وہاں ایک یہ بات نہ مان کر بھی شرمندہ نہ تھی۔ لیکن اسے آنٹی کی بات پر افسوس ضرور ہوا تھا۔ کھانا پکاتے ہوئے کھانے کے دوران اور جب مسعود کے کمرے میں کھانا لے کر گئی اس وقت بھی وہ خاصی مضمحل تھی۔

''کیا بات ہے کچھ پریشان ہو؟'' مسعود اسے چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''نہیں تو۔'' وہ ناخنوں سے کھیلتی ہوئی بولی۔ آواز دھیمی اور لہجے میں کچھ شکستگی سی تھی۔

''آنٹی سے لڑائی ہوئی ہے۔؟'' اس نے پوچھا تو وہ سر اونچا کر کے اسے دیکھنے لگی اور وہ ہنس کر کہنے لگا۔

''بھئی۔ اس تمام عرصے میں، تمہاری امی یا مجھ سے تو لڑائی ہوئی نہیں۔ اس لیے مجھے آنٹی کا نام لینا پڑا۔''

''میری ان سے لڑائی نہیں ہوئی۔'' اسے کہنا پڑا۔

''لیکن ان کی کوئی بات بری ضرور لگی ہے۔''

''نہیں۔''

''تم نہ بتانا چاہو الگ بات ہے ورنہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسی ہی کوئی بات ہے۔'' اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔

''سنو، تمہارا اور ان کا رشتہ ہی ایسا ہے۔ اور ابھی تو ابتدا ہے۔ آئندہ اور بہت ساری باتیں ہو سکتی ہیں لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرو، ورنہ جتنا زیادہ محسوس کرو گی اتنی ہی تکلیف بڑھے گی۔''

اس کا دل چاہا صاف بات بتا کر پھر اس سے پوچھے کہ یہ بات نظر انداز کر دینے والی ہے۔ لیکن اس سے اس کی دل آزاری کا خدشہ تھا اس لیے خاموش رہی اور اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچا تو اٹھ کر گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیا پھر اس کے آگے سے ٹرے اٹھا کر آنے لگی......تو وہ پکار کر کہنے لگا۔

''سنو۔ ابھی آ رہی ہونا۔''

''جی۔ آپ چائے پئیں گے؟''

''اگر تم پیو گی تو لیتی آنا۔'' وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل آئی۔ پھر کچھ دیر بعد چائے لے کر آئی تو۔ وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے مگ لیا تب بھی بیٹھا نہیں۔ یونہی ٹہل ٹہل کر پینے لگا۔ وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر اس کے بیڈ کے پاس جو کرسی رکھی تھی وہاں جا بیٹھی۔

''امی کیا کر رہی ہیں؟'' وہ رک کر پوچھنے لگا۔

''نماز پڑھ رہی ہیں اور اب پلیز آپ بیٹھ جائیں۔ تھک جائیں گے۔''

''میں تو ایسے ہی تھکا ہارا انسان ہوں مزید کیا تھکوں گا۔'' وہ خالی مگ ٹیبل پر رکھ کر

اپنی جگہ پر آ کر بیٹھا تو کہنے لگا۔

''پتا ہے سمیعہ! کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے۔ میں ہر وہ کام کروں جس کے لیے مجھے سختی سے منع کیا گیا ہے۔''

''مثلاً۔؟'' وہ تھوڑی کے نیچے ہاتھ ٹکا کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''کبھی میرا دل چاہتا ہے۔ میں خوب تیز بھاگوں۔ اتنا تیز کہ......... ساری تیز رفتار چیزوں کو پیچھے چھوڑتا چلا جاؤں۔ کوئی آواز، کوئی پکار مجھ تک نہ پہنچے۔'' سامنے دیوار پر نظریں جمائے وہ یاس بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''اور کبھی دل چاہتا ہے۔ میں سگریٹ سلگا کر اتنا گہرا اور طویل کش لوں کہ میرے اندر باہر ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل جائے۔''

''بس کریں مسعود بھائی!'' وہ جھرجھری لے کر بولی۔ ''جانتے ہیں، سگریٹ پینے سے آپ کی کیا حالت ہوگی۔''

''ہاں!'' وہ اطمینان سے بولا ''کھانسی کا شدید دورہ اور پھر میری سانس سینے میں دب کر رہ جائے گی اور اگر اسی حالت میں میری موت لکھی ہوگی تو مر جاؤں گا ورنہ پھر۔''

''خدا کے لیے مسعود بھائی! ایسی باتیں تو نہ کریں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''ایک دن تو ایسا ہونا ہی ہے۔ چاہے میں تیز نہ بھاگوں۔ سگریٹ نہ پیوں تب بھی۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ آپ بہت جلد بہت اچھے ہو جائیں گے اور اب آپ دوا پینے کے لیے تیار ہو جائیں۔'' وہ اٹھنے کو تھی کہ ابو جی اسے پکارتے ہوئے وہیں آ گئے۔

''آیئے چچا جی!'' مسعود اٹھنے لگا کہ انہوں نے روک دیا۔

''بیٹھے رہو (بیٹا) کیسے ہو۔؟'' انہوں نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارا کیا پھر اس سے کہنے لگے۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''جی۔!'' وہ واقعی حیران ہوئی کیونکہ اب سے پہلے تو کسی نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔

''چلو۔ خالد اور سامعہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ آج سے تم ان کے ساتھ سویا

کرنا۔'' انہوں نے گویا حکم سنایا۔ وہ منع کرنا چاہتی تھی لیکن ابو جی کا انداز ایسا تھا جیسے انکار سنتے ہی بھڑک اٹھیں گے۔ اور وہ مسعود کا خیال کر کے خاموشی سے کھڑی ہوگئی۔

''آپ چلیں، میں مسعود بھائی کو دوا دے کر آتی ہوں۔''

''دوا میں خود لے لوں گا، تم جاؤ۔'' مسعود اس سے زیادہ حساس تھا ابو جی کا ناگوار لہجہ فوراً محسوس کر گیا۔

''آپ کو تو معلوم بھی نہیں ہے۔ کونسی دوا لینی ہے۔ میں دیتی ہوں۔'' وہ میز کی طرف بڑھ گئی۔ ابو جی نے اسے کپ میں دوا ڈالتے ہوئے دیکھا پھر اسے جلدی آنے کی تاکید کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے وہ کپ لے کر مسعود کے پاس آئی تو وہ سر جھکائے جانے کیا سوچ رہا تھا۔

''لیجئے۔'' اس نے کپ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا تو وہ ذرا سا سیدھا ہوا، پھر کچھ کہے بغیر کپ اس کے ہاتھ سے لے کر دوا حلق میں اتاری اور کپ دوبارہ اس کے ہاتھ میں تھما کر لیٹا تو کہنے لگا۔

''لائٹ آف کرتی جانا۔''

''مسعود بھائی!'' وہ ابو جی کے سمجھ میں نہ آنے والے رویے کی معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن مسعود نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا تو وہ لائٹ آف کر کے اس کے کمرے سے نکل آئی پھر فوراً ابو جی کے پیچھے جانے کی بجائے تائی جی کے پاس آ بیٹھی۔ وہ نماز کے بعد تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں۔

''کیا بات ہے بیٹا؟'' تائی جی سمجھ گئیں، وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ تسبیح رکھ کر پوچھنے لگیں۔

''وہ تائی جی۔ مجھے ابو جی بلا کر گئے ہیں۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کس طرح بات کرے۔

''تو چلی جاؤ بیٹا۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''آپ سمجھی نہیں۔ ابو جی کا کہنا ہے۔ میں خالد اور سامعہ کے ساتھ سویا کروں۔''

وہ سر جھکا کر بول رہی تھی۔ تائی جی اب فوراً کچھ نہیں کہہ سکیں، کچھ دیر تک اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

''چلو تو ایسا کر لو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں رہو یا وہاں، ایک ہی گھر ہے۔''

اس نے سر اونچا کر کے دیکھا۔ تائی جی کا وہی سپاٹ چہرا تھا اور وہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ آیا وہ خوشی سے اجازت دے رہی ہیں یا انہیں افسوس ہو رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ شش و پنج میں پڑ جایا کرتی، سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔

''اپنا بستر لے جانا چاہتی ہو؟'' تائی جی اسے گومگو کی حالت میں دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور ان کے پاس سے اٹھ آئی۔ اس کا خیال تھا۔ اب ابو جی کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہ آنٹی کی زبان بولتے ہوئے اسے پتا نہیں کیا سمجھانے کی کوشش کریں گے لیکن ابو جی اپنے بیڈ روم میں جا چکے تھے۔ البتہ آنٹی اس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

''بچے ابھی ابھی سوئے ہیں، تم ان کے پاس چلی جاؤ۔'' وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔

''گویا اب مجھے ان کی آیا گیری کرنی پڑے گی۔'' اس نے خالد اور سامعہ کو دیکھ کر سوچا اور جلدی سے لائٹ آف کر کے ساتھ والے بیڈ پر جا لیٹی۔



''سمیعہ! تم مسعود کا ہر طرح سے خیال رکھنا، خاص طور سے دوا کی طرف سے کبھی لاپروائی نہ ہو۔'' اس شخص نے کہا تھا جو اس کے کومل جذبوں کو چھیڑنے اور بیدار کرنے کا ذمہ دار تھا اور جس کے حوالے سے وہ اب تک کتنے خواب سجا چکی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کے خوابوں کو تعبیر دینے سے پہلے وہ یہ ضرور پوچھے گا۔ تم نے مسعود کا کتنا خیال رکھا۔ اور وہ کہے گی اپنے آپ سے بڑھ کر۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ اب تک مسعود کی طرف سے غافل نہیں ہوئی تھی لیکن اب جان بوجھ کر اسے غافل کیا جا رہا تھا۔ یعنی وہ جب بھی تائی جی کی طرف جانے لگتی آنٹی راہ میں حائل ہو جاتیں۔ کسی نہ کسی کام کے بہانے روک لیتیں۔ وہ اکثر رک جاتی تھی لیکن اگر مسعود کی دوا کا وقت ہوتا تو وہ سہولت سے کہہ دیتی۔

''میں مسعود بھائی کو دوا دے آؤں پھر آتی ہوں۔'' اور وہ مسعود کو دوا دے کر فوراً آ ہی جاتی تھی۔ لیکن آنٹی کو پتا نہیں کیوں یہ بات سخت ناگوار گزرتی تھی کہ وہ اس بیمار شخص کو اتنی اہمیت دیتی ہے۔ اور اس بات کو انہوں نے انا کا مسئلہ بنا لیا۔ شروع شروع میں خود ٹوکا کہ

مسعود اس کا مسئلہ نہیں ہے لیکن جب اس نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تو غالباً انہوں نے ابو جی سے کوئی ایسی بات کہی ہوگی جبھی اس روز وہ اس سے کہنے لگے۔

''بیٹا، مسعود کو اپنا محتاج مت بناؤ اسے خود بھی ہاتھ پاؤں چلانے دو۔ ورنہ وہ زندگی بھر دوسروں کا سہارا ڈھونڈتا رہے گا۔ اور بیٹا تم کب تک اس کا ساتھ دو گی۔ ویسے بھی کچھ دنوں بعد ہم نئے گھر میں شفٹ ہونے والے ہیں۔ وہاں سے تو تم صبح شام اسے دوا دینے کو نہیں آ سکو گی۔''

ابو جی کی باتیں غلط نہیں تھیں لیکن بعد از وقت اگر یہی باتیں اسے پہلے سمجھائی جاتیں تو وہ یقیناً...... مسعود کو خود اپنے آپ پر بھروسا کرنا سکھاتی۔ اب بھی وہ ایسا کر تو سکتی تھی لیکن اس کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ جب کہ ابو جی کچھ دنوں بعد نئے گھر جانے کی بات کر رہے تھے۔ وہ خاموش نہیں رہ سکی۔ کہنے لگی۔

''ابو جی! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ مسعود بھائی میرے محتاج نہیں ہیں۔ وہ جب بہتر حالت میں ہوتے ہیں تو اپنا کام خود کرتے ہیں۔ دوسری صورت میں بھی کوئی خاص طور سے مجھ سے نہیں کہتا۔ میں خود اپنی خوشی سے ان کے کام کرتی ہوں کیونکہ یہ میرا فرض ہے۔ تایا جی اور تائی جی نے جو کچھ میرے لیے کیا۔ وہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے ماں اور باپ وہی ہیں اور بیٹی ہونے کے ناطے کیا یہ میرا فرض نہیں بنتا کہ میں جب کچھ کرنے کے قابل ہوئی ہوں تو ان کے کچھ کام کر سکوں۔ آخر تائی جی نے بھی تو میرے لیے کیا ہے۔ میں کتنی سی تھی جب یہاں آئی تھی۔''

ابو جی ذرا سا مسکرائے تو وہ حوصلہ پا کر کہنے لگی۔

''مجھے آپ سے یا کسی سے بھی کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ جس طرح انہوں نے ماں باپ بن کر میری پرورش کی۔ اس طرح میں بھی بیٹی ہونے کا حق ادا کروں۔ اور میں آپ سے یہ بھی کہوں گی کہ مجھے یہاں سے لے جانے کا سوچنے سے پہلے آپ تایا جی سے ضرور پوچھ لیں اگر وہ خوشی سے اجازت دیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ آپ مجھے یہیں رہنے دیجئے گا۔''

''او کے بیٹا۔ او کے۔'' ابو جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر کہنے لگے۔

''مجھے تمہارے یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں اور میرا خیال ہے بھائی جان بھی

خوشی سے تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔''

''جی۔''

''چلو اگر تم یہیں خوش ہو تو ٹھیک ہے۔''

''شکریہ ابو جی!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں اب جاؤں؟''

''مسعود کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔'' ابو جی کے ہلکے پھلکے مذاق پر وہ ہنس پڑی۔

''نہیں۔ میں تائی جی کے پاس جا رہی ہوں۔ انہیں میری ضرورت ہے۔''

''او کے!'' ابو جی نے اسے جانے کی اجازت دی پھر اچانک جیسے کچھ یاد آیا تو پکار کر کہنے لگے۔

''سنو بیٹا۔ وہ ایسا ہے کہ ایک دو روز میں تمہاری خالہ جی آنے والی ہیں۔''

''خالہ جی!'' اس کے لیے یہ نئی اور حیران کن بات تھی۔ ''کون خالہ جی میرا مطلب؟''

''تمہاری امی کی بہن۔ آج ان کا فون آیا تھا وہ کل یا پرسوں آ رہی ہیں۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔ ''گو کہ میرا تمہارے ننھیال والوں سے کوئی تعلق نہیں رہا اور آئندہ بھی میں کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا پھر بھی اگر وہ آ رہی ہیں تو تم ان سے اچھی طرح مل لینا۔''

وہ تعلق نہ رکھنے کی وجہ سے جاننا چاہتی تھی لیکن جس طرح خالہ جی کے ذکر پر ابو جی کی پیشانی پر ہلکی پھلکی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ اس سے اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا اور صرف ''جی'' کہہ کر ان کے کمرے سے نکل آئی۔ راہداری میں آنٹی سے سامنا ہو گیا۔ اس نے سہولت سے انہیں تایا جی کی طرف جانے کا بتایا اور انہیں حیران چھوڑ کر درمیانی دروازہ پار کر آئی۔

تائی جی اپنے مخصوص تخت پر موجود نہیں تھیں اس نے ان کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو مسعود ٹیلی فون پر کسی سے بات کرتا نظر آیا۔ اس پر نظر پڑی تو اشارے سے پاس بلا کر کہنے لگا۔

''احسن بھائی کا فون ہے۔ بات کرو گی۔''

''میں کیا بات کروں بس میرا سلام کہہ دیں۔''

وہ اچانک دھڑکنوں کے شور مچانے پر گھبرا کر بولی اور بظاہر انجان بن کر دوسری

طرف دیکھنے لگی جب کہ کان مسعود کی آواز پر لگے تھے جو کہہ رہا تھا۔

''جی احسن بھائی، سمیعہ سلام کہہ رہی ہے۔ ہاں، وہ میرے پاس ہی کھڑی ہے۔''

پھر ریسیور اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

''لو احسن بھائی تم سے بات کریں گے۔'' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور کان سے لگایا اور بمشکل سلام کر سکی۔

''کیسی ہو سمیعہ؟'' وہ پوچھ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ قریب ہی کھڑے کان میں سرگوشی کر رہے ہوں۔

''جی!'' اس کا یہ ''جی'' نہ سوالیہ تھا اور نہ ہی ان کی بات کا جواب، بس آپ ہی آپ ہونٹوں سے پھسل گیا اور پھر ہر بات کے جواب میں یہی جی۔

''کیا کر رہی تھیں؟''

''جی۔''

''ابھی مسعود تمہاری شکایت کر رہا تھا۔''

''جی۔!''

دوسری طرف لمحہ بھر خاموشی اور پھر جیسے سوچ کر کہا گیا۔

''سنو، مجھے یاد کرتی ہو۔؟''

''جی۔'' دوسری طرف وہ محظوظ ہو کر ہنسے۔

''چلو کسی بات کا تو جواب ملا۔''

''جی۔؟'' اب کہ سوالیہ نشان بنی۔

''میں پھر اپنی بات دہراتا ہوں۔ تم پھر اپنا 'جی' دہرانا۔''

''جی!'' وہ سنبھل گئی اور توجہ سے سننے لگی۔

''مجھے یاد کرتی ہو۔؟''

''نہیں۔'' جلدی سے ریسیور رکھ دیا اور مسعود کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اطمینان کا سانس لیتی ہوئی تخت پر جا بیٹھی پھر اس سے پوچھنے لگی۔

''تائی جی کہاں ہیں۔؟''

''ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔''

''خیریت۔ کیا ہوا ہے کس کے ساتھ گئی ہیں؟'' وہ ایک دم پریشان ہوگئی۔

''دوپہر میں ہلکا ہلکا بخار تھا ابھی تک تیز ہوگیا تو ابو ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں۔'' مسعود نے بتایا تو وہ اس پر خفا ہونے لگی۔

''مجھے کیوں نہیں بتایا۔ کوئی میں اتنی دور تو نہیں تھی۔''

''تم کیا کرتیں؟''

''میں ان کے ساتھ جاتی۔''

''اچھا!'' وہ ہنسا۔ ''تم خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ وہ دونوں کوئی بچے نہیں ہیں جو راستہ بھول جائیں گے۔''

''راستہ بھولنے کی کیا بات ہے۔'' وہ ہنوز منہ پھلائے ہوئے بولی۔

''بھئی۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ معمولی سا بخار تھا امی کو۔ ابھی آتی ہوں گی۔ تم خود دیکھ لینا۔'' وہ اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی غرض سے بولا۔ ''چلو اب جلدی سے چائے بنا کر لاؤ۔'' وہ چپ چاپ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔



رات وہ دیر تک تائی جی کے پاس بیٹھی رہی تھی اور ان کے نہ نہ کرنے کے باوجود کبھی ان کا سر دباتی اور کبھی ٹانگیں۔ بار بار ٹمپریچر بھی چیک کرتی رہی جب تک ان کا بخار کم نہیں ہوا اور وہ سکون سے سو نہیں گئیں وہ ان کے پاس رہی۔ پھر صبح کے ناشتے کی تیاری اس کے بعد گھر کی صفائی اور صفائی وغیرہ سے فارغ ہوئی تو دوپہر کے کھانے کی فکر۔ ابھی فریج کھول کر سبزی گوشت کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ اس کی خالہ جی آ گئیں۔ تائی جی کے پکارنے پر وہ فریج بند کر کے ان کے کمرے میں آئی اور ان کے پاس امیرانہ ٹھاٹ باٹ والی خاتون دیکھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''بیٹا! یہ تمہاری خالہ ہیں۔'' تائی جی نے بتایا تو وہ پہلے جھجکی پھر بڑھ کر ان کے کھلے بازوؤں میں سما گئی۔

''میری جان! میری بچی! میری ثریا کی نشانی۔ ہو بہو اپنی ماں پر گئی ہو۔'' خالہ جی اس قسم کے جملے بولے جا رہی تھیں۔ کبھی اسے زور سے سینے میں بھینچ لیتیں اور کبھی اس کا چہرا ہاتھوں میں لے کر چومنے لگتیں۔ آخر اسے کہنا پڑا۔

''آپ بیٹھیں ناں خالہ جی!''

''ہاں!'' خالہ جی کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگیں۔ انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں یہاں۔ اور تائی جی ان کا انداز سمجھ کر کہنے لگیں۔

''بیٹا، اپنی خالہ جی کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ آرام سے بیٹھیں گی۔''

''چلو۔'' خالہ جی نے فوراً تائید کی تو اس نے ایک نظر تائی جی کو دیکھا پھر انہیں لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''خاصی سمجھدار ہے تمہاری تائی۔'' خالہ جی اطمینان سے اس کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولیں تو وہ فوراً ان کے لہجے اور پھر ان پر غور کرنے لگی۔ کہیں سے بھی تو امی سے مشابہت نہیں رکھتی تھیں۔ کہاں مفلسی کی تصویر بنی کمزور اور بیمار امی اور کہاں یہ بھاری بھرکم خاتون، قیمتی پوشاک اور سونے کا بھاری زیور ان کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

''کھڑی کیوں ہو میرے پاس بیٹھو۔'' انہوں نے کہا تو وہ چونکی اور آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ بیٹھی۔

''ثریا کے انتقال پر تمہیں دیکھا تھا۔'' خالہ جی پھر اس کا چہرا ہاتھوں میں لے کر کہنے لگیں۔

''اس وقت چھوٹی تھیں تم۔ تمہیں یاد بھی نہیں ہوگا جب کہ تمہاری صورت ہماری نگاہوں میں ایسی بسی کہ کبھی بھلائی ہی نہ گئی۔ کتنا دل تڑپتا تھا تم سے ملنے کو۔'' وہ آبدیدہ ہو گئیں اس کا سر سینے پر رکھ لیا۔

''تمہارے باپ کی بہت خوشامد کی تھی کہ وہ تمہیں ہمیں دے دے، ہماری ثریا کی نشانی ہے۔ جان سے بڑھ کر رکھیں گے لیکن تمہارا باپ مان کے نہیں دیا تھا۔''

اور وہ جیسے گزرتے وقت نے یہ تو سمجھا دیا تھا کہ جہاں امی گئی ہیں وہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا لیکن اب تک یہ نہیں سمجھ سکی تھی۔

کہ اس کے گھر کی خاموش فضاؤں میں اچانک شور کیسا اٹھا تھا۔ کون تھے وہ لوگ جن کے سروں پر اونچے شملے تھے اور وہ چیخ چیخ کر ایک ہی مطالبہ کر رہے تھے۔

''سمیعہ کو ہمیں دے دو۔ یہ ہماری ثریا کی نشانی ہے۔'' گزرتے ماہ و سال نے گو کہ اسے بہت ساری باتیں بھلا دی تھیں لیکن یہ ایک بات کبھی کبھی اس کے ذہن پر دستک

دیتی تھی اور اب جب خالہ جی نے اسی بات کو یاد کرتے ہوئے دہرایا تو وہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی اور ان کے بھاری ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کچھ کھوئے کھوئے انداز میں پوچھنے لگی۔

"کس نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تھی۔؟"

"میں نے۔ تمہارے نانا اور ماموؤں نے۔"

"نانا اور ماموؤں!" وہ خود کلامی کے انداز میں بولی اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ دروازے پر دستک دے کر مسعود نے اسے پکارا تو وہ ادھر متوجہ ہوگئی۔

"آ جائیں مسعود بھائی!" اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا تو مسعود دروازہ کھول کر ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آیا۔ وہ پہلے حیران ہوئی پھر بے حد نادم۔

"مسعود بھائی آپ۔ یہ سب آپ نے کیا ہے؟"

"کیوں؟ کیا میں نہیں کر سکتا۔؟"

"آپ مجھے بلا لیتے۔" اس کی ندامت کم نہیں ہو رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ تمہاری خالہ جی پہلی بار آئی ہیں۔ تم اطمینان سے ان کے پاس بیٹھو۔ اور سنو۔ کھانے وغیرہ کی فکر بھی مت کرنا۔"

"کیا مطلب؟" اسے یاد آیا کہ وہ کھانا پکانے جا رہی تھی۔

"کھانا بھی میں لے آؤں گا۔" وہ اطمینان سے کہہ کر جانے کے لیے پلٹا تو وہ اس کے پیچھے لپکی۔

"کھانا بھی آپ پکائیں گے۔"

"نہیں بھئی، مجھے کہاں پکانا آتا ہے۔ اگر آتا ہوتا تو ضرور پکا دیتا۔"

"پھر۔؟"

"پھر یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ جاؤ آرام سے بیٹھو۔"

وہ اسے واپس دھکیل کر خود باہر نکل گیا تو وہ خاصی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"معاف کیجئے گا خالہ جی! میں تو آپ سے چائے وغیرہ کا پوچھنا بھول ہی گئی تھی۔"

"یہ سوکھا لڑکا کون ہے؟" خالہ جی اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مسعود کے

ے میں پوچھنے لگیں۔ اسے ان کا لہجہ اور انداز بہت برا لگا۔ بمشکل ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"یہ مسعود بھائی ہیں۔ تایا جی کے چھوٹے بیٹے۔"

"بیمار ہے کیا۔؟"

"ہاں لیکن اب تو کافی بہتر ہیں۔"

"یہ بہتر ہے۔ مجھے تو قبر سے نکلا ہوا مردہ نظر آ رہا تھا۔"

"آپ یہ لیجئے ناں۔" اس نے جلدی سے سموسوں اور سیب کی پلیٹیں ایک ساتھ ان کے آگے رکھیں اور مسعود کی طرف سے ان کا دھیان ہٹانے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

"نانا جی اور ماموں جی وغیرہ کیا کرتے ہیں؟"

"انہیں کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی زمینیں جائیدادیں ہیں۔" خالہ جی کے لہجے میں تفخر سمٹ آیا۔

"زمینیں جائیدادیں۔" وہ مرعوب نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے لیے یہ بات حیران کن ضرور تھی اور حیرت چھپائے نہ چھپی۔

"ہاں اور کوئی چھوٹی موٹی زمینداری نہیں ہے۔ گاؤں کے گاؤں اپنے ہیں۔ تمہارے باپ نے نہیں بتایا تمہیں کہ تمہارا ننھیال کتنا بڑا ہے۔"

"نہیں۔" بلا ارادہ اس کے منہ سے نکل گیا پھر وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں ابو جی کے ساتھ رہی کہاں ہوں۔ عرصہ دراز کے بعد ابھی حال ہی میں تو وہ جدہ سے آئے ہیں۔"

"ارے ہاں، سنا ہے۔ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔"

"جی۔"

"بڑا کم ذات نکلا۔ ثریا تو اس کی خاطر سب کو چھوڑ آئی۔ ماں باپ، بہن بھائی اور وہ۔" وہ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر لائیں اور رقت آمیز لہجے میں کہنے لگیں۔

"تم کیا جانو بیٹا! تمہیں کسی نے بتایا نہیں۔ ثریا زندہ ہوتی تو تمہیں بتاتی کہ کس طرح تمہارا باپ اسے سنہرے خواب دکھا کر اور اپنی جھوٹی محبتوں کا فریب دے کر اونچے محلوں سے نکال لایا تھا۔ ارے شہزادیوں کی طرح پلی بڑھی تھی میری بہن اور تمہارے باپ کے گھر خون تھوکتے تھوکتے مر گئی۔"

وہ ان کی آنکھوں میں بھرے موٹے موٹے آنسوؤں سے متاثر نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی رقت آمیز لہجے سے۔ سب جھوٹ سب بناوٹ لگ رہا تھا لیکن وہ کیسے جھٹلا دیتی کہ نگاہوں میں امی کا خاموش اور بیمار وجود آ سمایا تھا۔ کمزور سا بدن جو کھانسی سے جھٹکے کھانے لگتا تھا۔

"کیا ہوا تھا امی کو۔؟" ایک طویل عرصے بعد وہ بالکل اسی طرح پوچھ رہی تھی جس طرح کبھی امی کو کھانستے دیکھ کر بے حد سہم کر ابو جی سے پوچھا کرتی تھی۔

"ٹی بی۔" خالہ جی نے اطمینان سے کہا شاید اس لیے کہ اس کے بعد کے سارے اذیت ناک لمحے آ کر گزر چکے تھے جبکہ وہ انہی لمحوں کے حصار میں مقید ہو گئی۔

"ابو جی نے علاج نہیں کروایا ان کا؟"

"کیا علاج کرواتا اور کہاں سے کرواتا۔ معمولی سی نوکری میں دو وقت کی روٹی تو دے نہیں سکتا تھا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا۔ آخر اب بھی تو پیسے کما لایا ہے لیکن محض انتقاماً اس نے ثریا کی خاطر کچھ نہیں کیا۔"

"انتقاماً۔" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"بس بیٹا! بہت لمبی کہانی ہے۔ پھر ملیں بیٹھیں گے تو بتاؤں گی۔" خالہ جی آہ بھرتے ہوئے بولیں۔

"ابھی تو میں اس لیے آئی تھی کہ مجھے معلوم ہوا تھا۔ تمہارے باپ نے دوسری شادی کر لی ہے۔ میں نے سوچا۔ تم اکیلی ہو گئی ہو گی۔ تمہیں اپنے ساتھ لے آؤں۔" پھر اس کی تھوڑی چھو کر بولیں۔ "میرے ساتھ چلو گی ناں؟"

"آپ کے ساتھ چلوں؟" وہ پرسوچ انداز میں یوں بولی جیسے انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

"ہاں۔ ویسے بھی اب یہاں کون ہے تمہارا؟ باپ ہی ہے جو اپنے بیوی بچوں میں مگن ہو چکا ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے خالہ جی!" وہ دفاع کرتے ہوئے بولی۔ "اور پھر میں تو ویسے بھی شروع سے تایا جی کے گھر رہی ہوں۔"

"تو کیا اب ساری زندگی تایا، تائی کی نوکری ہی کرتی رہو گی۔" خالہ جی کا انداز بڑا

عجیب سا تھا۔ اس کا دل چاہا انہیں ٹوک دے اور ایسی باتیں کرنے سے صاف منع کرے لیکن ایک تو وہ بڑی تھیں دوسرے پہلی مرتبہ آئی تھیں۔ اس لیے وہ برا ماننے کے باوجود انہیں ٹوک نہ سکی اور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"نوکری کی کیا بات ہے خالہ جی! یہ میرا اپنا گھر ہے۔ تایا، تائی نے میری اولاد کی طرح پرورش کی ہے۔ اور اول تو میں ان کے لیے کچھ زیادہ کرتی نہیں، پھر بھی اگر زندگی بھر بھی ان کی خدمت کر لوں تو ان کی محبتوں اور شفقتوں کا قرض نہیں اتار سکتی۔"

"رہنے دو۔ یہ محبتیں اور شفقتیں، سب دکھاوا ہے۔ اور اس میں بھی ان کی کوئی غرض پوشیدہ ہو گی۔" خالہ جی جل کر بولیں۔

"انہیں مجھ سے کیا غرض ہو سکتی ہے بھلا؟"

"ایک غرض تو ابھی سامنے نظر آئی ہے۔" خالہ جی کے راز دارانہ انداز پر وہ بغور ان کی طرف دیکھنے لگی جو کہہ رہی تھیں۔ "یہاں تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ دیکھنا ایک دن اپنے اسی بیمار اور مریل بیٹے سے تمہیں بیاہ دیں گے۔ میری مانو تو میرے ساتھ چلو۔ وہاں سب تمہارے اپنے ہیں اور پھر ابا جی نے ثریا کے حصے کی جائیداد تمہارے نام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"نہیں خالہ جی!" اسے ان ساری باتوں سے الجھن ہونے لگی۔ "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں ابو جی سے اجازت لے کر کچھ دنوں کے لیے تو آپ کے ساتھ جا سکتی ہوں لیکن ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"تم ابھی نا سمجھ، نادان ہو۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ ثریا کے حصے کی جائیداد ملنے سے تم کتنی امیر بن جاؤ گی۔"

"بس کریں خالہ جی! میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

وہ اکتا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس موضوع سے جان چھڑانے کی خاطر بولی۔ "یہ بتائیے۔ آپ کھانا یہیں کھائیں گی یا سب کے ساتھ مل کر۔"

"کھانے کا تکلف رہنے دو۔ میں اب چلوں گی۔"

"ارے کیوں خالہ جی۔ کیا آپ یہاں رہیں گی نہیں؟ اتنی دور سے آئی ہیں؟"

"نہیں۔ میں یہاں ایک شادی میں آئی ہوں اور کل مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

خالہ جی اپنا بھاری بھرکم وجود گھسیٹتی ہوئی بیڈ سے نیچے اتر آئیں۔

''اچھا تو کم از کم ابو جی کے آنے تک تو رکیں۔ ان سے مل کر جائیے گا۔''

''معاف کرنا بیٹی! مجھے تمہارے باپ سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں تو تمہاری محبت میں چلی آئی تھی ورنہ تمہارے باپ نے میری شہزادیوں جیسی بہن کے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔'' ان کی آواز حلق میں دب گئی آنسو بھر بھر بہہ نکلے۔ اسے کھینچ کر سینے میں بھینچتے ہوئے رندھی آواز میں بولیں۔

''اب تو مجھے ہر دم تمہاری فکر رہے گی۔ پتا نہیں یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں۔''

ان کے بازوؤں کے حلقے میں اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا اپنے آپ کو چھڑا کر الگ ہوئی پھر ان کے ساتھ چلتی ہوئی باہر تک آئی تو کہنے لگی۔

''نانا جی اور ماموں وغیرہ کو میرا سلام کہہ دیجیے گا۔ کبھی موقع ملا تو میں آپ سب سے ملنے آؤں گی۔''

''کاش تم ابھی میرے ساتھ چلتیں۔'' انہوں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا پھر اس کی پیشانی چوم کر گاڑی میں جا بیٹھیں۔ اس نے ہاتھ ہلا کر انہیں خدا حافظ کہا اور دروازہ بند کرنا چاہتی تھی کہ مسعود کو آتے دیکھ کر رک گئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگ تھے۔ پسینے میں شرابور، ہانپتا ہوا، دروازے سے داخل ہوتے ہی دونوں تھیلے اسے تھما دیے اور قمیض کے دامن سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔

''خالہ جی کیوں چلی گئیں۔ میں تو ان کے لیے کھانا لایا تھا۔''

''آپ اندر چلیں۔ میں یہ رکھ کر آتی ہوں۔''

وہ جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ دونوں تھیلے وہیں رکھ کر اس کے کمرے میں آئی تو وہ بیڈ پر دہرا ہوا بیٹھا تھا۔ اور لمبے لمبے سانس لینے کی کوشش میں اس کے منہ سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ پنکھا فل اسپیڈ سے کھول کر اس کے پاس آئی اور اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

''آپ سے کس نے کہا تھا۔ اتنی گرمی میں باہر جانے کے لیے۔ میں خود کھانا پکا لیتی یا کسی اور سے منگوا لیتے۔ پانی پئیں گے؟'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی تو وہ بھاگ کر

پانی لے آئی اور جلدی میں خود ہی گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''تم بہت جلد پریشان ہو جاتی ہو۔'' پانی پی کر وہ قدرے پرسکون ہوا تو بولا۔

''پریشان کیسے نہ ہوں اور یہ آپ سے کس نے کہا تھا اتنی دور جانے کے لیے۔؟''

''کسی نے نہیں۔ بس میں نے سوچا۔ تمہاری خالہ جی پہلی بار آئی ہیں۔ ان کے لیے اچھا سا کھانا لے آؤں۔ لیکن وہ چلی کیوں گئیں؟''

''کسی شادی میں جانا تھا انہیں'' پھر کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھی تو کہنے لگی۔

''پتا ہے مسعود بھائی وہ مجھے لینے آئی تھیں؟''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں آپ کو چھوڑ کر جا سکتی ہوں بھلا۔؟ میں نے صاف انکار کر دیا۔''

وہ سادگی سے بولی تھی۔

اور شام میں جب ابو جی نے اس سے خالہ کی آمد کے بارے میں پوچھا تو اچانک اس نے سوچا کہ وہ خالہ جی کی کہی ہوئی تمام باتیں دہرائے اور ابو جی کے منہ سے ان کی تردید یا تصدیق سنے۔ لیکن ایک تو ابو جی کا انداز سرسری تھا اور پیشانی پر وہی رات والی ہلکی ہلکی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ دوسرے ایک طویل عرصہ کی دوری نے اس کے اور ابو جی کے درمیان جو فاصلہ پیدا کر دیا تھا اور اس سے وہ ابو جی کی کسی بھی بات کا جواب تو سہولت سے دے دیتی تھی لیکن خود سے کوئی بات پوچھنے میں پتا نہیں کیوں ایک جھجک مانع ہو جاتی تھی۔

''یونہی ملنے آئی تھیں یا کسی خاص مقصد سے؟'' ابو جی پوچھنے لگے۔

''یونہی ملنے آئی تھیں یا پھر شاید یہ بتانے آئی تھیں۔ کہ نانا جی امی کے حصے کی جائیداد میرے نام کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا تو ابو جی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں غصہ تھا۔ خفگی تھی یا پتا نہیں کوئی اور رنگ کہ وہ سر جھکا کر رہ گئی پھر اس نے انہیں اٹھتے ہوئے محسوس کیا اور جاتے جاتے انہوں نے کہا تھا۔

''جو دولت اور جائیداد تمہاری امی کے کام نہ آئی وہ تمہیں نہیں لینی چاہیے۔''



خالہ جی کا عجیب سا لہجہ اور انداز کیونکہ خود اسے خاصا ناگوار گزرا تھا اس لیے وہ اس وقت ان کی باتوں پر توجہ نہیں دے سکی تھی لیکن اب کسی کسی وقت ان کی کہی کوئی بات

اچانک ذہن پر دستک دینے لگتی تو وہ اسے سوچتے ہوئے الجھنے لگتی تھی۔ پتا نہیں ان کی باتوں میں کہیں تک صداقت تھی کہ وہ بہر حال ایک طرح سے گڑے مردے اکھاڑنے پر ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ انہی دنوں ابو جی اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے لگے تو اس کے پاس آ کر کہنے لگے۔

"بیٹا! میں تمہیں یہاں سے لے جانے کی بات تو نہیں کرتا لیکن میری خواہش ہے کہ تم کچھ دن ہمارے ساتھ رہو۔"

"ضرور۔" اس سے پہلے تایا جی بول پڑے۔ "تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ واپس تو اسے یہیں آنا ہی ہے۔"

تایا جی کی بات پر اس کی دھڑکنوں نے خوبصورت راگ الاپنا شروع کر دیے اور یقیناً اسے اپنے چہرے پر اترتے رنگوں کا احساس بھی ہو گیا تھا جبھی وہاں سے اُٹھ آئی۔ اپنے کمرے میں آ کر بیگ میں چند جوڑے کپڑے رکھے۔ پھر مسعود کے کمرے میں آ کر اس سے کہنے لگی۔

"میں ابو جی کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

"میں جانتا تھا۔ تم ان کے ساتھ چلی جاؤ گی۔"

"لیکن میں ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہی۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "بس ابو جی کی خواہش ہے۔ میں کچھ دن ان کے ساتھ رہوں۔"

"اچھی بات ہے ضرور جاؤ تا کہ مجھے بھی کچھ دن دواؤں سے چھٹکارا ملے۔"

"جی نہیں۔ آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا پڑے گا کہ آپ دوا پابندی سے لیں گے۔"

"میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں ابو جی کو منع کر دیتی ہوں۔" وہ جانے لگی تو اس نے روک لیا۔

"ایک ہی صورت ممکن ہے پہلے آپ وعدہ کریں۔"

"اچھا بابا وعدہ کیا۔ وعدہ۔ دوا میں کبھی ناغہ نہیں ہو گا۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔ "ویسے اب تمہاری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے۔ کیونکہ احسن بھائی آنے والے ہیں۔"

"کب؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"کب!" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "اگلے مہینے تو ان کے امتحان ہیں۔ اس کے بعد

انہوں نے کہا ہے فوراً واپسی کا قصد کریں گے۔"

"اچھا۔!" اس نے سر جھکایا تو تایا جی کی بات یاد آئی۔ "پھر تو اسے یہیں آنا ہے۔"

"کچھ نہیں۔" وہ مسکرائی۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "اچھا میں چلوں۔ ابو جی انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"پھر کب آؤ گی؟"

"آ جاؤں گی، جب بھی ابو جی آئیں گے ان کے ساتھ آؤں گی۔"

"اچھا۔ چلو اگر چچا جی جانے کے لیے تیار کھڑے ہیں تو میں ان سے مل لوں۔"

وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چلتا ہوا کمرے سے نکل کر آیا تو ابو جی اور تایا جی برآمدے ہی میں کھڑے تھے۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر تایا جی کہنے لگے۔

"بھئی بلال! یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔" تایا جی کی معنی خیز مسکراہٹ پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی کہ وہ فوراً مسعود کے پاس سے ہٹ کر اندر چلی گئی۔



ابو جی کا نیا گھر بہت شاندار تھا، اس کے باوجود وہ وہاں جا کر خوش نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ فراغت اور تنہائی ایک ساتھ میسر آ گئی تھی اور جب یہ دونوں چیزیں یکجا ہو جائیں تو ذہن آپ ہی آپ مختلف خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ بس شروع کے چند دن ہی اس کی خلوتوں کو اس شخص کا خیال مہکاتا رہا جس نے نہ اظہار کیا نہ اقرار اور نہ کوئی پیمان باندھا تھا۔ بس جاتے جاتے دامن میں کچھ انمول کلیاں ڈال گیا تھا جن کے عوض وہ اپنی ہر سانس اسے دان کر بیٹھی تھی۔ اس وقت بھی وہ لان میں بیٹھی انہی انمول کلیوں کی لڑیاں پرو رہی تھی۔ جب خالہ جی آئیں وہ انہیں دیکھ کر بھی اپنی جگہ سے اٹھی ہی تھی کہ انہوں نے حسب سابق اسے کھینچ کر سینے میں بھینچ لیا۔

"میری ثریا۔!" کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا "تمہیں دیکھ کر لگتا ہے، ثریا سامنے آ کھڑی ہوئی ہو۔"

"آپ بیٹھیں ناں خالہ جی!" وہ ان کے رونے سے پریشان ہو گئی۔ بڑی مشکل سے انہیں بٹھایا۔ اور وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"جب میں نے تمہارے نانا جی کو بتایا کہ تم ہو بہو ثریا کی تصویر ہو تو وہ تم سے ملنے

کو بے چین ہو گئے۔‘‘

’’کیا نانا جی بھی آئے ہیں؟‘‘ وہ پنجوں پر اونچی ہو کر گیٹ سے باہر نظریں دوڑانے لگی۔

’’وہ کہاں آنے کے قابل ہیں۔ اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ تم ہی میرے ساتھ چلی چلو۔ میں انہیں یقین دلا کر آئی ہوں کہ تم میرے ساتھ ضرور آؤ گی۔‘‘ آخر میں اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

’’آپ کیا پئیں گی چائے یا ٹھنڈا؟‘‘ وہ ان کی بات کے جواب سے بچنے کی خاطر پوچھنے لگی۔

’’ناں بھئی، میں تو اس وقت تک کچھ نہیں پیوں گی، جب تک تم میرے ساتھ چلنے کی ہامی نہیں بھرو گی۔‘‘

’’میں کیسے ہامی بھر سکتی ہوں۔ خالہ جی! جب تک ابو جی سے بات نہ کر لوں۔‘‘ اس نے دامن بچانے کی کوشش کی اور خالہ جی بھڑک اٹھیں۔

’’اپنے باپ کی تو بات ہی نہ کرو، وہ تو کبھی بھی نہیں چاہیگا کہ تم ہمارے ساتھ رہو۔ جس طرح اس نے ثریا کو ہم سب سے جدا کیا۔ اسی طرح وہ تمہیں بھی ہم سے جدا کرنا چاہتا ہے۔‘‘

’’ایسی بات نہیں ہے خالہ جی۔!‘‘

’’ایسی ہی بات ہے۔‘‘ پھر آہ بھر کر بنگلے پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہنے لگیں۔ ’’ہائے ہائے یہ سب میری ثریا کے نصیب میں نہیں تھا۔ وہ بچاری تو ایک کوٹھڑی میں خون تھوکتے تھوکتے مرگئی۔‘‘

’’میں آنٹی کو بلا لاؤں۔‘‘ وہ ان کی باتوں سے گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اور اندر جانے کو تھی کہ گیٹ سے ابو جی کی گاڑی داخل ہوتے دیکھ کر رک گئی۔ ابو جی گاڑی سے اتر کر اسی طرف آ گئے۔ انہیں شاید خالہ جی کی آمد کا پہلے سے علم تھا۔ اس لیے اس کے سلام کا جواب دے کر خالہ جی کے سامنے بیٹھے تو کہنے لگے۔

’’مل چکیں آپ سمیعہ سے؟‘‘ انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ سمیعہ سے مل چکیں اب جاؤ۔ خالہ جی کو یقیناً ان کا انداز برا لگا تھا۔ اور اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو فوراً اٹھ کر چل

دیتا۔ لیکن خالہ جی اسی طرح جمی بیٹھی رہیں۔ اور ڈھٹائی سے بولیں۔

’’میں صرف اس سے ملنے نہیں آئی تھی۔ اسے لینے آئی ہوں۔‘‘ اس نے دیکھا ابو جی کا چہرا ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ کو کوئی سخت بات کہنے سے روک رہے ہوں۔ اور ابھی انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ خالہ جی کہنے لگیں۔

’’تم اسے میرے ساتھ جانے سے روکو گے، منع کرو گے، کیوں ...... آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے اس پر؟‘‘

’’حق کی بات مت کریں رضیہ بیگم!‘‘ صاف لگ رہا تھا ابو جی اپنی آواز پر کنٹرول رکھنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ ’’اور جہاں تک سمیعہ کو لے جانے کی بات ہے تو اسے روکنے یا آپ کے ساتھ بھیجنے کا مجھے کوئی اختیار نہیں۔‘‘

’’پھر کسے اختیار ہے؟‘‘ خالہ جی جھک کر پوچھنے لگیں۔

’’اس کے تایا اور تائی جی کو۔ کیونکہ اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت انہوں نے ہی کی۔ اور اب بھی یہ میرے پاس ان کی امانت ہے؟‘‘

’’واہ بلال احمد! یہ اچھی چال چل رہے ہو تم۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ۔‘‘

’’سمیعہ بیٹا! آپ اندر جاؤ۔‘‘ ابو جی نے فوراً اسے اندر جانے کے لیے کہا تو وہ ایک نظر خالہ جی پر ڈال کر اندر کی طرف چل پڑی، جاتے جاتے اس نے سنا خالہ جی کہہ رہی تھیں۔

’’کس جنم کا بدلہ لے رہے ہو ہم سے۔ ثریا کو تو تم نے قبر تک پہنچا کر دم لیا اور اب۔‘‘

وہ ابو جی کا جواب بھی سننا چاہتی تھی لیکن ان کی دھیمی آواز اس تک نہیں پہنچ سکی۔ پھر اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے خالہ جی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ بے حد غصے میں تھیں اور ابھی تک منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ اس کا دل چاہا ابو جی کے سامنے جا کر کھڑی ہو، اور ان سے پوچھے۔ کیا واقعی ان کے ننھیال والوں سے ان کی کوئی دشمنی ہے اور اس کی ماں کے ساتھ کیا کیا انہوں نے۔ وہ کیوں اتنی کم عمری میں خون تھوکتے تھوکتے مرگئیں۔ لیکن وہی ان دیکھی دیوار جو برسوں کی دوری نے باپ بیٹی کے درمیان حائل کر دی تھی۔ وہ اسے نہ توڑ سکی اور نہ پھلانگ سکی۔ اور پھر ابھی ابو جی واضح طور پر اس سے دستبردار ہو گئے تھے۔ اس کے

تمام اختیارات تایا جی اور تائی جی کو سونپ کر۔

خالہ جی کی آمد نے ایک بار پھر اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ پہلی بار پھر بھی اس نے ان کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن اب مکمل طور پر وہ نہ انہیں جھٹلا پا رہی تھی اور نہ ہی بھلا پا رہی تھی۔ ان دنوں وہ مسلسل ذہنی کش مکش کا شکار تھی۔ اور چاہتی تھی کوئی ہمدرد و ہمنوا ہو، جس کے سامنے وہ دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ پھر اسے مسعود کا خیال آیا اور ابھی وہ اس کے پاس جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ تایا جی اور تائی جی آ گئے۔ انہیں دیکھ کر اسے ابو جی کی بات یاد آئی، جو وہ خالہ جی سے کہہ رہے تھے۔ ''یہ سمیعہ اب بھی میرے پاس ان کی امانت ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ان انمول لمحوں کو ایک بار پھر یکجا کرنا شروع کیا، جو وہ جاتے جاتے اس کے دامن میں ڈال گیا تھا۔

''ہم نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔'' اس نے کہا تھا۔

''ہاں ہم دونوں۔''

''احسن اگلے مہینے آ رہا ہے۔'' وہ چائے لے کر آئی تو تایا جی ابو جی سے کہہ رہے تھے۔ ''میرا خیال ہے منگنی ابھی کر دیتے ہیں۔ شادی احسن کے آنے پر۔''

وہ جلدی سے چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر وہاں سے چلی آئی۔ زندگی میں اچانک کچھ لمحے بے پناہ خوشی سے ہمکنار کر جاتے ہیں۔ وہ بھی گزشتہ دنوں کی ساری کش مکش سے ایک دم آزاد ہو گئی۔ وہ سارے اندیشے اور وسوسے، جو خالہ جی کی باتوں کو سوچ کر اس کے اندر بیدار ہونے لگے تھے، وہ سب اپنی موت آپ مر گئے۔ اگر کوئی کسک رہی بھی، تو وہ بھی اس وقت دور ہو گئی، جب جاتے وقت تائی جی نے اس کے کمرے میں آ کر اسے انگوٹھی پہنائی۔ پھر اس کا چہرا ہاتھوں میں تھام کر کتنی دیر تک اسے دیکھتی رہیں۔ پہلے تو وہ نظریں جھکائے رہی پھر ذرا سی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ تائی جی کا وہی سپاٹ چہرا۔ پتا نہیں انہیں اظہار کرنا نہیں آتا تھا۔ یا وہ اظہار کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اب بھی وہ سمجھ نہیں سکی کہ وہ اس بندھن سے خوش ہیں یا ناخوش۔

''سکھی رہو۔'' تائی جی کے ہونٹوں سے بس یہی دو لفظ نکلے، پھر وہ اس کی پیشانی چوم کر کمرے سے نکل گئیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ تائی جی کے شروع سے اب تک کے رویے پر غور کرتی لیکن اب انگلی میں پڑی جگمگاتی انگوٹھی اور جس کے حوالے سے پہنائی گئی

تھی۔ اس کا خیال ہی اتنا زور آور تھا کہ کوئی اور بات سوچی ہی نہ گئی۔ اس کا دل چاہا کوئی ہو جس سے وہ ڈھیر ساری باتیں کرے۔ وہ سارے حسین خواب، جو اس نے اپنی پلکوں پہ سجائے تھے، وہ ساری خوبصورت باتیں جو اس کے حوالے سے سوچی تھیں اور اسے حیرت ہوئی کہ اس کی کوئی دوست نہیں تھی۔ اسکول، کالج میں پڑھنے کے باوجود کسی سے اتنی دوستی نہیں ہوئی کہ اپنے دل کی بات کہی جا سکے۔

رات جب سونے کے لیے لیٹی تو نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر تک ایک میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی۔ پھر اکتا کر اسے کنارے پھینک دیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا گیارہ بجنے والے تھے، اس کا ذہن آپ ہی آپ تایا جی کے گھر کی طرف چلا گیا۔

''آج تایا جی اور تائی جی کے ساتھ مسعود بھائی نہیں آئے۔'' اس نے سوچا اور اسے اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ اس وقت سے اس نے یہ بات محسوس کیوں نہیں کی۔ جب کہ اسے اسی وقت مسعود بھائی کے بارے میں پوچھنا چاہیے تھا۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی پھر کچھ سوچ کر اٹھی اور گیلری میں سے ٹیلی فون اٹھا لائی۔ اسے امید تو نہیں تھی کہ مسعود فون ریسیو کرے گا، پھر بھی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اور جب دوسری بیل پر ریسیور اٹھنے کے ساتھ ہی مسعود کی آواز سنائی دی تو اسے سچ مچ حیرت ہوئی۔

''ارے مسعود بھائی!'' وہ حیرت اور اشتیاق سے بولی۔ ''میرا خیال تھا آپ سو چکے ہوں گے۔''

''اب نیند کہاں؟'' دوسری طرف شوخی سے کہا گیا۔

''کیا مطلب؟ کیا آپ نے دوا نہیں لی؟''

''دوا کو چھوڑو، یہ بتاؤ۔ اس وقت کیسے فون کیا۔ سب خیریت تو ہے ناں۔''

''ہاں۔ بس آپ سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔''

''اچھا۔!'' وہ ہنسا۔ ''یہی خواہش میری بھی تھی۔''

''یہ بتایئے۔ آپ شام میں کیوں نہیں آئے تایا جی اور تائی جی کے ساتھ۔'' اسے پھر یاد آیا تو پوچھنے لگی۔

''کیا مجھے آنا چاہیے تھا؟'' وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

''کیوں آپ کو یہاں آنا منع ہے کیا؟''

''نہیں۔ بس اب اکٹھے ہی آؤں گا۔''

''اکٹھے۔'' وہ جان کر انجان بنی۔

''تمہیں لینے۔ اور سنو ابھی احسن بھائی کا فون آیا تھا۔'' وہ خاموش رہی تو کہنے لگا۔

''بہت مبارکباد دے رہے تھے۔''

''کسے؟'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

''مجھے۔''

''آپ کو کیوں؟''

''بھئی تمہیں دیں یا مجھے ایک ہی بات ہے۔''

''اچھا۔!'' وہ ہنس پڑی پھر بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''کب آ رہے ہیں۔''

''کہاں پاکستان یا بارات کے ساتھ؟''

''مسعود بھائی آپ!'' اس کے شرارت سے چھیڑنے پر وہ جھینپ گئی۔ اور اسی قدر کہہ کر ریسیور رکھنا چاہتی تھی کہ وہ کہنے لگا۔

''سنو! تم خوش تو ہو ناں!''

''پتا نہیں۔''

''تمہیں نہیں پتا لیکن مجھے پتا ہے۔''

''کیا؟''

''یہی کہ میں بہت خوش ہوں۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔ ''تمہیں یاد ہے ایک بار میں نے کہا تھا کہ بجھتے ہوئے دیے کو کچھ دیر اور روشن رکھنے کی خاطر ہاتھ کی اوٹ میں لے لیا جاتا ہے۔ اور اب مجھے لگ رہا ہے جیسے مجھے کچھ برس اور زندہ رکھنے کی خاطر تمہارا۔''

''مسعود بھائی! پلیز۔'' وہ فوراً ٹوک گئی۔ ''ایسی باتیں نہ کریں آپ کو زندہ رہنا ہے۔''

''ہاں اب تو خود میرے اندر بھی زندہ رہنے کی خواہش جاگنے لگی ہے، اور یہ یقیناً تمہاری دواؤں، دعاؤں اور محبتوں کا اعجاز ہے کہ مجھ جیسا مایوس بندہ بھی زندگی سے پیار کرنے

لگا ہے۔''

''یہ اچھی بات ہے زندہ رہنے کی خواہش اور زندگی سے پیار انسان کو بہت مضبوط بنا دیتا ہے۔ اور اب انشاءاللہ آپ اپنی بیماری کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''ہاں، احسن بھائی بھی یہی کہہ رہے تھے۔''

''اور کیا کہا انہوں نے؟'' وہ اپنے حوالے سے کوئی بات سننا چاہتی تھی۔

''زیادہ بات نہیں ہو سکی، کیونکہ اچانک لائن کٹ گئی تھی۔''

''اچھا۔ اب آپ بھی آرام کریں۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔'' اس نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر فون گیلری میں رکھ کر واپس آئی اور لائٹ آف کر کے لیٹ گئی۔



وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ یا پھر شادی کی تیاریوں میں یوں گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ آنٹی نے خود اس کا جہیز تیار کیا تھا۔ اور آپ خود اپنے ہاتھوں سے اسے سنوارا پھر اسے بیڈ پر بٹھا کر باہر کے انتظامات دیکھنے چلی گئیں، کچھ دیر بعد واپس آ کر آنچل سے اس کا چہرا چھپاتے ہوئے کہنے لگیں۔

''نکاح کے لیے لوگ آ رہے ہیں۔ تم پلیز رونا مت۔ میں نے اتنی محبت سے تمہیں تیار کیا ہے۔'' اس نے چپ چاپ پیشانی گھٹنوں پر ٹکا لی اور اندر آتے قدموں کی چاپ سننے لگی۔ پھر کوئی اس کے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور خاموشی کا سینہ چیرتی صرف ایک آواز۔

''سمعیہ بلال احمد تمہیں مسعود جلال احمد سے نکاح قبول ہے۔''

اس کے کانوں میں جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا۔ کہنے والے سے غلطی ہوئی یا اس نے غلط سنا۔ یہ کیسے ممکن ہے بھلا۔ وہ پوری جان سے متوجہ ہو گئی۔

''مسعود جلال احمد سے نکاح قبول ہے۔'' دوسری بار کہا گیا اور یوں لگا کمرے کی ساری دیواریں اس کے اوپر آ گری ہوں۔ ملبے کے ڈھیر تلے دبتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے سسکی کی آواز نکلی اور جیسے سانس لینے کو اس نے سر باہر نکالنا چاہا تھا کہ کوئی ہاتھ اس کے سر پر آن ٹھہرا۔

''مسعود جلال احمد سے۔'' اور اس نے ساری شرم ساری مصلحتیں بالائے طاق

رکھ کر سر پر ٹھہرا ہاتھ جھٹک کر سر اونچا کر لیا۔ عین سامنے تایا جی اور ابو جی کھڑے تھے۔ دونوں کے چہرے روشن اور چمکتے ہوئے کہیں کوئی پشیمانی نہیں، کہیں کسی دھوکے کا شائبہ نہیں۔ ایک وہ جس نے اس کی ماں کو خون تھوکنے پر مجبور کیا۔ دوسرا وہ جو اپنے بیمار بیٹے کو کچھ برس اور زندہ رکھنے کی خاطر اس کے آنچل کی پناہ دینا چاہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بجھتے ہوئے دیے کو ہتھیلی کی اوٹ میں لیا جاتا ہے۔ ان چمکتے چہروں نے اس کے اندر آگ لگا دی۔ دل چاہا نہیں کی صورت اتنی زور سے چیخے کہ اس کی آواز دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک سنی جائے۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہو۔

''بیٹا! اپنے ابو جی کا خیال رکھنا۔'' امی نے کہا تھا۔ اور اب لگا جیسے وہ پاس آ بیٹھی ہوں۔ ''اپنے باپ کا سر جھکانے سے پہلے اپنا سر جھکا دو۔''

''بیٹا! ہاں کہو۔'' آنٹی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دباؤ ڈال کر اس کا سر جھکاتے ہوئے سرگوشی میں بولیں، تو وہ سسک پڑی۔

''ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔''

کمرے کی خاموش فضاؤں میں مبارک سلامت کا شور اٹھا جس میں اس کی سسکیاں دب کر رہ گئیں۔ پھر اس کے بعد جامد خاموشی، ہونٹ آپ ہی آپ سل گئے۔ کانوں پر دبیز پردے آ گرے اور آنکھیں سارے سپنے کھو کر ویران ہو گئیں۔

''ان کی محبتوں میں بھی کوئی غرض پوشیدہ ہو گی۔'' سیج پر بیٹھی تو خالہ جی کی باتیں ذہن میں دستک دینے لگیں۔

''یہاں رہیں تو دیکھنا اپنے اسی بیمار بیٹے سے بیاہ دیں گے۔''

''کس جنم کا بدلہ لے رہے ہو بلال احمد! پہلے ثریا کو قبر تک پہنچا کر دم لیا اور اب۔''

''اب میری باری ہے۔'' اس نے سوچا۔ اور تکیے سے کمر لگائی اور سر بیڈ کی پٹی پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ نہ دل دھڑکا نہ اندر کوئی کلی چٹکی وہ جس طرح بیٹھی تھی اسی طرح بیٹھی رہی۔ جب مسعود اس کے سامنے آ بیٹھا۔ تب وہ پلکوں کے در کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ سدا کا کمزور اور بیمار چہرا اس وقت قدرے سرخی مائل ہو رہا تھا۔

''سمیعہ!'' وہ اپنی خوشی میں مست اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔ ''میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی میری زندگی میں بھی بہار آ سکتی ہے۔ لیکن تمہاری محبت نے تو اچانک ایسے

پھول کھلائے ہیں کہ میں صرف چند برس نہیں بلکہ برس ہا برس جینے کی تمنا کرنے لگا ہوں۔''

''میری محبت۔!'' اس نے سوچا اور دل چاہا زور زور سے ہنس کر اس کا مذاق اڑائے لیکن وہ اسی طرح ہونٹ بھینچے بیٹھی رہی اور وہ کہنے لگا۔

''مجھے ہمیشہ یہ ملال رہے گا کہ میں نے در دل پر تمہاری محبت کی دستک سننے میں بہت دیر کر دی۔ کاش میں اسی روز جان جاتا جس روز تم نے کہا تھا کہ تم سب کچھ بھول سکتی ہو، یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی لیکن مجھے نہیں۔'' وہ چونک گئی۔ کیا کہہ رہا تھا وہ۔

''اور میں تو اس کے بعد بھی نہیں جان پایا وہ تو جب ابو نے میری اور تمہاری شادی کی بات کی تو پہلے میں حیران ہوا کہ یہ ممکن نہیں ہے اور میں نے ابو سے کہا کہ سمیعہ مجھ سے شادی پر رضامند نہیں ہو گی۔ ابو میری بات پر بہت ہنسے پھر کہنے لگے کہ وہ لڑکی جو اتنی محبت سے تمہارا خیال رکھتی ہے۔ وہ تم سے شادی کیوں نہیں کرے گی۔ اور اس روز جب میں نے تمہارے بارے میں نئے انداز سے سوچا تو احساس ہوا کہ تم تو ایک عرصے سے میرے دل کے دروازوں پر دستک دے رہی ہو۔ میں ہی بے خبر ہوں۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''واقعی محبت میں بڑی طاقت ہے۔ مردوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ مجھے دیکھو میں جو ٹوٹا ہوا شکستہ سا اور اپنے آپ سے حد درجہ مایوس انسان تھا تمہاری محبت کا احساس ملتے ہی جی اٹھا ہوں۔'' پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شرارت سے بولا۔

''تم ناحق مجھے دوائیں پلاتی رہیں۔ اگر اول روز ہی اظہار کر دیتیں تو میں اسی وقت بھلا چنگا ہو جاتا۔'' وہ اسی طرح ہونٹوں کو ایک دوسرے پر جمائے بیٹھی تھی۔ اس کے پاس ان ساری باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو اب کیا کہتی کہ زندگی کی بازی تو ہار ہی چکی تھی۔ بے غرض اور پر خلوص محبتوں کے عوض۔ اسے یقیناً مسعود سے محبت تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ احسن بھائی کو پیارا تھا۔ لیکن تایا جی کو جانے کیسے غلط فہمی ہو گئی کہ اس کی محبت اور خدمت کو کسی اور ہی انداز سے سوچا۔ اسے یاد آیا تایا جی نے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر ابو جی سے کہا تھا۔

''یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔''

اس وقت اسے تایا جی کا لہجہ عجیب سا ضرور لگا تھا۔ لیکن یہ تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک سوچ لیں گے۔ اور شاید کچھ غلطی اس سے بھی ہوئی تھی کہ اس نے صرف اتنا

سنا کہ احسن کے آنے پر شادی ہوگی اور اس کے بعد یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ اسے کس کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔

''تم بھی کچھ کہو ناں؟'' وہ اس کا ہاتھ دبا کر بولا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی، پھر طویل سانس لے کر بولی۔

''میں کیا کہوں؟''

''وہی ساری باتیں جو ایک مدت سے تم اپنے دل میں چھپائے ہو اور وہ سارے خواب جو اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے ہیں۔''

''مسعود جلال احمد۔!'' اس نے سوچا۔ ''اگر تم ساری باتیں سن لو جو میں نے اس شب کے لیے دل میں ذخیرہ کر رکھی تھیں اور میرے خوابوں کی ایک ذرا سی جھلک بھی دیکھ لو تو تم جو برسہا برس جینے کی تمنا لیے بیٹھے ہو تو وہ سارے برس ایک پل میں سمٹ جائیں گے۔''

''اے کیا سوچنے لگیں؟'' وہ اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں۔'' مسکرانے کی کوشش میں پلکیں نم ہوگئیں تو اس نے جلدی سے پیشانی گھٹنوں پہ ٹکا لی۔

''دیکھو، احسن بھائی نے ہمیں شادی پر کیا تحفہ بھیجا ہے۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل سے پیکٹ اٹھایا تو وہ ایک دم سر اونچا کر کے پوچھنے لگی۔

''احسن بھائی خود نہیں آئے؟''

''نہیں۔''

''کیوں، جبکہ تایا جی تو کہہ رہے تھے ان کے آنے پر شادی کریں گے۔'' وہ کچھ الجھتے ہوئے بولی۔

''ہاں ارادہ تو یہی تھا۔ لیکن گزشتہ ہفتے احسن بھائی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ابھی وہ نہیں آسکتے۔''

وہ مسلسل پیکٹ کھولنے میں مصروف تھا۔ سرسری انداز میں بولا تو وہ دل میں مچلتے بقیہ سوالوں کو روک کر اس کی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ جو کاغذ پر چپکے ٹیپ کو اتارنے کی کوشش میں جھٹکے کھا رہی تھیں۔



پہلے بھی وہ اسی گھر میں رہتی تھی۔ کوئی روک ٹوک کوئی پابندی نہیں تھی۔ اور نہ اس کے اندر کسی تشنگی کا احساس یا کوئی کسک تھی اور اب جبکہ وہ ہر چیز کی بلاشرکت غیرے۔ مالک ہوگئی تھی تو بے پناہ تشنگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ گو کہ اب بھی اس کی روٹین وہی تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ لیکن خود اس میں وہ بات نہیں رہی تھی۔ پہلے وہ ہر کام شوق اور لگن سے کیا کرتی تھی۔ اور اب جیسے فرض نبھانا تھا۔ وہ بھی ناگوار سا۔ طبیعت میں بیزاری جو اکثر اس کے چہرے اور پھر لہجے سے بھی چھلکنے لگتی تھی۔

''مسعود دوا لے لیں۔'' یہ بات کہتے ہوئے پتا نہیں کیوں اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ جاتیں۔ اور جب وہ دوا کے بجائے اس کا ہاتھ تھام لیتا تو وہ چڑ جاتی۔

''چھوڑیں میرا ہاتھ مجھے اور بھی کام کرنے ہیں۔'' پھر ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر چلی جاتی، اور وہ اسے محبت کا انداز سمجھتا تھا۔

سارا دن تو ادھر ادھر کے کاموں میں الجھی ہی رہتی۔ رات میں بھی جان بوجھ کر اپنے آپ کو کچن میں دیر تک مصروف رکھتی۔ وہ چاہتی تھی جب کمرے میں جائے تو مسعود سو چکا ہو۔ اور اکثر اس کا انتظار کرتے کرتے وہ سو چکا ہوتا۔ اور کبھی نیند کو شکست دے کر اس کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ اس وقت بھی وہ اپنے طور پر اس کے سو جانے کا یقین کر کے آئی تھی۔ لیکن وہ دروازے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھا تو ہلکے سے مسکرایا۔ کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ اس کے برعکس جب وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھی تو کہنے لگا۔

''تمہیں اتنا کام کرنا پڑتا ہے۔ تھک جاتی ہوگی۔'' وہ خاموش رہی۔

''امی سے کہو۔ کسی ملازمہ کا انتظام کر دیں۔ بلکہ میں خود ہی کہوں گا۔''

''نہیں۔'' وہ فوراً بول پڑی۔ ''آپ ایسی کوئی بات نہیں کریں گے۔''

''کیوں۔؟''

''گھر کا کام کوئی اتنا زیادہ تو نہیں ہوتا۔''

''زیادہ ہو یا کم پھر بھی تم سارا دن مصروف تو رہتی ہو۔ میرے پاس دو گھڑی بیٹھنے کی بھی تمہیں فرصت نہیں ہوتی۔'' کسی بھی طرح یہی شکوہ لبوں پر آ ہی گیا۔

''آپ کے پاس ہی تو بیٹھی ہوں۔'' وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر مسکرا کر بولی۔

''ہاں اس وقت جب میں تمہاری راہ تکتے تکتے تھک گیا ہوں۔ میرے اعصاب

جواب دے چکے ہیں۔ میری آنکھیں دیکھو، نیند کے زور سے بند ہوئی جا رہی ہیں۔ تمہیں ڈھنگ سے دیکھ بھی نہیں پا رہا۔"

"کیا کریں گے مجھے دیکھ کر۔ جیسی تھی ویسی ہوں۔ کوئی نئی بات نہیں۔"

"تمہیں دیکھ کر۔" وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹا پھر اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہیں دیکھ کر تو میں جی اٹھتا ہوں۔ اور تم نے یہ کیسے کہا کہ تم میں کوئی نئی بات نہیں۔ اپنے آپ کو میری نظر سے دیکھو۔"

"اچھا کبھی فرصت ملی تو دیکھوں گی۔ اب پلیز آپ سو جائیں۔ ورنہ آپ کی طبیعت۔"

"اوں ہوں۔" اس نے ٹوک دیا۔ "ہمیشہ یہ کہہ کر بات ختم کرنے کی کوشش مت کیا کرو کہ میری طبیعت خراب ہو جائے گی۔ ذرا سی باتیں کر لینے سے کچھ نہیں ہوگا مجھے، بلکہ تمہارے ساتھ بات کرتے ہوئے تو میں اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کرتا ہوں۔ کیا تمہیں میری باتیں یا میرا بولنا اچھا نہیں لگتا؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا تو وہ سنبھل کر بولی۔

"ایسی بات نہیں ہے مسعود! میں تو صرف اس خیال سے کہتی ہوں کہ زیادہ بولنے سے آپ تھک جاتے ہیں۔ آپ کی سانس۔"

"پھر تم ہی کچھ بولا کرو، خاموشی سے مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔

"اچھا کل سے میں بولوں گی۔"

"ابھی کیوں نہیں؟"

"ابھی مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"چلو تم سو جاؤ۔ ویسے بھی بہت تھک گئی ہو۔"

"اور آپ۔؟"

"میں ابھی نہیں سوؤں گا۔"

"کیوں؟"

"احسن بھائی نے آج فون کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں انہی کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی

لیکن پھر کہے بغیر رہ نہ سکی۔

"اتنی رات ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے، وہ بھول گئے ہوں گے، آپ خواہ مخواہ انتظار۔"

"رات تو یہاں ہے وہاں تو نہیں ہوگی۔ یقیناً کسی ضروری کام میں مصروف ہوں گے، جیسے ہی فارغ ہوں گے ضرور فون کریں گے، کیونکہ وہ کوئی بات کہہ کر بھولتے نہیں ہیں۔"

"اچھا۔!" وہ تلخی سے ہنسی۔ "اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہیں آپ؟"

"وہ میرے بھائی ہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔" پھر اس کی طرف دیکھ کر سادگی سے بولا۔ "تم بھی تو ان کی عادت سے واقف ہو۔"

"ہاں۔!" وہ بے دلی سے کہتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

"میں فون یہیں لے آتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"ایک تو یہ کہ باہر ہوا میں کچھ خنکی سی ہے۔ دوسرے فون کی بیل سے تایا جی اور تائی جی کی نیند میں خلل ہوگا۔"

"یہ تو ہے۔" اس نے سر ہلایا تو وہ بیڈ سے اتر کر کمرے سے نکل گئی۔ اور ابھی فون اٹھا کر واپس آ رہی تھی کہ راستے ہی میں بیل بجنے لگی، اس نے محض تایا جی اور تائی جی کے خیال سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا لیکن بولی کچھ نہیں۔

"سوری یار مسعود! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔" انہیں شاید یقین تھا کہ فوراً ریسیور اٹھانے والا مسعود ہی ہوگا۔ اس لیے معذرت کرنے لگے۔ اس نے بولنے کی بجائے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ اور جلدی سے اندر آ کر ریسیور مسعود کو تھما دیا۔ پھر خود بیٹھ کر اپنی سانسیں درست کرنے لگی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ بہت تیز بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ البتہ لہروں کے دوش پر سفر کرتی اس آواز نے اندر کا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ دھڑکنوں نے ایسا ہنگامہ برپا کیا کہ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر اس شور کو دبانے کی کوشش کرنے لگی، قدرے پرسکون ہوئی تو مسعود کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑے اصرار سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں احسن بھائی! بس اب آپ واپس آ جائیں۔ ہم سب آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔" دوسری طرف انہوں نے پتا نہیں کیا کہا کہ وہ روٹھے لہجے میں کہنے لگا۔

''سوچ لیں، اگر آپ جلدی نہیں آئے تو میں سچ مچ آپ سے خفا ہو جاؤں گا۔ لیجئے سمیعہ سے بات کریں۔'' ریسیور اسے تھما کر کہنے لگا۔'' ان سے واپسی کے لیے اصرار کرو۔''

''کیسی ہو سمیعہ۔'' ان کا لہجہ ٹھہرا ہوا اور قدرے اجنبی سا لگا۔

''جی۔!'' وہ اسی قدر کہہ سکی۔

''مسعود تو اب ٹھیک ہے ناں؟''

''جی۔!''

''تم اس کا خیال رکھنا کیونکہ۔''

''میں جانتی ہوں۔'' وہ فوراً بول پڑی۔''مسعود آپ کو بہت پیارا ہے اپنے آپ سے بڑھ کر، اور اس کی خاطر آپ سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔''

دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اس نے کچھ لمحے انتظار کیا۔ پھر ریسیور رکھ کر مسعود کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''شاید لائن کٹ گئی ہے۔''

''چلو کوئی بات نہیں پھر بات کر لینا۔'' مسعود سمجھا شاید اسے ٹھیک طرح سے بات نہ کر سکنے کا افسوس ہے۔ اس لیے تسلی دیتا ہوا بولا۔ پھر اس کے ہاتھ سے ٹیلی فون سیٹ لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

'' آؤ اب سو جاؤ۔'' وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنی جگہ پر آلیٹی۔ اور وہ تکیے کے سہارے نیم دراز ہوا تو اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کہنے لگا۔

''تمہیں نیند آ رہی تھی۔ ہم بھائیوں نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔'' وہ کچھ نہیں بولی، بہت آہستگی سے پلکیں موند لی۔

''کبھی کبھی مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کاش کبھی میں اس قابل ہو سکوں کہ اگر بڑی نہیں تو چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی تمہارے دامن میں ڈال سکوں۔'' وہ ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ ایک ساتھ اتر آئے تھے۔ اپنی بے بسی کا دکھ۔ حسرت، لاچاری اور جانے کیا کچھ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ اگر اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی تو نفرت بھی نہیں تھی۔ اور پھر اس کا دل اتنا

سخت ہرگز نہیں تھا۔ کہ کوئی مجبور و لاچار اس کے سامنے آزاد ہو۔ اور دل تڑپے ناں اور مسعود ''کوئی'' نہیں اس کا شوہر تھا۔ اس نے تڑپ کر اپنے بالوں میں حرکت کرتا اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر ہونٹوں سے لگا کر بولی۔

''میرے لیے سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ مجھے آپ کا ساتھ میسر ہے۔ اس سے زیادہ کی مجھے آرزو نہیں۔''

''پھر بھی سمیعہ! میرا دل چاہتا ہے۔''

''کہ آپ ہر وہ کام کریں جس کے لیے آپ کو منع کیا گیا ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر مسکرا کر بولی۔ تو وہ اپنی بات یاد کر کے ہنس پڑا۔



پتا نہیں تایا جی کو غلط فہمی کے سبب ایسا ہوا تھا یا تقدیر نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا کہ اس کا اس گھر میں ہمیشہ رہنے کا خواب پورا ہوا بھی تو مسعود کے حوالے سے۔ بہر حال اب آئندہ زندگی کا دارومدار خود اس پر تھا کہ وہ رو رو کر کڑھ کر گزارتی یا ہنس کر۔ اور اب تک تو وہ مسلسل کڑھتی رہی تھی کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ کبھی خالہ جی کی باتیں یاد آتیں تو تایا جی اور تائی جی قصور وار نظر آتے۔ کبھی ابو جی اور کبھی احسن بھائی کا خیال آتا۔ اور اگر اس سارے قصے میں کوئی بے قصور اور معصوم نظر آتا تھا تو وہ مسعود تھا۔ جسے یہ احساس دلایا گیا تھا کہ وہ یونہی اس کا خیال نہیں رکھتی۔ بلکہ اس سے محبت کرتی ہے اور بدلے میں وہ اس سے بڑھ کر اسے چاہنے لگا تھا۔ اور وہ اول روز سے جو اس سے متنفر ہوئی تو پھر اسے بے قصور سمجھنے کے باوجود اس کے ساتھ اپنا رویہ ٹھیک نہیں کر سکی تھی۔ لیکن رات جس طرح وہ بے حد آزردہ نظر آ رہا تھا۔

اس سے وہ بہت دیر تک اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی کہ جب اس کا قصور ہی نہیں ہے تو وہ کیوں اس سے بدلہ لے رہی ہے۔ پھر آخر میں اس نے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے سوچا تھا کہ آئندہ کم از کم وہ مسعود کو کبھی تنگ نہیں کرے گی۔

اگلے دن ہی اس نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اپنے آپ کو بہت خوش ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ وہ سارے غیر ضروری کام جن میں محض مسعود سے دور رہنے کی خاطر اپنے آپ کو مصروف رکھتی تھی، وہ سب چھوڑ دیے اور زیادہ سے زیادہ وقت اسے دینے لگی۔

اور بعض اوقات کوئی انتہائی ضروری کام بھی درمیان میں چھوڑ کر اس کے پاس آ جاتی۔ محبت سے اٹھلا کر پوچھتی۔

''آپ نے مجھے آواز دی تھی؟''

''دل نے پکارا تھا۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر والہانہ نظروں سے دیکھتا۔

''دیکھ لیں۔ آپ کے دل کی آواز میں نے وہاں تک سن لی۔''

''یہاں آ بیٹھو۔ دل کی مزید باتیں بھی سن لو۔''

''بس دو منٹ میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ وہیں سے پلٹ جاتی پھر جلدی جلدی اپنا کام نپٹا کر فراغت سے اس کے پاس آ بیٹھتی۔

چند دنوں میں ہی اس نے مسعود میں بڑی خوشگوار تبدیلی محسوس کی۔ اس کی آنکھوں کی بجھتی جوت پھر سے جگمگانے لگی تھی۔ اور وہ خاصا فریش نظر آنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ کسی کسی وقت اس کے پاس کچن میں آ کھڑا ہوتا اور کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ شاید اس نے ٹھیک کہا تھا کہ محبت میں بڑی طاقت ہے۔ مردوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ وہ سچ مچ اسے زندہ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ گو کہ اس کا چہرا ویسا ہی سوکھا ہوا تھا۔ لیکن اس پر وہ ویرانی اور مایوسی نہیں رہی تھی۔

اس کے برعکس اندرونی خوشی اور محبت پا لینے کے رنگ جھلملانے لگے تھے۔ اور پہلے جو اس کے اندر قوت مدافعت کی زبردست کمی تھی۔ اب وہ صورت حال بھی نہیں رہی تھی۔ پہلے بلکہ شروع سے اس نے دیکھا تھا کہ وہ معمولی سی تکلیف کو بھی اپنے اوپر طاری کر لیتا تھا۔ جس کی وجہ سے تکلیف نہ صرف بڑھ جاتی تھی۔ بلکہ کوئی اور بیماری بھی ساتھ لگ جاتی تھی۔ اور اب وہ ہر تکلیف کو بہت سرسری انداز میں لے کر اکثر چھپانے کی کوشش بھی کرنے لگا تھا۔

سانس کا مرض تو اسے پیدائشی طور پر لاحق تھا۔ جو مسلسل دوا و علاج سے کبھی کم ہو جاتا۔ اور کبھی ہر دوا بے اثر ثابت ہوتی۔ بہر حال اس سے مستقل چھٹکارا پانا نہیں ممکن تھا یا نہیں۔ لیکن وہ اپنے اس مرض پر قابو کی کوشش ضرور کرنے لگا تھا۔ اور ہو سکتا ہے، کبھی وہ اس کی محبت اور اپنی قوت ارادی سے اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا کہ وہ ایک بار پھر کٹھور بن گئی۔

اور وہ کٹھور یونہی نہیں بنی تھی۔ اپنی محبتوں کے جو پر اس نے پھیلائے تھے۔ انہیں یونہی نہیں سمیٹ لیا تھا۔ خود اس کے دل پر چوٹ پڑی تھی۔ اچانک حقیقتوں سے آشنائی ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ اس رات اپنے کمرے میں جانے سے پہلے وہ حسب معمول تائی جی سے یہ پوچھنے کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ان کے کمرے میں جانے لگی کہ اپنا نام سن کر دروازے ہی میں رک گئی۔ تائی جی کہہ رہی تھیں۔

''میں سمیعہ کے رویے سے بہت فکر مند تھی۔ اور مجھے کسی طرح بھی یہ شادی کامیاب ہوتی نہیں لگ رہی تھی۔ لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔''

قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

''میرا ارادہ اسے احسن سے بیاہنے کا تھا۔ مسعود کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''

''اور میں نے اسی روز سوچ لیا تھا جس روز تم نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہا تھا کہ ہمارے بعد مسعود کا کیا ہوگا۔''

''تایا جی کی بات پر وہ چونک گئی۔ جو تائی جی کو گزری کوئی بات یاد دلا کر کہہ رہے تھے۔

''پہلے میرا ارادہ بھی احسن اور سمیعہ کی شادی کرنے کا تھا۔ لیکن جب مسعود کا خیال آیا تو میں نے سوچا کہ ابھی تو یہ دونوں مسعود کا خیال رکھ رہے ہیں۔ لیکن شادی کے بعد ان کی اپنی زندگی ہوگی۔ اور پھر بچوں میں مصروف ہو کر تو یہ مسعود کو بالکل ہی بھول جائیں گے۔ پھر مسعود کی حالت ایسی تھی کہ کوئی اپنی لڑکی دینے پر تیار نہ ہوتا۔ یوں میں نے مسعود اور سمیعہ کی شادی کے بارے میں نہ صرف سوچا بلکہ اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا۔''

کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگے۔

''بلال اس رشتے پر راضی نہیں تھا۔ چھوٹتے ہی کہنے لگا۔ مسعود کے بجائے احسن کی بات کریں۔ میں نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن خود سمیعہ ایسا ہی چاہتی ہے۔ اور پھر مجھے اسے یقین دلانا پڑا کہ سمیعہ اور مسعود ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور یہ یقین دلانے کے لیے مجھے کوئی خاص تردد نہیں کرنا پڑا۔ سمیعہ ویسے بھی مسعود کا خیال رکھتی تھی۔

بلال احمد نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سمیعہ ہر کام چھوڑ کر مسعود کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ جب تک اپنے ہاتھوں سے اسے دوا نہ پلا لے۔ چین سے نہیں بیٹھتی۔''

''یہ زیادتی ہے۔'' تائی جی کی متاسف آواز آئی۔

''کیسی زیادتی؟ کیا میں نے اسے پالا پوسا اور تعلیم نہیں دلائی اگر وہ میرے بیٹے۔''

''میرے خدا۔!'' اس نے اپنے چکراتے سر کو دیوار سے ٹیک دیا۔

آگاہیاں کس قدر عذاب دیتی ہیں۔ کاش وہ بے خبر رہتی۔ لیکن شاید آگاہیوں کے عذاب اس کے مقدر میں لکھے تھے، کہ نہ تقدیر کی ستم ظریفی تھی اور نہ تایا جی کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ بلکہ یہاں تو باقاعدہ پلان کے تحت تایا جی نے اس کی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ وہ اس فکر سے آزاد ہو کر مرنا چاہتے تھے کہ ان کے بعد ان کا بیٹا...... بے یار و مددگار نہیں رہے گا۔ اور اس کے لیے انہوں نے کسی اور کا نہیں اپنی سگی بھتیجی کے ارمانوں کا خون کر ڈالا تھا۔ یہ باتیں اگر تائی جی کرتیں تو شاید اتنا دکھ نہ ہوتا۔ لیکن تایا جی نے تو اس کا ہر رشتے پر سے اعتبار ہی اٹھا دیا تھا۔

''کیا میں نے اسے پالا پوسا تعلیم نہیں دلائی۔ اگر وہ میرے بیٹے۔''

تایا جی کی بات خالہ جی کی بات کو سچ ثابت کر رہی تھی جو انہوں نے کہی تھی۔

''ان کی محبتوں میں بھی کوئی غرض پوشیدہ ہے۔ دیکھنا ایک دن اپنے اسی بیمار بیٹے کے ساتھ تمہیں بیاہ دیں گے۔''

وہ بمشکل تمام اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی برآمدے تک آئی اور پھر وہیں ٹھنڈے فرش پر ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ابتدائی دسمبر کی خنک رات تھی۔ اور اس کے اندر ایسی آگ لگی تھی کہ تن من سلگنے لگا تھا۔ ذہن الگ ماؤف ہو گیا تھا۔ کتنی دیر گزر گئی۔ وہ کوئی بات نہ سوچ سکی۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ مسعود اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ بس خالی خالی نظروں سے آنگن میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظریں دوڑاتی رہی۔ پھر تھک کر پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی۔ تو اندر کا سارا لاوا آنکھوں کے رستے بہہ نکلا۔

''پتا نہیں ابتدا کہاں سے ہوئی۔'' وہ سوچنے لگی۔

''امی کے مرنے کے بعد سے یا اس سے بھی پہلے۔''

''تم نے بلال احمد! ہماری ثریا کو خون تھوکنے پر مجبور کیا۔'' خالہ جی کی باتیں یاد

آنے لگیں۔

''کس جنم کا بدلہ لے رہے ہو، پہلے ثریا کو قبر تک پہنچا کر دم لیا اور اب۔''

''سمیعہ! کندھے پر مسعود کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے اس نے گھٹنوں پر سے سر اونچا کیا۔ لیکن نہ تو اس کی طرف دیکھا اور نہ بہتے آنسوؤں پر بند باندھنے کی کوشش کی۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' وہ اس کی پشت پر کھڑا قدرے آگے جھک کر پوچھ رہا تھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو قدم بڑھا کر اس کے سامنے آ گیا۔ اور جب اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر نظر پڑی تو ایک دم پریشان ہو کر اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے بولا۔

''تم رو رہی ہو کیا ہوا ہے تمہیں؟'' وہ کچھ نہیں بولی بس نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔

''مجھ سے خفا ہو؟''

''امی، ابو نے کچھ کہا ہے؟'' ہنوز خاموشی۔

''اچھا اندر تو چلو، یہاں سردی بڑھ رہی ہے۔'' اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔

''ٹھیک ہے میں بھی یہیں بیٹھ جاتا ہوں۔''

وہ اس کے برابر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گیا۔ تب بھی اس نے حرکت نہیں کی نہ ہی اسے یہاں بیٹھنے سے منع کیا یہ جاننے کے باوجود کہ سرد موسم میں ذرا سی بے احتیاطی اس کے لیے کتنی نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور اس نے کوئی گرم کپڑا بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔

''مجھے نہیں بتاؤ گی۔'' وہ محبت سے بولا۔

''کیا ضروری ہے۔ میں ہر بات تمہیں بتاؤں۔'' اس کے اندر کی تلخی لہجے میں سمٹ آئی، جسے محسوس کرنے کے باوجود اسی طرح محبت سے بولا۔

''ہاں۔!''

''کیوں؟'' وہ تنک کر بولی۔

''اس لیے کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ تمہارے دکھ سکھ کا ساتھی۔''

''تم میرے شوہر ضرور ہو، لیکن میرے دکھ سکھ کے ساتھی ہرگز نہیں ہو۔''

وہ انتہائی سنگدلی سے کہتے ہوئے اٹھی اور اسے وہیں چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ کچھ دیر

بعد وہ اس کے پیچھے آیا تو وہ شیلف کے پاس کھڑی پتا نہیں کس چیز کی تلاش میں چیزوں کو ادھر ادھر کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک خاموش کھڑا خود ہی اس کے بگڑے موڈ کے بارے میں قیاس کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بڑھ کر پیچھے سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''کم از کم ناراضگی کی وجہ تو بتاؤ، تاکہ۔''

''مت چھیڑو مجھے۔'' وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر دور ہٹ گئی۔ ''میں کچھ نہیں سنوں گی، کچھ نہیں کہوں گی، بس مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

وہ اسے دھکیل کر کونے میں رکھی کرسی پر جا بیٹھی تو وہ اس کے لہجے اور انداز پر الجھتا ہوا اپنی جگہ پر آلیٹا۔ ویسے بھی اب اس میں کھڑے رہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ باہر کی سرد فضا براہ راست اس کے سینے پر اثر انداز ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ سانسوں کو ہموار رکھنے میں کامیاب رہا۔ لیکن پھر تھک گیا۔ ہار گیا۔ دو تین بار بے چینی سے کروٹ بدلی پھر اوندھا ہو گیا۔ سینے میں سانس اٹک رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے منہ سے مخصوص آواز نکلنے لگی، پھر وہ اٹھ بیٹھا۔ اور دونوں بازو گھٹنوں پر رکھ کر ان پر پیشانی ٹیک لی۔ وہ بہت خاموشی سے اس کی بگڑتی حالت دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہمیشہ تو ایسے وقت میں وہ اس کے لیے ایک پیر پر کھڑی رہتی تھی۔ کبھی پیٹھ سہلاتی، کبھی پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگاتی۔ کبھی دوا اور کبھی چائے کا پوچھتی لیکن اس وقت وہ سنگدلی کی انتہا کر گئی۔ خاموش تماشائی بنی بیٹھی رہی۔

اصل میں وہ بھول گئی تھی کہ وہ اس کا شوہر ہے۔ یہ بھی بھول گئی کہ کبھی احسن بھائی نے اس کا خیال رکھنے کے لیے کہا تھا۔ بس اتنا یاد رہا کہ یہ اس شخص کا بیٹا ہے۔ جس نے محض یہ اطمینان حاصل کرنے کے لیے کہ اس کے بعد اس کا بیمار بیٹا بے یارومددگار نہیں رہے گا۔ صرف اس کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے اس کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ باقاعدہ پلان کے تحت اور ابو جی سے بھی جھوٹ بولا کہ وہ مسعود کو پسند کرتی ہے۔

پھر اس کی سنگدلی اور کٹھور پن اسی رات پر ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اس رات کے اختتام پر اس کے اندر ایک اور لڑکی بیدار ہو چکی تھی۔ جس نے غالباً تایا جی سے بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی کہ پہلے وہ مسعود سے پھر گھر سے اور آخر میں اپنے آپ سے بھی لاپروا ہو گئی۔ دل چاہتا تو

کوئی کام کرتی، ورنہ صاف انکار کر دیتی۔ شاید اس کے اندر یہ احساس مٹ گیا تھا کہ تایا جی اور تائی جی نے اسے پرورش کر کے اس پر احسان کیا ہے۔ اس کے برعکس وہ اب اس انداز سے سوچنے لگی تھی۔

''کوئی احسان نہیں کیا۔ اور اگر کیا ہے تو اس کی قیمت وصول کر چکے ہیں۔ میں اب مزید اس گھر کی باندی بن کر نہیں رہ سکتی۔''

شروع میں تائی جی اس کے رویے پر حیران ہوئیں۔ لیکن باز پرس نہیں کی بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ کہ شاید خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن جب کافی دن گزر گئے، اس کے رویے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تو اسے پاس بٹھا کر کہنے لگیں۔

''بیٹا! اگر تمہیں ہم سے کوئی شکایت ہے تو مجھ سے کہو۔''

''کیا کہوں؟'' وہ الٹا انہی سے پوچھنے لگی۔

''جو بھی شکایت ہے۔''

''کوئی شکایت نہیں۔'' وہ بیزار لہجے میں اکتا کر یوں بولی جیسے بات کو یہیں ختم کر دینا چاہتی ہو۔ اور اٹھ کر جانا بھی چاہتی تھی کہ تائی جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''پھر تمہیں کیا ہوا ہے؟ چلو ہماری بات چھوڑو، خود اپنی حالت دیکھی ہے تم نے۔ ہفتے بھر سے یہی کپڑے پہنے ہوئی ہو۔ بالوں میں کنگھی تک نہیں کی آخر کیوں؟''

''کس کے لیے کروں یہ سب؟'' وہ سارے لحاظ بھول گئی۔

''اپنے لیے کرو۔ ماشاء اللہ شادی شدہ ہو۔ تمہارا شوہر ہے۔''

''اچھا۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ ''جب میرا شوہر اپنی بیماریوں سے نکل کر خود اپنے ہاتھوں چار پیسے کما کر میرے لیے کچھ کرے گا۔ تب میں بھی اس کے لیے ہار سنگھار ضرور کروں گی۔''

''سمیعہ۔!'' تائی جی ایک دم سناٹے میں آ گئیں۔

''میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تائی جی۔!'' وہ ذرا بھی اپنی بات پر نادم نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے، تم نے غلط بات نہیں کی لیکن تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مسعود محنت مشقت کے قابل نہیں ہے۔''

''ہاں، میں جانتی ہوں لیکن آپ نے جانتے بوجھتے بھی انجان بن کر اس کے سر

پر بیوی کا بوجھ لاد دیا۔"

"بوجھ کیوں۔ کیا تمہارے تایا جی پورا نہیں کرتے؟"

"کب تک۔ کب تک تائی جی، ہر شخص کو ہمیشہ نہیں رہنا۔ کبھی آپ نے سوچا۔ تایا جی کے بعد ہمارا کیا ہوگا۔"

"خدا سے خیر مانگو بیٹی۔!"

"خیر ہی مانگتی تھی۔ اور دن رات جن کی خیر مانگتی تھی۔ انہوں نے ہی۔"

اس کا گلا رندھ گیا۔ آواز ساتھ چھوڑ گئی۔ آنکھیں جل تھل ہوئیں تو وہ ان کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ مسعود کہیں جانے کو تیار کھڑا تھا۔ اسے بیڈ پر اوندھے منہ گرتے دیکھا تو اس کے پاس چلا آیا۔

"کیا بات ہے، ٹھیک تو ہو تم۔"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" وہ پھٹ پڑی۔ "مجھے کیا ہونا ہے، تم میری فکر میں مزید دبلے مت ہو۔"

وہ ٹھٹھک کر پیچھے ہٹا اور پھر کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔



تائی جی نے اس سے نرمی سے بات کی تھی اور نرمی ہی سے سمجھانا چاہا تھا۔ لیکن وہ الٹا ان کے گلے پڑ گئی تھی۔ پھر شاید انہوں نے ہی تایا جی سے کہا ہوگا کہ اس رات تایا جی نے اسے اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ ان کا انداز تائی جی سے یکسر مختلف تھا۔ انہوں نے سمجھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ تحکمانہ لہجے میں کہنے لگے۔

"میں بہت دنوں سے نوٹ کر رہا ہوں۔ یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے تم نے؟ یہ گھر اور ہم سب تمہارے لیے نئے یا اجنبی نہیں ہیں شروع سے یہیں رہی ہو، تم یہیں پلی بڑھی ہو، اور پروان چڑھی ہو، پھر اب تمہیں اس گھر سے کیا شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ تم کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں؟"

اس نے ہونٹ بھینچ کر سر جھکا لیا۔

"اپنا حلیہ دیکھا ہے تم نے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس گھر کی نہ صرف بیٹی، بہو بلکہ سیاہ وسفید کی مالک ہو۔ پھر کس بات کا شکوہ ہے تمہیں؟"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"کچھ اندازا ہے تمہیں کہ تمہاری ان حرکتوں سے مسعود کی صحت پر کتنا اثر پڑ رہا ہے۔ ہمارا نہیں تو اس کا خیال کرو۔ آخر پہلے بھی تو تمہیں اس کا خیال رہتا تھا اور اب جبکہ وہ تمہارا شوہر ہے، تو تم اپنے ناروا سلوک سے اسے ایذا پہنچا رہی ہو۔ حالانکہ اب تو تمہیں اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ اور تم ہو کہ نہ وقت پر دوا نہ کھانا۔ رات رات بھر کھانستا رہتا ہے وہ۔" وہ کن اکھیوں سے تائی جی کی طرف دیکھنے لگی، جو سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

"تم اگر یہاں نہیں رہنا چاہتیں تو صاف کہو۔ میں تمہارے باپ سے کہتا ہوں۔"

"بس کریں۔" تائی جی نے ٹوک دیا، پھر اس سے کہنے لگیں۔ "تم اپنے کمرے میں جاؤ بیٹا۔!"

"جانے سے پہلے سن لو کہ آئندہ میں تمہارا نامناسب رویہ اور مسعود کی طرف سے غفلت برداشت نہیں کروں گا اور اپنا حلیہ اسی وقت ٹھیک کرو۔"

وہ اسی طرح سر جھکائے ہوئے ان کے کمرے سے نکل آئی۔ برآمدے میں مسعود قدرے تیز قدموں سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"احسن بھائی آ رہے ہیں۔"

اور ہمیشہ کی طرح اس خبر پر نہ اس کا دل دھڑکا نہ آنکھیں چمکیں اور نہ ہی بے اختیار ہو کر اس نے "کب" کہا بہت خاموشی سے سنا اور کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کافی دیر بعد جب مسعود آیا وہ دیوار کی طرف منہ کیے شاید سو رہی تھی اور غالباً نہا کر سوئی تھی اس کے گیلے بال تکیے پر دور تک پھیلے تھے۔

گزشتہ کئی روز سے جس طرح وہ اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ اس لیے مسعود نے اپنی بے اختیاریوں پر بند باندھ دیے تھے۔ اس وقت بھی اس نے اپنے آپ کو اس کی طرف بڑھنے سے باز رکھا لیکن زیادہ دیر رک نہیں سکا۔ تکیے پر پھیلے اس کے بالوں کو سمیٹا تو ہتھیلیاں بھیگ گئیں۔ اسے تشویش ہوئی۔ سرد موسم میں یونہی سو گئی ہے۔ کہیں بیمار نہ پڑ جائے، جلدی سے تولیہ اٹھا لایا اور بہت آہستگی سے اس کے بالوں کو رگڑ رگڑ کر خشک کرنے لگا۔ اپنی طرف سے تو وہ بہت احتیاط کر رہا تھا پھر بھی کہیں بے خیالی میں اس کے بالوں کو جھٹکا لگا اور اس کی آنکھ کھل گئی فوراً گردن موڑ کے دیکھنے لگی تو وہ ٹپٹا کر بولا۔

''آئی ایم سوری۔ تم یونہی گیلے بالوں کے ساتھ سو گئی تھیں دیکھو سارا تکیہ بھیگ گیا ہے۔ میں نے سوچا۔'' وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اٹھ بیٹھی، پھر اس کے ہاتھوں سے اپنے بال نکال کر بیڈ سے اتر آئی۔

''میں نے تمہیں نیند سے اٹھا دیا۔'' وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے نادم ہو کر بولا۔ تو وہ کچھ کہے بغیر برش اٹھا کر کرسی پر جا بیٹھی اور اپنے بال سلجھانے میں مصروف ہو گئی۔

''چائے پیو گی؟'' وہ شاید اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں میرا اس وقت چائے بنانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔''

''میں بنا لاتا ہوں۔''

''پھر بھی نہیں۔'' وہ سختی سے کہہ کر کھڑی ہو گئی اور کچھ جھنجلائے ہوئے انداز میں برش پھینک کر کمرے سے نکل آئی۔

تائی جی کچن کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ یونہی بلا ارادہ ان کے پیچھے چل پڑی۔ اور جب تائی جی نے پلٹ کر دیکھا تو فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے اپنی وہاں موجودگی کا کیا جواز پیش کرے۔ کیتلی پر نظر پڑی تو جلدی سے اس میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھنے لگی۔

''اتنی سردی میں نہائی ہو؟'' تائی جی اس کے کھلے بال دیکھ کر کہنے لگیں۔ ''اور پھر کوئی سویٹر بھی نہیں پہنا۔ جاؤ تم اپنے کمرے میں چائے میں بنا دیتی ہوں۔''

''نہیں۔ میں بنا لوں گی۔'' وہ آہستہ آواز میں مگر روٹھے لہجے میں بولی۔

''بیٹا! اپنے تایا جی کی باتوں کا برا مت ماننا۔''

تائی جی اس کی خفگی محسوس کر کے کہنے لگیں۔ ''کبھی کبھی یونہی غصے میں آ جاتے ہیں۔ ورنہ تم جانتی ہو، وہ تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔''

پھر اس کی پیشانی پر لکیریں ابھرتی دیکھ کر موضوع بدلتے ہوئے بولیں۔

''مسعود نے تمہیں بتایا، صبح احسن آ رہا ہے۔''

وہ خاموش رہی اور قدرے رخ موڑ کر ٹی پاٹ میں چائے دم کرنے لگی۔

''میں نے سوچا۔ ناشتے کے لیے کچھ انتظام اسی وقت کر لوں اتنے دنوں کے بعد آ رہا ہے۔'' تائی جی پتا نہیں اسے بتا رہی تھیں یا اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں۔ اس نے مروتاً کہہ دیا۔

''آپ مجھے بتا دیں۔ میں کر دیتی ہوں۔''

''نہیں بیٹا! تم جا کر آرام کرو۔ میں کر لوں گی سب۔''

اس نے دوبارہ اصرار نہیں کیا اور دو مگوں میں چائے ڈال کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ مسعود نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کیونکہ ابھی تو وہ چائے بنانے اور پینے سے انکار کر گئی تھی، اور اس التفات کو پتا نہیں کیا سمجھا کہ مگ لے کر اس کا ہاتھ بھی تھام لیا۔

''تمہارا پل پل بدلتا روپ میری سمجھ سے باہر ہے۔ کبھی زندگی کی نوید دیتی ہو اور کبھی جو چند سانس باقی رہیں، وہ بھی چھین لینے کے درپے ہو جاتی ہو۔''

''میرا ہاتھ چھوڑو۔'' وہ الجھ کر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

''نہیں، میرے پاس بیٹھو۔ مجھے بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔''

''کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔''

وہ جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر کرسی کھڑکی کے پاس گھسیٹ کر اس کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اسے احساس تھا یا نہیں کہ اس کے پیچھے بیٹھا مسعود جلال احمد اس کی اس حرکت سے کس قدر آزردہ ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی توانا مرد ہوتا تو یوں اپنی طرف پیٹھ کرنے پر اسے کرسی سمیت اٹھا کر باہر پھینک دیتا اور مسعود جلال احمد ایسی توانائیاں کہاں سے لاتا۔ چپ چاپ اس کے بالوں کو دیکھتا رہا جو کرسی کی پشت سے نیچے جھول رہے تھے۔ گھنے سیاہ بال۔ اماوس کی راتوں جیسے یا شاید اس کے مقدر جیسے۔

''صبح احسن بھائی آ رہے ہیں؟'' وہ ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھولتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ہاں!'' کھڑکی کھلنے سے جو سرد ہوا اندر چلی آئی تھی، اس سے بچنے کی خاطر مسعود نے لحاف سینے تک کھینچ لیا لیکن اسے کھڑکی بند کرنے کے لیے نہیں کہا۔

''اکیلے آ رہے ہیں یا۔؟'' وہ کھڑکی سے باہر کھلے آسمان پر جگمگاتے ستاروں میں جانے کیا تلاش کرتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب۔؟''

''ہو سکتا ہے، انہوں نے وہاں شادی کر لی ہو اور بیوی کے ساتھ آ رہے ہوں۔''

''اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ اطلاع ضرور دیتے۔''

''ہوسکتا ہے انہوں نے ضرورت نہ سمجھی ہو یا پھر سرپرائز دینے کی خاطر۔''

''ایسا ہوتا ضرور ہے لیکن احسن بھائی کو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ۔''

''نہیں۔ میں انہیں اچھی طرح نہیں جانتی۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑی۔ ''جب احسن بھائی یہاں سے گئے تھے اس وقت میں کچے ذہن کی کم عمر لڑکی تھی۔ ظاہری خوبصورتی سے متاثر ہونے والی۔ میں سمجھتی تھی جو ظاہر ہے، وہی باطن بھی ہوگا۔''

''اور اب؟''

''اب میرا خیال ہے میں ظاہر و باطن میں تمیز کرسکتی ہوں۔'' وہ دعوے سے بولی۔

''اچھی بات ہے۔ پھر تو صبح تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ احسن بھائی جتنے خوبصورت نظر آتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ خوبصورتیاں ان کے اندر ہیں۔''

''اچھا!'' وہ پتا نہیں کیوں ہنسی اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے پتا نہیں کیا سوچنے لگی۔ سرد ہوا کے جھونکے مسلسل اس کے چہرے کو چھو رہے تھے۔ جس سے اس کا چہرا نخ ہوگیا تھا۔ ناک سے الگ پانی بہنے لگا تھا پھر بھی اس نے کھڑکی بند نہیں کی، بس کچھ دیر کے لیے ہاتھوں سے چہرا ڈھانپ لیا۔ پھر جب سیدھی ہوئی تو کہنے لگی۔

''ایک بات بتائیں، تایا جی نے آپ کی شادی کرتے وقت احسن بھائی سے مشورہ کیا تھا۔''

''ہاں۔!''

پھر کیا کہا تھا انہوں نے؟'' وہ پتا نہیں کیا جاننا چاہتی تھی۔

''وہ بہت حیران ہوئے تھے۔'' مسعود جیسے اس وقت کو سوچتے ہوئے بولا۔ ''انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ بار بار کہتے سمیعہ سے پوچھ لیں۔ شاید میری طرح انہیں بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ تم مجھے پسند کرتی ہو۔''

''پھر۔؟'' اس کے ہونٹوں سے سسکی کی صورت پھر نکلا۔

''پھر انہوں نے مجھ سے تصدیق کرائی۔''

''آپ سے کیوں۔ انہیں مجھ سے تصدیق کرانی چاہیے تھی۔'' وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔

''مجھ سے پوچھتے۔''

''تم کیا کہتیں؟''

''میں۔'' وہ ایک دم سنبھل گئی۔ ''ظاہر ہے جو آپ نے کہا۔''

''لیکن اب ایسا لگتا ہے سمیعہ! جیسے تم مجھ سے شادی کر کے پچھتا رہی ہو۔'' وہ خاموش رہی تو کہنے لگا۔

''واقعی محبت اندھی ہوتی ہے جب ہی مجھ سے محبت کرتے وقت میری ذات سے چمٹے روگ تمہیں نظر نہیں آئے۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گھٹاؤں جیسے بالوں کو سمیٹ کر چوٹی کی شکل دیتے ہوئے یوں ظاہر کرنے لگی جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

''پلیز کھڑکی بند کردو۔ اب مجھ سے سردی برداشت نہیں ہورہی۔''

بات کے اختتام پر وہ کھانسنے لگا تو وہ فوراً کھڑکی بند کرنے کی بجائے کھڑی ہو کر سے دیکھنے لگی۔ کھانستے ہوئے اس کا کمزور بدن جھٹکے کھانے لگا تھا بالکل اسی طرح جس طرح ں کی امی جھٹکے کھایا کرتی تھیں۔

''پہلے ثریا کو قبر تک پہنچایا اور اب۔'' خالہ جی کی باتیں ذہن سے نکلتی نہیں تھیں، ناً فوقتاً ذہن پر دستک دینے لگتی تھیں۔

''اب میری باری ہے۔'' اس وقت اس نے سوچا تھا۔

''نہیں۔ اب میری باری نہیں ہے۔'' وہ مسعود کو دیکھتے ہوئے ہلکے سے بڑبڑائی۔ ر پلٹ کر کھڑکی بند کرنے لگی۔

رات اپنے اختتامی مراحل میں تھی جب مسعود کی طبیعت قدرے سنبھلی اور وہ سو کا۔ نیند تو اسے بھی آرہی تھی اور وہ سونا بھی چاہتی تھی لیکن اذان کی آواز سن کر اس نے سونے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ اور نماز پڑھ کر کچن میں چلی آئی۔ چائے بنا کر وہیں کھڑی پی رہی تھی کہ ائی جی آگئیں۔ اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

''بہت جلدی اٹھ گئیں۔''

''میں سوئی کب تھی۔ اس نے سوچا اور بس سر ہلا دیا۔

''تمہارے تایا جی تو اٹھتے ہی ایئرپورٹ چلے گئے۔''

تائی جی تسلے میں آٹا نکالتے ہوئے بتانے لگیں۔

''اکیلے۔'' وہ یونہی پوچھنے لگی۔

''ظاہر ہے اور کون ہے ساتھ جانے والا۔ مسعود تو غالباً۔''

''لائیے۔ آٹا میں گوندھ دوں۔'' وہ ان کی بات پر توجہ دیے بغیر بولی اور آٹے کا تسلا لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ کہنے لگیں۔

''آٹا میں گوندھ لوں گی۔ تم احسن کے آنے پر گرم گرم پراٹھے بنا دینا۔''

وہ ہلکے سے کندھے جھٹک کر وہاں سے نکل آئی۔ کمرے میں آ کر دیکھا مسعود بے خبر سو رہا تھا۔ کچھ دیر تک کھڑی اس کے خراٹوں کی آواز سنتی رہی۔ پھر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی تو بغل سے اخبار نکال کر دیکھنے لگی۔ اسے بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ برآمدے میں سے تایا جی کی آواز آنے لگی۔ وہ وہیں سے تائی جی کو پکار رہے تھے۔ ان کی آواز کی کھنک اس بات کی غماز تھی کہ بڑھاپے کا سہارا جوان و توانا بیٹا ساتھ کھڑا ہے۔ شانے سے شانہ ملا کر۔

اصولاً تو اسے بھی اٹھ کر جانا چاہیے تھا لیکن وہ یونہی لاتعلق بنی رہی۔ باہر سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں پھر شاید انہوں نے مسعود کے بارے میں پوچھا تھا اور کچھ دیر بعد ہی دروازے پر دستک دے کر پہلے تایا جی اور ان کے پیچھے وہ اندر داخل ہوتے نظر آئے۔

''السلام علیکم!'' وہ سلام کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی اور یونہی بے خیالی میں ان کی طرف دیکھنے لگی جن کی پیشانی پر اسے دیکھتے ہی ہلکی ہلکی لکیریں نمایاں ہو گئی تھیں۔ سلام کا جواب سر کے اشارے سے دیا اور کھردرے لہجے میں بولے۔

''کیسی ہو؟''

''جی۔!''

''مسعود سو رہا ہے ابھی تک۔'' وہ بیڈ کی طرف بڑھے اور غالباً اسے اٹھانا چاہتے تھے کہ اس نے روک دیا۔

''مسعود کو مت اٹھائیں۔ یہ تمام رات جاگتے رہیں ہیں۔''

''کیوں۔؟''

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''ہاں، رات بھر کھانسنے کی آواز آتی رہی تھی۔''

تایا جی نے کہا تو وہ جھک کر بغور مسعود کو دیکھنے لگے گو کہ وہ اسے اٹھانے کا ارادہ ملتوی کر چکے تھے۔ پھر بھی بے اختیار دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔

مسعود کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں دیکھا تو فوراً اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تب انہوں نے سہارا دے کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''سوری یار! میں تمہیں اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔''

''ارے نہیں احسن بھائی! میں تو ابھی نیند میں بھی آپ ہی کو دیکھ رہا تھا۔''

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔ سمیعہ بتا رہی ہے تم رات بھر جاگتے رہے ہو۔'' وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگے۔

''سمیعہ خود بھی تو نہیں سوئی۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''بیچاری میری وجہ سے بہت پریشان ہو جاتی ہے۔''

''کوئی دوا لی تھی؟''

''ہاں سمیعہ نے دی تو تھی۔'' اس نے جھوٹ بول کر اس کا بھرم رکھا یا شاید اپنا۔ کیسے کہہ دیتا کہ وہ بہت خاموشی سے اس کے تڑپنے کا نظارہ کرتی رہی تھی۔

''بیٹا! تم نے آتے ہی ڈاکٹری شروع کر دی۔ چلو پہلے ناشتا وغیرہ کر لو۔''

تایا جی نے ہنستے ہوئے کہا تو اسے یاد آیا تائی جی نے اسے پراٹھے بنانے کے لیے کہا تھا۔ وہ فوراً کمرے سے نکل گئی۔ کچن میں آئی تو تائی جی خود ہی ناشتا بنانے میں مصروف تھیں وہ انہیں اندر بھیج کر خود ان کی جگہ کھڑی ہو گئی۔

پھر ناشتے کے بعد احسن بھائی نے باقاعدہ مسعود کا چیک اپ کیا۔ اس کے لیے دوائیں خود تجویز کیں۔ کچھ دوائیں ان کے پاس موجود تھیں جو وہ باہر سے لے کر آئے تھے اور جو نہیں تھیں، وہ اسی وقت جا کر لے آئے۔ پھر ان کے بارے میں اسے سمجھانے لگے کہ کون سی دوا کس وقت دینی ہے۔ اور اسے اب دواؤں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی کوشش کر رہی تھی کہ پوری توجہ سے ان کی ہدایات سنے لیکن پتا نہیں کیسے ان پر اس کی لاتعلقی ظاہر ہو گئی تو انہوں نے ٹوک دیا۔

''میں تمہیں اس میڈیسن کے بارے میں بتا رہا ہوں، تم وہاں کیا دیکھ رہی ہو؟''

''احسن بھائی!'' اس سے پہلے مسعود بول پڑا۔ ''آپ خوامخواہ اتنی محنت کر رہے ہیں۔ سمیعہ ایک مدت سے مجھے دوائیں پلا رہی ہے اور اب تو میرا خیال ہے یہ آنکھیں بند کر کے بتا سکتی ہے کہ کس وقت مجھے کون سی دوا دینی ہے۔'' انہوں نے خاموشی سے ہاتھ میں

پکڑی دوائیں ٹیبل پر رکھ دی تو وہ کہنے لگا۔

''سچ پوچھیں احسن بھائی، تو میں خود اب دواؤں سے اتنا الرجک ہو گیا ہوں کہ انہیں دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔''

''بس کچھ دن اور پھر تم ایک دم فٹ فاٹ ہو جائے گے۔''

''میں اب بھی فٹ فاٹ ہوں۔ بس کبھی جب سینے میں سانس رکنے لگتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی سے ناتا ٹوٹ رہا ہے۔''

اس نے بات کی ابتداء مسکراتے ہوئے کی تھی اور آخر میں مایوس نظر آنے لگا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس تم اپنا خیال رکھو۔''

''سمیعہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے جاتے جن نظروں سے اس کی طرف دیکھا، وہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔



احسن بھائی کو آئے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ شروع کے چار پانچ دن ہی انہوں نے ایک طرح سے آرام کیا تھا۔ اس کے بعد اپنا کلینک سیٹ کرنے میں لگ گئے۔ لیکن گھر اور خاص طور سے مسعود کی طرف وہ کسی پل بھی غافل نہیں ہوئے مسعود کے لیے ان کے احساسات وہ شروع سے جانتی تھی لیکن اب تو لگتا تھا جیسے وہ اس کے لیے بہت سنجیدہ ہو گئے ہوں۔ معمولی سی بات کو بھی بہت گہری نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ صبح گھر سے نکلتے ہوئے بے شمار ہدایات اور واپسی میں باز پرس۔

''تم نے دوا کس وقت لی۔ کھانے میں کیا کھایا۔ گھر سے کب نکلے، واپسی کب ہوئی وغیرہ وغیرہ۔'' ہر بات تفصیل سے پوچھتے اور پھر اس کی طرف یوں دیکھتے جیسے یقین کرنا چاہ رہے ہوں کہ آیا مسعود ٹھیک کہہ رہا ہے یا نہیں اور وہ ان باتوں سے چڑنے لگی تھی۔

''کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔'' اس روز وہ مسعود کے سامنے پھٹ پڑی۔ ''ہر وقت ہمارے سر پر مسلط رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کیا وہ کیا۔ آخر وہ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے۔ اور پوچھتے بھی اتنے مشکوک انداز سے ہیں جیسے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔''

''ایسی بات نہیں ہے سمیعہ!'' وہ اسے سمجھانا چاہتا تھا۔

''پھر کیا بات ہے؟ ان سے کہیں اگر اتنا ہی خیال ہے تو صبح جاتے ہوئے۔ آپ کو اپنے ساتھ لے جایا کریں یا پھر خود آپ کے ساتھ لگ کر بیٹھ رہیں۔ مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔ میں ہر وقت آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی نہیں رہ سکتی۔''

''میں نے کب کہا ہے کہ تم میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی رہو۔''

''وہ تو ایسا ہی چاہتے ہیں ناں۔ آپ کہہ دیں ان سے کہ میرے معاملات میں دخل نہ کریں۔ میں ہر کام اپنی مرضی سے کروں گی۔''

''اچھی بات ہے۔ میں کہہ دوں گا ان سے۔'' وہ مصالحت پر آمادہ تھا۔

''تم پلیز خفا مت ہو۔ یہاں میرے پاس آ بیٹھو۔''

''آپ کے پاس بیٹھ جاؤں گی تو وہاں روٹی کون پکائے گا۔'' وہ پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکلی تو دوسرے قدم پر احسن بھائی سے جا ٹکرائی غصے میں تو تھی ہی مزید جھنجلا گئی۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی جانے لگی کہ وہ سامنے آ گئے۔

''میرے کمرے میں آؤ۔'' دھیمی مگر سخت آواز میں کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تو وہ ان کی پشت پر نظریں جمائے ان کے لہجے پر غور کرنے لگی، جو ان کی بات رد کرنے کا حوصلہ چھین گیا تھا۔ جب ہی نا چاہتے ہوئے بھی ان کے پیچھے چل پڑی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' وہ اسے بیٹھنے کا کہہ کر جوتے اتارنے لگے۔ پھر میز پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے کہنے لگے۔

''کسی بھی شخص کو اپنے تہی دامن ہونے کا اتنا ملال نہیں ہوتا۔ لیکن جب اس کے دامن میں کچھ ڈال کر چھین لیا جائے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔'' وہ خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی۔

''مسعود سے شادی کا فیصلہ تمہارا اپنا تھا اور یہ فیصلہ یونہی نہیں ہوا ہوگا۔ یقیناً اس سے پہلے تم نے اس کی دامن میں محبتوں کے کچھ پھول ڈالے ہوں گے۔ پھر اب۔''

''احسن بھائی!'' وہ ان کی پوری بات سنے بغیر کھڑی ہو گئی اور دل چاہا۔ یہیں کھڑے کھڑے ایک پل میں اپنے ساتھ ہونے والی بے انصافی کی پوری داستان کہہ سنائے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بجز ایک نئی اذیت کے۔ اس لیے بس ہونٹ کاٹ کر رہ گئی اور وہ پتا نہیں کیا سمجھے۔ کہنے لگے۔

''اگر تم نے ہمدردی میں یا ترس کھا کر مسعود سے شادی کی، تب بھی تمہارا فرض بنتا

ہے کہ اس کا خیال رکھو۔''

''میں اپنا فرض پہچانتی ہوں۔'' ان کی پیشانی پر مسلسل شکنیں دیکھ کر اس نے قصداً اپنی پیشانی شکن آلود کر لی۔

''اگر پہچانتیں تو تمہارا رویہ اتنا غیر مناسب ہرگز نہ ہوتا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ پہلے تم نے اس سے شادی کر کے اسے مایوسیوں سے نکالا اور اب اپنے رویے سے اسے دوبارہ انہی اندھیروں میں دھکیل رہی ہو۔''

''کیسا رویہ، کیا کرتی ہوں میں؟'' وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گئی۔

''یقیناً مسعود نے میری شکایتیں کی ہوں گی اور اگر میں لوگوں کو اتنی ہی کھٹکنے لگی ہوں تو چلی جاؤں گی یہاں سے۔'' وہ ہاتھوں میں چہرا چھپا کے رونے لگی۔

''سمیعہ!'' وہ اٹھ کر اس کے پاس چلے آئے۔

''بخدا ایسی بات نہیں ہے۔ مسعود تمہاری شکایت کیوں کرے گا۔ اسکے پاس تو سوائے تمہاری تعریفوں کے اور کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

پھر اسے بٹھا کر سمجھاتے ہوئے نرمی سے کہنے لگے۔

''میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم اس سے لڑا مت کرو۔ تمہاری ذرا سی خفگی اسے بے حد آزردہ کر دیتی ہے۔ کیا تمہیں اچھا لگتا ہے کہ وہ ہر وقت افسردہ سا رہے۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔ ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگی۔

''خود بھی خوش رہو اسے بھی خوش رکھو تا کہ ہمارے ساتھ گھر کے در و دیوار کو بھی پتا چلے کہ اس گھر میں ایک جوان جوڑا رہتا ہے۔ تمہاری چوڑیوں کی کھنک ہو، اس کی ہنسی کی جھنکار ہو کوئی جلترنگ بجے، کچھ تو ہو۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بلکہ یوں لگتا ہے جیسے میرا جنازہ تیار رکھا ہو۔''

''اللہ نہ کرے۔'' وہ دہل کر فوراً بولی۔

''اگر یہی صورت حال رہی تو سچ مچ ایسا ہو سکتا ہے۔''

''بس کریں احسن بھائی۔ ایسی باتیں نہ کریں۔''

''میرے پاس اچھی باتیں بھی ہیں۔ اگر سننا چاہو تو۔''

''کیا۔؟'' وہ بھیگی پلکیں اٹھا کر دیکھنے لگی۔

''وہ یہ کہ جب میرا کلینک اسٹارٹ ہو گا تو میں ریسپشن پر مسعود کو بٹھاؤں گا کیونکہ اب وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اس پر چھوٹی موٹی ذمہ داریاں ڈالی جا سکیں۔''

یہ واقعی اچھی خبر تھی ان کا خیال تھا۔ وہ خوشی سے چیخ پڑے گی، لیکن اس کے چہرے سے کسی قسم کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ تب ان کی پیشانی جو ذرا دیر کو صاف ہوئی تھی پھر شکن آلود ہو گئی۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''اچھی خبر ہے۔'' وہ سرسری انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جانے لگی تو وہ پکار کر کہنے لگے۔

''سنو۔ تمہیں اس کی حوصلہ افزائی کرنی ہے۔''

''یہ آپ کا حکم ہے؟'' وہ پلٹ کر کاٹ دار لہجے میں پوچھنے لگی۔

''میں کہنا تو نہیں چاہتا لیکن تمہارے لہجے اور رویے کی بدولت مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہاں یہ میرا حکم ہے اور اب تم جا سکتی ہو۔''

''وہ انتہائی بدتمیزی سے فرش پر زور سے پاؤں مارتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل آئی۔



اس پر عجیب سی جھنجلاہٹ سوار ہو گئی تھی۔ رات دیر تک انتہائی بے چینی کے عالم میں کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتی رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔ کبھی دل چاہتا سوئے ہوئے مسعود کو جھنجوڑ کر اٹھا دے کبھی سوچتی ایک ایک چیز اٹھا کر دیوار پر مارنا شروع کر دے اور زور زور سے شور مچائے کہ سب اپنے کمروں سے نکل کر بھاگے چلے آئیں پھر وہ ایک ایک سے پوچھے کہ انہیں صرف مسعود کا خیال کیوں ہے کوئی اس سے بھی تو پوچھے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ تایا جی اور تائی جی تو خیر جانتے ہیں لیکن احسن بھائی۔

''احسن بھائی۔!'' وہ تلخ ہو کر سوچنے لگی۔ ''انہوں نے ساری باتیں خود ہی فرض کر لی ہیں کہ میں نے مسعود کے دامن میں اپنی محبتوں کے پھول ڈالے اور اس سے۔''

''سمیعہ!'' وہ پتا نہیں کیا کچھ سوچے جا رہی تھی کہ اس تمام عرصے میں پہلی بار دل نے ٹوکا۔'' یہ صحیح ہے کہ تم نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا لیکن اب جب کہ تمہاری زندگی کا مرکز ہی

یہی شخص ٹھہرا ہے تو پھر اس کے دامن میں محبتوں کے پھول ڈالنے میں تمہیں اعتراض کیوں ہے۔"

"میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔" اپنے ضمیر کی عدالت میں وہ سرخرو ہونا چاہتی تھی۔

"اس سے کہیں بڑی زیادتی تم اس شخص کے ساتھ کر رہی ہو جس کا جرم یہ ہے کہ وہ تمہارے التفات کو محبت پر محمول کر کے تم سے بڑھ کر تمہیں چاہنے لگا ہے۔ اگر تم اس سے محبت نہیں کر سکتیں تو اس کی محبت قبول کر لو۔ وہ مایوس اور ٹوٹا ہوا شخص پھر سے جی اٹھے گا۔"

وہ خوفزدہ نظروں سے مسعود کی طرف دیکھنے لگی۔ جس کا کمزور وجود بیڈ کے کونے میں سمٹا ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ سمٹتے سمٹتے بالکل ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو۔

"نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگی۔

"واقعی محبت میں بڑی طاقت ہے۔" مسعود کی آواز کی بازگشت پیچھا کرنے لگی۔

"مردوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ مجھے دیکھو جو ٹوٹا ہوا شکستہ سا اور اپنے آپ سے حد درجہ مایوس انسان تھا تمہاری محبت کا احساس ملتے ہی جی اٹھا ہوں۔"

"میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی میری زندگی میں بھی بہار آ سکتی ہے۔ تمہاری محبت نے تو اچانک ایسے پھول کھلائے ہیں کہ میں...... صرف چند برس نہیں بلکہ برسہا برس جینے کی تمنا کرنے لگا ہوں۔"

وہ بیڈ کے قریب رک کر بغور اسے دیکھنے لگی۔ شام کو وہ کس بری طرح اسے جھڑک کر کمرے سے نکل گئی تھی جس کا دکھ اب بھی اس کے چہرے پر پھیلا تھا۔

"کتنی بری ہوں میں۔" ایک پل میں ڈھیر ساری ندامتوں نے آن گھیرا۔ پتا نہیں کس کس کی زیادتی کا بدلہ اس سے لے رہی ہوں۔ جس کا سرے سے کوئی قصور ہی نہیں۔"

"مسعود۔!" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ اس نے گھٹنے فرش پر ٹیک دیے اور بے اختیار پیشانی اس کے پیر پر ٹکائی تو اگلے ہی پل آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔

"کون؟" اپنے پیر پر نمی محسوس کر کے وہ پہلے کسمسایا پھر چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اسے دیکھا وہ بھی روتے ہوئے تو ایک دم پریشان ہو گیا۔

"سمیعہ۔ کیا ہوا ہے؟" اس کا کندھا ہلا کر پوچھا تو وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔

"بہت بری ہوں میں۔ آپ کو اتنا تنگ کرتی ہوں۔"

"ارے نہیں۔" وہ شاید اس کا دل رکھنے کی خاطر بولا۔ اور اسے بازو سے کھینچ کر اوپر بٹھایا تو وہ بلا سوچے سمجھے کہنے لگی۔

"تایا جی کی زیادتی کا بدلہ میں آپ سے لیتی رہی ہوں۔ پلیز آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں آئندہ آپ کو بالکل تنگ نہیں کروں گی۔"

"ابو کی زیادتی۔ کیا کہا ہے انہوں نے؟" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا تو وہ ایک دم سٹپٹا گئی پھر سنبھل کر بولی۔

"وہ مجھے ڈانٹتے ہیں کہ میں آپ کا خیال نہیں رکھتی۔"

"کس نے کہا ان سے، ایک تم ہی تو میرا اتنا خیال رکھتی ہو۔"

"نہیں مسعود! میں واقعی آپ کی طرف سے بہت غافل ہو گئی تھی لیکن اب ایسا نہیں ہو گا۔ آپ پلیز، مجھے معاف کر دیں۔"

"بے وقوف۔ میں نے کبھی تم سے شکایت کی۔"

"نہیں لیکن اب اگر میں کوئی غلط بات کروں تو شکایت ضرور کیجئے گا۔"

"کس سے؟" وہ ہنس کر شرارت سے بولا۔

"مجھ سے۔"

"پھر تم کیا کرو گی۔؟"

"اوں ہوں۔ سزا دینے والی بات ٹھیک نہیں ہے۔ بس تم ہنس دیا کرنا کیونکہ تم ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہو۔"

"اچھا۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی بھیگی پلکیں اور بھیگے رخساروں کے درمیان اس کی ہنسی میں ایک جادو سا تھا کہ وہ بے خود اسے دیکھے گیا۔



بس چند دن اس گھر کے مکینوں کے ساتھ در و دیوار نے بھی اس کی چوڑیوں کی کھنک سنی تھی، ہنسی کی جھنکار، ہر طرف جلترنگ بجے تھے کہ مسعود ہار گیا۔ وہ شاید اتنی ڈھیر ساری خوشیاں اپنی ناتواں جان پر سہار نہیں سکا تھا یا پھر اسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں پہلے کی طرح اب بھی وہ کسی دن اچانک اپنی محبتوں کے پر سمیٹ نہ لے اور اس سے پہلے کہ وہ ایسی

کسی اذیت سے دوچار ہوتا۔ اپنی زندگی کے ماہ وسال سمیٹ لیے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو ابھی ابھی اس کا ہاتھ تھام کر کہہ رہا تھا۔

''تمہاری محبت کے احساس نے اب تک مجھے زندہ رکھا ہوا ہے۔ تمہاری محبت نے جہاں میرے اندر جینے کی امنگ پیدا کی حوصلہ دیا، وہاں بے حد کمزور بھی بنا دیا ہے مجھے۔ میں ڈرنے لگا ہوں کہیں کسی دن میرے ہاتھ سے تمہارا ہاتھ چھوٹ نہ جائے۔ اور اس سے پہلے کہ ایسا کوئی لمحہ زندگی میں آئے میں چپ چاپ سو جانا چاہتا ہوں۔ کتنی پرسکون ہو گی وہ نیند جس میں یہ احساس ساتھ دے رہا ہو کہ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہے اور تمہاری محبتوں کے پر۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اس کے بولنے کی منتظر تھی، کافی دیر گزر گئی تب اس نے یونہی سر اٹھا کر دیکھا تو اچانک دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ہونٹ نیم وا تھے اور کھلی آنکھیں کسی نادیدہ نقطے پر جمی رہ گئیں تھیں۔

''مسعود!'' دھڑکتے دل کے ساتھ اسے پکارنے کے ساتھ اس نے اپنا وہ ہاتھ جو اس کے ہاتھ میں تھا اسے آہستہ سے ہلایا تو اس کا بازو کٹی ہوئی شاخ کی مانند اس کی گود میں آ گرا۔

''مسعود!'' اس کی پوری آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر وہ ایک لمحہ کی تاخیر کے لیے بغیر بیڈ سے چھلانگ لگا کر احسن بھائی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اور زور زور سے ان کا دروازہ پیٹنے لگی۔

''کیا بات ہے؟'' دروازہ کھلنے کے ساتھ ان کی ناگوار آواز سنائی دی۔

''جلدی چلیں احسن بھائی۔ مسعود کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔'' اس نے جتنی تیزی سے کہا اس سے کہیں زیادہ تیزی سے احسن بھائی مسعود کی طرف بھاگے۔ وہ ان کے پیچھے بھاگی کہ دروازے کے ہینڈل سے ٹکرا کر کلائی کی ساری چوڑیاں فرش پر بکھر گئیں۔ وہ بس ایک لمحہ کو رکی پھر ٹوٹے کانچ پیروں تلے روندتی آگے بڑھی تو احسن بھائی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھنے کے بعد اس کا چہرہ ڈھانپ رہے تھے۔

''نہیں احسن بھائی۔'' اس نے اپنے آپ کو پوری قوت سے چیختے سنا، اس کے بعد کوئی آواز اس تک نہیں آئی۔

جب اسے ہوش آیا۔ اس کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ یہی دنیا جسے اس نے محض اپنے گزشتہ رویے کی تلافی کے لیے نہیں بلکہ پوری ایمانداری سے بسایا تھا۔ اور اس میں مگن اور مطمئن بھی ہو گئی تھی، اس یقین کے ساتھ کہ یہی اس کی کل کائنات ہے۔ اور کل تک تو اس میں بڑی رونقیں تھیں۔ در و دیوار گواہ تھے، چوڑیوں کی کھنک، اور ہنسی کی جھنکار جو ہر طرف جلترنگ بجاتی تھی۔

''میری چوڑیاں!'' اس کی نظریں اپنی کلائی پر جا ٹھہریں جہاں جا بجا خون جما تھا۔ سرہانے بیٹھی آنٹی نے جب اسے آنکھیں کھولتے دیکھا تو حوصلہ دینے کی خاطر اس پر جھک کر بولیں۔

''بیٹا! خدا کو یہی منظور تھا۔''

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد گھر کے سب لوگ وہیں آ گئے تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ابو جی نے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر اسے اپنے ساتھ لے جانے کی بات کرنے لگے، وہ بھی اب یہاں نہیں رہنا چاہتی تھی لیکن تقدیر نے اسے جو بیوگی کی چادر اوڑھائی تھی اس کا تقاضا نبھاتے ہوئے اسے عدت کے دن یہیں پورے کرنے تھے اور یہی بات تائی جی نے کہی تو اس نے اپنی سسکیوں کو روکنے کی خاطر ہتھیلی ہونٹوں پر جما کر پیشانی گھٹنوں پر ٹیک دی۔



کاروبار زندگی کبھی نہیں رکتا۔ خواہ کتنا بڑا سانحہ کیوں نہ رونما ہو جائے بس کچھ وقت کی رفتار سست لگنے لگتی ہے زندگی رینگنے لگتی ہے پھر وقت خود اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس گھر میں بھی کبھی بہت زیادہ گہما گہمی تو نہیں رہی تھی بس ایک لگا بندھا معمول جو برسوں سے چلا آ رہا تھا۔ اب بھی وہی تھا لیکن اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ پہلے ہر ایک کو اپنے زندہ ہونے کا یقین تھا اور اب شبہ۔

تایا جی صبح اتنی خاموشی سے جاتے تھے کہ پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ اسی طرح احسن بھائی کو نو بجے تک گھر میں موجودگی اور پھر جانے کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ تائی جی اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئیں اور وہ بھی ضرورت کے تحت ہی کمرے سے نکلتی تھی۔ زندگی بے رنگ ہو کر بہت بوجھل ہو گئی تھی۔ وہ گھنٹوں بیٹھی سوچا کرتی۔ گزرے ماہ وسال کا ہر دن اس کی یادداشت میں

محفوظ تھا۔ اس گھر میں اسے کیا ملا۔ غرض میں لپٹی ہوئی محبت۔

اس وقت بھی وہ سوچوں میں گم تھی کہ خالہ جی آ گئیں۔ حسب سابق اس کے دھان پان وجود کو اپنی آغوش میں سمیٹا پھر باقاعدہ بین کرنے لگیں۔

''مجھے ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ تم پر کیا قیامت ٹوٹ گئی۔ ہائے میری بچی یہ کوئی تیری عمر تھی بیوگی کی چادر اوڑھنے کی۔'' پھر اپنے خدشات سچ ثابت ہونے پر جتانے لگیں۔

''مجھے تو پہلے ہی خبر نہیں تھی کہ یہ تیرے ساتھ یہی سلوک کریں گے۔ یونہی انہوں نے تمہیں اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ پہلے اپنی چاکری کروائی اور پھر بیمار لڑکے کو تمہارے سر تھوپ دیا۔ ارے اسے تو مرنا ہی تھا، وہ پہلے کب زندہ نظر آتا تھا۔ کم از کم تمہارا خیال کرتے۔''

''بس کریں خالہ جی۔'' وہ تڑپ کر ان کی آغوش سے نکل آئی۔

''کیا بس کروں۔ میرا تو کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ خدا غارت کرے انہیں۔ پہلے میری ثریا کو قبر میں پہنچایا اب تمہارا یہ حال کر دیا ہے۔'' موٹے موٹے، آنسو دوپٹے میں جذب کرتے ہوئے بولیں۔ ''تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ چلو اٹھو میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گی۔''

''ابھی نہیں خالہ جی!'' وہ ان کے ہاتھ تھام کر بے بسی سے بولی۔

''ابھی کیوں نہیں؟''

''ابھی عدت ختم ہونے میں کچھ دن باقی ہیں۔''

''اچھا۔!'' خالہ جی کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگیں۔

''اول تو تمہیں عدت میں بیٹھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خیر اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے لیکن تم سن لو۔ عدت ختم ہوتے ہی میں تمہیں لینے آ جاؤں گی۔''

''اور ابو جی!''

''ابو جی کی کیا بات کرتی ہو۔'' خالہ جی اس کی بات سنے بغیر بول پڑیں۔

''اسے نہ تمہاری ضرورت ہے اور نہ پروا اگر ہوتی تو وہ تمہیں دوسرے کے در پر کیوں چھوڑ دیتا۔ خود سوچو وہ اپنے بال بچوں میں مگن ہے۔ تمہارے لیے کیا کرے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ دو وقت کی روٹی اور رہنے کو ایک کمرا دے دے گا۔ اور بیٹا زندہ رہنے کے لیے یہی دو چیزیں کافی نہیں ہوتیں اور بھی بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ جس میں اہم ضرورت

ان رشتوں کی ہے۔ جن کے ساتھ بندہ مل بیٹھے۔ حال احوال کہہ سکے۔ دکھ سکھ بانٹے اور یہاں کون ہے تمہارا دکھ سکھ بانٹنے والا۔ جس طرح یہاں اکیلی بیٹھی ہو، اسی طرح باپ کے گھر میں بھی اکیلے کمرے میں پڑی ہو گی۔'' اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا تو کہنے لگیں۔

''وہاں سب تمہارے اپنے ہیں اور پھر ثریا کے حصے کا جو روپیہ جائیداد تمہیں ملے گا۔ اس سے تمہاری اپنی ایک حیثیت ہو جائے گی۔ پھر تم جس طرح چاہو زندگی گزارنا۔'' وہ اسی طرح خاموش رہی۔

''اچھا میں چلوں۔'' خالہ جی اس کی خاموشی کو رضامندی پر محمول کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر جاتے جاتے کہنے لگیں۔

''تمہاری عدت ختم ہوتے ہی میں تمہیں لینے آؤں گی۔ اور تمہارا باپ آئے تو اسے بتا دینا کہ تم نے اپنی مرضی سے میرے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔'' اس نے بس ہلکے سے سر ہلایا اور انہیں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

یہ طے تھا کہ اب اسے تایا جی کے گھر نہیں رہنا۔ اب وہ انتہائی مجبوری کے عالم میں رہ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا۔ عدت ختم ہوتے ہی وہ ابو جی کے پاس چلی جائے گی، لیکن آج ایک بار پھر خالہ جی تمام حقیقتوں کے ساتھ آن موجود ہوئیں۔ پہلے بھی اگر اس نے خالہ جی کی باتوں کو جھٹلایا نہیں تھا تو نظر انداز ضرور کر گئی تھی اور اب کسی طرح بھی وہ ان کی باتوں کو نظر انداز نہیں کر پا رہی تھی۔ اور پھر بقیہ جتنے دن وہ یہاں رہی وہ مسلسل خالہ جی کی باتوں کو ہی سوچتی رہی یہاں تک کہ وہی اسے سب سے بڑی ہمدرد اور غمگسار نظر آئیں اور آخر میں وہ انہی کے ساتھ جانے کا فیصلہ بھی کر گئی۔

اس روز وہ اپنے جانے کی تیاری کر رہی تھی تیاری کیا بس کچھ ضروری چیزیں ہی بیگ میں رکھ رہی تھی کہ دروازے پر دستک دے کر احسن بھائی اندر آ گئے۔ مسعود کے بعد سے وہ پہلی بار اس کمرے میں آئے تھے اس لیے دروازے کے پاس ہی رک گئے۔ کونے میں رکھی چوکور میز پر اس کی تمام دوائیں اسی طرح موجود تھیں۔ اس سے آگے ہینگر پر لٹکتی اس کی قمیض۔ پھر رائٹنگ ٹیبل پر پیپر ویٹ کے نیچے دبا پیڈ اور اس پر رکھا قلم، جیسے وہ لکھتے لکھتے ابھی ابھی اٹھ کر کہیں گیا ہو۔ وہ بے اختیار اس ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔ شفاف کاغذ پر تحریر اسی کی تھی۔

''واقعی محبت میں بڑی طاقت ہے مردوں کو زندہ کر دیتی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی زندہ درگور بھی کر دیتی ہے۔''

انہوں نے ایک طویل سانس لیا اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھا وہ ان سے یکسر لاتعلق بنی اپنے بیگ میں مصروف تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد انہوں نے ہلکے سے کھانس کر اسے متوجہ کیا پھر کہنے لگے۔

''ابھی چچا جی کا فون آیا تھا۔ وہ شام میں تمہیں لینے آ رہے ہیں۔''

''لیکن میں ابو جی کے ساتھ نہیں جا رہی۔'' وہ مسلسل اپنے کام میں مصروف رہ کر بہت عام سے لہجے میں بولی۔

''پھر۔؟'' وہ حیران ہوئے۔

''میں خالہ جی کے ساتھ جاؤں گی اپنے نانا جی کے پاس۔'' اپنی بات کا ردعمل جاننے کے لیے وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اور وہ یوں اس کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے اس کی دماغی حالت پہ شبہ ہو۔

''کیا واقعی؟'' کتنی دیر بعد بولے بھی تو لہجے میں انتہائی غیر یقینی تھی۔

''جی۔!''

''یہ فیصلہ؟''

''میرا اپنا ہے۔'' وہ فوراً بول پڑی۔

''ظاہر ہے، ایسا فیصلہ تمہارا اپنا ہی ہو سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''کم از کم ہم میں سے تو کوئی بھی تمہیں ایسا مشورہ نہیں دے سکتا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جس گھر کے دروازے تمہاری امی پر بند ہوئے تمہارے لیے کیسے کھل گئے اور تم نے ان میں داخل ہونے کا کیونکر سوچ لیا۔''

وہ حیران نہیں ہوئی بلکہ کوئی نئی کہانی سننے کی منتظر ان کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے کسی بات کا یقین نہیں کرے گی۔ اور وہ اس کی آنکھوں کا ہر رنگ پہچانتے تھے، اب سے نہیں شروع سے، پھر بھی کہنے لگے۔

''میرا خیال تھا، تمہیں چچا جی نے اپنے حالات بتا رکھے ہوں گے۔ اگر نہیں تو تمہیں خود پوچھنا چاہیے تھا۔''

''کیا۔؟''

''اپنی امی کے بارے میں اور یہ کہ ان کے ساتھ۔''

''ان کے ساتھ اچھا ہوا یا برا، اس کا ذمہ دار کون ہے؟'' وہ ان کی بات کاٹ کر پوچھنے لگی۔

''یہ تم چچا جی سے پوچھو تو زیادہ بہتر ہے۔''

''کیوں آپ کو بتانے میں کیا اعتراض ہے۔''

''اعتراض تو کوئی نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ تم میری باتوں کا یقین نہیں کرو گی۔''

''مجھے اگر یقین ملنا ہوگا تو آپ کی باتوں سے بھی مل جائے گا اگر نہیں تو ابو جی کی باتوں سے بھی نہیں ملے گا۔ آپ سنائیں جو بھی کہانی سنانا چاہتے ہیں۔''

وہ بیڈ کے کنارے خاصے تکلف سے بیٹھی اور کہنیاں بیگ پر ٹکا دیں۔ وہ کچھ دیر پتا نہیں کیا سوچتے رہے پھر جہاں کھڑے تھے وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھے تو کہنے لگے۔

''کہانی نہیں، حقیقت یہ ہے کہ تمہارے نانا جی اور ماموں وغیرہ ثریا چچی کی شادی چچا جی سے کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ کیونکہ اس وقت چچا بہت معمولی تنخواہ پر معمولی ملازم تھے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی زمیندار لوگ کم ہی اپنی بیٹیوں کو باہر بیاہتے ہیں جبکہ ثریا چچی خود نہ صرف چچا جی کو پسند کرتی تھیں بلکہ ان سے شادی پر بضد تھیں۔ بالآخر ان کی ضد سے مجبور ہو کر تمہارے نانا جی نے ان کی شادی چچا جی سے کر تو دی لیکن ساتھ ہی اپنے گھر کے دروازے بھی ہمیشہ کے لیے ان پر بند کر دیئے۔''

کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگے۔

''چچا جی کی غربت ثریا چچی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ سب جاننے کے باوجود انہوں نے شادی کی تھی اور کمال عورت تھیں کہ کبھی بھول کر بھی اس عیش و آرام کو یاد نہیں کیا، جس کی وہ عادی تھیں۔ اس کے برعکس اس غریبی سے اس طرح سمجھوتا کیا کہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائیں اور نہ کوئی فرمائش کی یہاں تک کہ جب بیمار رہنے لگیں تب بھی چچا جی کو خبر نہیں ہونے دی۔ اصل میں انہیں اپنے والدین کے رویے سے خاصا دکھ پہنچا تھا جو ان کی صورت

دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ اور یہی دکھ انہیں اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ چچا جی کو اس وقت خبر ہوئی جب وہ خون تھوکنے لگی تھیں۔ ان کے لیے یقیناً حیرت کی بات تھی کہ بظاہر خوش وخرم رہنے والی اپنے اندر کیسا روگ پالے ہوئے تھی۔ بہر حال اس وقت چچا جی کی حیثیت اتنی نہیں تھی کہ ان کا باقاعدہ علاج کرا سکتے پھر بھی انہوں نے اپنی سی ہر کوشش کی یہاں تک کہ وہ دوبارہ تمہارے نانا جی کے در پر بھی گئے کہ شاید انہیں اپنی بیٹی کی حالت پر رحم آ جائے لیکن کسی کو رحم نہیں آیا، ہر بار دروازے پر سے ہی یہ کہہ کر دھتکار دیا گیا کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یوں ثریا چچی اپنوں کی بے اعتنائی کا غم لیے چلی گئی۔''

وہ خاموش ہو گئے اور وہ اسی طرح ان پر نظریں جمائے بیٹھی رہی جب کہ ذہن کہیں اور بھٹکنے لگا تھا۔

''بیٹا! اپنے ابو جی کا خیال رکھنا'' امی نے کہا تھا۔ اور پھر ابو جی کی بات۔

''جو پیسہ تمہاری امی کے کام نہیں آیا، وہ تمہیں نہیں لینا چاہیے۔''

''کس جنم کا بدلہ لے رہے ہو ثریا کو قبر تک پہنچا کر دم لیا۔'' خالہ جی کی آواز سب کو دھکیلتی ہوئی چلی آئی۔

''میرے خدا!'' اس نے سینے میں دبی سانس کو باہر نکلنے سے پہلے ہی دبا لیا...... اس کی اندر شدید جنگ شروع ہو گئی۔ وہ کس کا یقین کرے کسے جھٹلائے۔ یہاں تو سب ہی چہروں پر نقاب ڈالے پھرتے ہیں۔ محبت بھی کرتے ہیں تو غرض کے پردوں میں لپیٹ کر۔ وہ منتظر تھے کہ وہ کچھ کہے گی لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔ بیگ کھول کر دیکھنے لگی کہ کہیں کچھ رہ تو نہیں گیا تب وہ پوچھنے لگے۔

''تمہاری خالہ جی لینے آئیں گی یا؟''

''پتا نہیں۔'' پھر جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی۔

''آ بھی گئیں تو میں نہیں جاؤں گی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں یہیں رہنا چاہیے۔''

انہوں نے جو سمجھا اسی حساب سے کہا۔

''یہاں!'' اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ ''یہاں کون ہے میرا؟''

''اگر سمجھو تو سب۔''

''میں نے یہی سمجھا تھا لیکن۔''

بہت ساری باتیں ایک ساتھ یاد آ کر اسے بے چین کر گئیں اور وہ بیگ بند کر کے کھڑی ہو گئی۔ بلا مقصد الماری کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے لگی وہاں سے پلٹی تو تکیے اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ اس کی بے چینی دیکھ رہے تھے جس طرح وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر رکھ رہی تھی اس سے وہ سمجھ گئے کہ محض اپنا اضطراب چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ جب وہ اسی طرح کمرے سے نکلنے لگی تب پکار کر بولے۔

''سمیعہ! واپس آؤ۔'' وہ پلٹی ضرور لیکن کونے میں رکھی اس چوکور میز کے پاس کھڑی ہو گئی جس پر مسعود کی دوائیں رکھی تھیں۔ پھر یونہی ایک دوائی اٹھا کر اس پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

''آپ کو یاد ہے۔ ایک بار آپ نے کہا تھا کہ کسی بھی شخص کو اپنے تہی دامن ہونے کا اتنا ملال نہیں ہوتا، لیکن جب اس کے دامن میں کچھ ڈال کر چھین لیا جائے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ میں بھی احسن بھائی جب یہاں آئی تھی تو بالکل تہی دامن تھی اور مجھے اپنی تہی دامنی کا نہ احساس تھا نہ ملال، پھر آپ سب کی محبتوں نے ایسا کوئی احساس جاگنے بھی نہیں دیا لیکن جب ایک روز اچانک میں نے محبتوں میں چھپی غرض کو جانا تو میں ایک دم ٹوٹ گئی۔ اس روز پتا چلا کہ میں تو اول روز کی طرح اب بھی تہی دامن ہوں۔''

ان کے اندر کئی سوال مچلے لیکن انہوں نے قصداً اپنے آپ کو خاموش رکھا وہ پہلے سے سننا چاہتے تھے۔ اور وہ کہنے لگی۔

''مجھے مسعود سے محبت تھی لیکن ایسی نہیں کہ میں اسے زندگی کے ساتھ کے طور پر سوچنے لگوں۔ ایسے خواب تو آپ نے میری آنکھوں میں سجائے تھے اور میں ان کی تعبیر چاہتی تھی۔ لیکن تایا جی کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں ہم اپنی زندگی میں مگن ہو کر مسعود کو بھول نہ جائیں، اس لیے انہوں نے میری شادی مسعود سے کر دی۔''

''تم انکار کر سکتی تھیں۔'' وہ بے اختیار کہہ گئے۔

''یقیناً میں انکار کر سکتی تھی لیکن میں آخر وقت تک لاعلم رہی۔ عین نکاح کے وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں مسعود سے منسوب کی جا رہی ہوں۔ تب میں کیا کرتی۔ میرے پاس دو راستے تھے۔ اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیتی یا ابو جی اور تایا جی کا سر جھکا دیتی۔''

”شاید اسی لیے تم مسعود سے اکھڑی اکھڑی سی تھیں؟“ وہ پرسوچ انداز میں بولے۔

”نہیں۔ جب محبت کا گلا گھونٹا تھا تو مسعود کو بھی دل سے قبول کر لیا تھا کیونکہ اس سارے قصے میں ایک وہی شخص بے قصور تھا۔ البتہ جب میں نے تایا جی کو یہ کہتے سنا کہ انہوں نے اس فکر سے آزاد ہو جانے کی خاطر کہ ان کے بعد مسعود بے یارومددگار نہیں رہے گا۔ باقاعدہ پلان کے تحت میری اس سے شادی کی، تب کسی اور پر بس نہیں چلا تو میں مسعود سے خفا رہنے لگی تھی۔ مجھے اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ تایا جی نے ہم پر اعتبار نہیں کیا۔ انہوں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ بعد میں ہم مسعود کا خیال نہ رکھتے۔ پھر آپ۔ آپ بھی مجھ سے ہی متنفر ہوئے۔ آپ کا لہجہ، رویہ اور مجھے دیکھتے ہی آپ کی پیشانی پر نمودار ہوتی شکنیں اس بات کی گواہ ہیں کہ آپ مجھے بے وفائی کا مرتکب سمجھتے ہیں۔ میں نے کوئی بے وفائی نہیں کی کوئی فریب نہیں دیا۔ فریب تو میرے ساتھ ہوا اور قصوروار بھی میں ٹھہرائی گئی۔ صرف اس لیے ناں کہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی میں آپ کے در پر پڑی رہی۔ یوں بے مایہ ہو کر میری کوئی حیثیت نہیں رہی۔ جب ہی تو کبھی کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہر ایک کو یہ فکر کہ کہیں مسعود میری غفلت کا شکار تو نہیں ہو رہا۔ اور ذرا سی بات پر الزام میرے سر۔ معاف کیجئے گا احسن بھائی میں بظاہر کتنی ہی غافل کیوں نہ ہو جاتی درحقیقت اس سے کبھی غافل نہیں ہو سکتی تھی۔“

اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو جمع ہو گئے جن کی آمیزش آواز میں بھی شامل ہو گئی۔

”ایک وہی تو تھا جس نے اپنے چہرے پر کوئی نقاب نہیں چڑھائی تھی۔ انتہائی سادہ و معصوم جس کے اندر رب کائنات نے ڈھیر ساری خوبصورتیاں سمو دی تھیں۔ اس کی محبتیں غرض کے پردوں میں لپٹی ہوئی نہیں تھیں۔ بے لوث، بے غرض اور پوری ایمانداری سے ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ اور جب میں نے اپنی محبتوں کے پر پھیلائے تو اس نے چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ ڈرنے لگا تھا کہیں میں اپنی محبتوں کے پر سمیٹ نہ لوں۔ کہیں میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔ اور اسے کاش! کہ اوپر والا اسے بلانے میں جلدی نہ کرتا تو میں اسے یہ یقین دلا کر کہیں زندگی کے کسی مقام پر بھی میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹے گا۔ اسے برسہا برس جینے پر مجبور کر دیتی۔“

آنکھوں میں ٹھہرے آنسو پلکوں کے بند توڑ کر چھلکے تو آواز بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے ان کی طرف سے رخ موڑ کر میز کی سطح پر گرتے موتیوں کو اس کے نام کرنے لگی جو اچانک زندگی کے ماہ و سال سمیٹ گیا تھا۔

”سمیعہ!“ کافی دیر بعد وہ اٹھ کر آئے اور پیچھے سے اس کی کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”میں تم سے کبھی بھی متنفر نہیں ہوا۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ انتظار کی جس دہلیز پر میں تمہیں بٹھا کر گیا تھا۔ واپسی میں تم مجھے اس دہلیز پر بیٹھی ملو۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”مسعود میرا بھائی مجھے اپنے آپ سے بڑھ کر پیارا تھا اس کے باوجود تمہارا مجھ پر اسے ترجیح دینا مجھے اچھا نہیں لگا۔ شاید اسی لیے میرے رویے میں فرق آیا۔ آخر کسی نہ کسی طرح دل کا غبار تو نکالنا ہی تھا۔“ وہ بہت آہستگی سے اپنے کندھوں سے ان کے ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹی پھر پلٹ کر بہت خاموش نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔۔

”دیکھ لو۔ میں نے اپنے چہرے پر کوئی نقاب نہیں چڑھا رکھی۔ ہاں اگر تم مجھ میں مسعود جیسی خوبصورتیاں تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو تو شاید تمہیں مایوسی ہو۔ میں اس جیسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ یقین ضرور دلاؤں گا کہ اس کی طرح میری محبت بھی بے لوث و بے غرض ہے۔“ اس نے آہستہ سے پلکوں کی جھالریں گرا دیں تو کہنے لگے۔

”میں اپنے حرماں نصیب بھائی کا رقیب نہیں ہوں اس لیے تمہارے دل سے اس کا نقش مٹانے کی کوشش کبھی نہیں کروں گا اس کے برعکس مجھے خوشی ہو گی کہ میری طرح تمہارے دل میں بھی وہ ہمیشہ زندہ رہے۔ اچھے لوگ نظروں سے اوجھل ہو جائیں تب بھی زندہ رہتے ہیں شاید ہم جیسے لوگوں کی راہنمائی کی خاطر۔“ پھر اس کی پلکوں پر ٹھہرے شفاف قطرے انگلیوں پر سمیٹتے ہوئے بولے۔

”میں بہت بڑے بڑے دعوے نہیں کروں گا۔ البتہ مسعود کی وہ خواہش جو وہ تمہارے لیے چھوٹی چھوٹی خوشیاں اکٹھی کرنے کی اپنے دل میں رکھتا تھا اسے پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ اور جس طرح قطرہ قطرہ سمندر بنتا ہے اسی طرح چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا ڈھیر دیکھنا ایک دن آسمان کو چھونے لگے گا۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

''اور سنو، ابو نے تمہارے لیے جس انداز سے سوچا۔ اس کے لیے میں بے حد شرمندہ ہوں تم پلیز، اپنا ظرف بڑا کر لو۔'' وہ چپ چاپ میز کی سطح پر انگلی کی مدد سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی، انہوں نے کچھ دیر اس کی حرکت کرتی، انگلی پر نظریں جمائے رکھیں پھر اسے دیکھا اس کی سرخی مائل آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں اتری ہوئی تھیں۔ تب وہ اس کے سامنے سے ہٹ گئے۔ چاہتے تھے کہ وہ خود سوچ کر فیصلہ کرے۔ اور کمرے سے نکلنے لگے۔ کہ وہ بے اختیار پکار اٹھی۔

''احسن!'' ان کے بڑھتے قدم رک گئے اور پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''تائی جی کہاں ہیں؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے تو تائی جی کے بارے میں پوچھنے لگی۔

''اپنے کمرے میں ہیں۔''

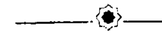
''کیا کر رہی ہیں۔؟''

''کچھ نہیں۔ البتہ تمہارے جانے کے خیال سے کافی پریشان ہیں۔''

انہوں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سر جھکا کر آہستہ آواز میں بولی۔

''ان سے کہہ دیجئے میں کہیں نہیں جا رہی یہیں رہوں گی، ان کے پاس۔''

''سمیعہ!'' اسے دیکھ کر ایک طویل مدت بعد ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی تو ماحول پر اداسیوں کے بادل آہستہ آہستہ چھٹنے لگے۔



ایسی بھی قربتیں رہیں

سردیوں کی خوشگوار سی شام تھی اور اس کے بعد کتنی شامیں اپنے اندر ڈھیروں خوبصورتیاں سمیٹ کر لانے والی تھیں۔ کلیں چٹک کر بہار کی آمد کا اعلان کر چکی پھر ہر طرف پھول کھلیں گے ہریالی ہی ہریالی۔ میں نے برآمدے میں کھڑے ہو کر لان کے آخری سرے تک نظر دوڑائی، اس کے بعد میری نظریں بھٹکتی ہوئی غروب ہوتے سورج پر جا پڑیں۔ بس اتنا سا فاصلہ یعنی میری نظروں نے ایک پل میں یہ سفر طے کر لیا۔

''اور اگر میں چل کر جاؤں تو؟'' میری ذہنی رو بہک گئی۔

مہینوں، سالوں، صدیوں یوں لگا جیسے میں چلتی چلی جا رہی ہوں، کہیں دشت کہیں صحرا، دریا، سمندر پھر ہوا میں اڑتی ہوئی اور کہیں بھی اکیلی تو نہیں ہوں، وہ بھی میرے ساتھ ہے۔

''وہ۔'' میں چونک گئی اور قدرے گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ بابا بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔

''ممی! مانی میری بال نہیں دے رہا۔''

''بس اب ختم کرو کھیل، اندر چلو۔'' پھر میں نے وہیں سے مانی کو پکار کر اندر آنے کے لیے کہا اور برآمدے کی لائٹس آن کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ شام میں خنکی بڑھ جاتی ہے کمرہ بھی خاصا سرد ہو رہا تھا۔ میں نے کھڑکیاں اچھی طرح بند کر کے پردے گرا دیے اور ابھی آ کر کمبل میں بیٹھی ہی تھی کہ احمد آ گئے۔

''کیا بات ہے۔ سردی لگ رہی ہے؟'' انہوں نے مجھے سکڑتے دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں، بس ابھی برآمدے میں کھڑی تھی، ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔''

"کیا ضرورت تھی برآمدے میں کھڑے ہونے کی۔ سوئیٹر وغیرہ بھی نہیں پہنتیں۔"

وہ بگڑنے لگے اور جب وہ یونہی بے بات بگڑتے ہیں تو میں ایک دم خاموش ہو جاتی ہوں۔ کچھ دیر تک مجھے سخت سست کہتے رہے۔ آخر میں پوچھنے لگے۔

"بچے کہاں ہیں؟" یہ بھی ان کا مخصوص انداز ہے جہاں میری خاموشی محسوس کرتے ہیں تو محض میرا منہ کھلوانے کی غرض سے کوئی سوال کر دیتے ہیں۔ اور میں اب ان باتوں سے خاصی بے نیاز سی ہوگئی ہوں۔ کوئی جواب نہیں دیا تو پوچھنے لگے۔

"چائے پینی ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلایا تو آ کر میرے پاس بیٹھ گئے اور صفائی پیش کرنے لگے۔

میں خواہ مخواہ تو نہیں بگڑتا، آپ کے فائدے کی بات کرتا ہوں۔ اگر برآمدے ہی میں کھڑے ہونا تھا تو سوئیٹر پہن لیتیں یا شال اوڑھ لیتیں۔"

"بس کریں احمد! بہت ہوچکیں میرے فائدے کی باتیں۔" میں نے اکتا کر کہا تو ہنس پڑے۔ اور اپنا مخصوص جملہ کہنا نہیں بھولے۔

"آپ کو اندازہ نہیں ہے، میں آپ سے کتنا پیار کرتا ہوں۔"

اور مجھے اچھی طرح اندازہ ہے جب ہی تو بظاہر لاپروائی سے کندھے اچکاتی لیکن اندر ہی اندر کتنی مغرور ہو جاتی ہوں۔ اور یہ پیار، یہ محبتیں یونہی تو میری جھولی میں نہیں آن گریں شاید احمد بھول گئے ہوں لیکن مجھے تو اپنی تپسیا کا ہر پل یاد ہے۔ میں ایک دم کمبل پھینک کر کھڑی ہوئی تو حیران ہوئے۔

"کہاں جارہی ہیں؟"

"کہاں جاؤں گی، چلیں۔ آپ بچوں کو بلائیں۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔"

میں نے کہا اور محض ان کی خفگی کے خیال سے شال اوڑھ کر کمرے سے نکل کر کچن میں آ گئی۔ اور جب تک کھانا گرم کر کے ٹیبل پر رکھا۔ احمد بچوں کو لے آئے۔ پھر کھانے کے دوران حسب عادت تینوں باپ بیٹے بولتے رہے اور میں خاموش۔ میں بہت کم گو نہیں ہوں لیکن فضول گوئی سے پرہیز کرتی ہوں۔ اور اس وقت ان کی باتیں ایسی ہی تھیں بے سروپا، جب ہی میں خاموش رہی اور کھانے کے بعد بچوں کو پڑھنے کی تاکید کرتے ہوئے چائے بنانے کی غرض سے کچن میں جانے لگی کہ احمد نے روک دیا۔

عائشہ! آپ رہنے دیں، چائے میں بناؤں گا۔"

میں سمجھ گئی کہ مزید کوئی ڈش بنانے کے موڈ میں ہیں اور انہیں منع کرنا یا روکنا فضول ہی تھا اس لیے میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد مانی اور بابا بھی میرے پاس آ بیٹھے۔ تو میں نے ان سے پوچھا۔

"تمہارے پاپا کیا بنا رہے ہیں؟"

"چھوہاروں کا حلوہ، پاپا کہہ رہے ہیں۔ سردی میں ضرور کھانا چاہیے۔" مانی نے بتایا پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔

"ممی! آپ کو بنانا نہیں آتا؟"

"نہیں۔" میں سمجھ گئی۔ ابھی احمد نے ان سے یہی کہا ہوگا کہ مجھے بنانا نہیں آتا۔

"آپ پاپا سے سیکھ لیں ناں۔"

بابا کی معصومیت پر میں بے ساختہ مسکرائی اور اسے قریب کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا۔

کچھ دیر بعد احمد اپنی بنائی ہوئی سویٹ ڈش اور چائے لے کر آ گئے۔ تو میں نے جلدی سے اُن کے ہاتھ سے چائے کا مگ لے لیا۔ کیونکہ میرا کھانے کے بعد مزید کچھ کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ اس لیے میں نے فوراً چائے کا مگ ہونٹوں سے لگا لیا کہ کہیں احمد یہ سویٹ ڈش کھانے پر اصرار نہ کرنے لگیں۔ حالانکہ وہ میری عادت سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن اپنی عادت سے بھی مجبور کہ مسلسل اصرار کرتے رہے۔ پھر بچوں کے ساتھ کھاتے ہوئے چھوہاروں کے فوائد گنوانا شروع ہوگئے۔ اس کے باوجود میں اطمینان سے چائے پیتی رہی۔ اس کے بعد وہ بچوں کو ان کے کمرے میں سلانے لے گئے۔ تو میں مگ رکھنے کے بہانے کچن میں آ گئی۔

مجھے پتا تھا۔ اتنی سی دیر میں احمد نے کچن کا حشر نشر کر دیا ہوگا۔ چولہے کے پاس چائے اور چینی کے ڈبے کھلے پڑے تھے۔ پھر چھوہاروں کی گٹھلیاں، چھری، پلیٹیں، میں نے سب چیزیں اپنی جگہ پر رکھیں، چولہا اور سلیب صاف کیا پھر لائٹ آف کر کے نکلی تو کچھ دیر برآمدے میں رک گئی۔ سردیوں کی راتیں کس قدر گہری اور خاموش ہوتی ہیں۔ دور آسمان پر ستاروں کی جھلملاہٹ اور دھیرے دھیرے سرکتا چاند۔ پتا نہیں ایسے میں میں کہاں کھو جاتی

ہوں۔ میرے اندر جستجو انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ اور انجانی سے بے کلی دل میں سما کر مجھے خود سے بیگانہ کر دیتی ہے۔

"عائشہ۔!" احمد بچوں کے کمرے سے نکلے تو مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گئے اور میں تو ابھی 'اسے' اپنے قریب محسوس کرنے لگی تھی کہ احمد کی آواز پر چونک گئی۔

"یہاں کیوں کھڑی ہیں؟" انہوں نے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تو میں ذرا سا مسکرائی۔

"آپ کی کارستانی دیکھنے گئی تھی۔ ذرا سا کام اور اتنا کچھ پھیلا دیتے ہیں۔"

"میں ابھی سب صاف کر دوں گا۔"

"جی نہیں۔ میں کر آئی ہوں۔"

میں کہتی ہوئی ان کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔ ابھی صرف دس بجے تھے اور نیند بھی نہیں آ رہی تھی لیکن احمد کے خیال سے میں نے لائٹ آف کر دی۔

صبح بچے اسکول چلے گئے۔ احمد آفس تو میں ناشتے کے برتن دھو کر لان میں آ گئی۔ ابھی صرف ایک کونے میں دھوپ اتری تھی۔ میں لان چیئر اسی کونے میں کھینچ کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں لوگوں کی اکثریت تنہائی اور فراغت سے گھبراتی کیوں ہے جبکہ مجھے یہ لمحات اچھے لگتے ہیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو میں بہت خوش نصیب عورت ہوں کہ جو چاہتی ہوں۔ میری جھولی میں آ گرتا ہے پھر بھی پتا نہیں کیوں میں اداس رہتی ہوں۔ بظاہر مجھے کوئی دکھ نہیں پھر بھی میرے اندر دکھ روتے ہیں۔ مجھے مصائب کا سامنا نہیں پھر بھی جانے کیسے کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں نمی اُتر آتی ہے۔ میرے اطراف محبتوں کا جہان آباد ہے لیکن میری جستجو کا سفر تمام نہیں ہوتا۔ میں کیا کروں۔ سب ہی کچھ تو ہے۔ میرے پاس۔ یہ گھر، بے حد چاہنے والا شوہر، خوبصورت و معصوم بچے پھر بھی ان سب کے درمیان بیٹھ کر میں اچانک خالی خالی سی ہو جاتی ہوں۔ اور نہیں خالی ہوتی تو ان تنہائی کے لمحات میں پتا نہیں کیوں یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں۔ کون ہے میرے ساتھ؟۔

"وہ۔ وہ۔ وہ۔"

۔ آنکھ موندے اس گلابی دھوپ میں
دیر تک بیٹھے، اسے سوچا کریں

میری ہر سوچ، ہر خیال یہاں تک میری ہستی پر قابض وہ مجھے اپنے قریب محسوس ہوتا ہے۔ میں دھیرے دھیرے مسکرانے لگتی ہوں پھر فوراً آنکھیں کھول کر دیکھتی ہوں تو کچھ دیر تک اس کی موجودگی کا احساس غالب رہتا ہے۔ میں بے قراری سے ادھر ادھر دیکھتی ہوں پھر یہاں وہاں ہر شے لگتا ہے میری بے قراری پر مسکراتی ہو۔ کلیاں، پھول، ہوا، یہ چمکتی دھوپ اور وہ جو سامنے دیوار پر مینا بیٹھی ہے، وہ بھی مسکراتی ہوئی لگ رہی ہے۔ کس طرح میں ان سب کے لیے تماشا بن کے رہ گئی ہوں۔ میرے اندر پھر آزردگی پھیلنے لگی۔ کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر میں نے اپنی نظروں کو دور تک پھیلے آسمان پر بھٹکتا چھوڑ دیا۔ پھر کام کرنے والی ماسی کی آمد پر ہی میری محویت ٹوٹی تھی۔ اسے اندر بھیج کر کچھ دیر بعد میں اس کے پیچھے جانے کے لیے اٹھی ہی تھی کہ احمد بچوں کو لے کر آ گئے۔

میں حیران ہو کر دیکھنے لگی کیونکہ ابھی تو صرف دس بجے تھے اور اس وقت احمد کا آنا وہ بھی بچوں کو اسکول سے لے کر، میری سمجھ میں نہیں آیا بلکہ میں کچھ ٹھٹھک سی گئی۔

"ہیلو لیڈی کلر۔" احمد کی شوخ مسکراہٹ سے مجھے "سب خیریت" کا اطمینان ہوا۔ تب ان کے خطاب پر میں نے منہ پھلا لیا۔

"پاپا! امی کو ناراض نہیں کریں ناں ورنہ یہ پروگرام کینسل کر دیں گی۔" مانی نے کہا تو میں نے چونک کر پوچھا۔

"کیسا پروگرام؟۔"

"ممی! ہم ابھی بی بی اور ابا میاں کے پاس جا رہے ہیں۔" مانی اور بابا دونوں نے خوشی سے تالی بجا کر بتایا تو میں نے فوراً تصدیق کے لیے احمد کی طرف دیکھا اور انہوں نے حسب عادت انگلی سے میری ناک چھو لی۔

"اوں ہوں۔" میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مجھے ان کی یہ حرکت بالکل اچھی نہیں لگتی۔ اور اکثر ان سے لڑ بیٹھتی ہوں لیکن اس وقت بس ذرا سا ناگواری کا اظہار کیا پھر پوچھا۔

"کیا واقعی بچے ٹھیک کہہ رہے ہیں؟۔"

"یس مادام! اور اب آپ جلدی سے تیاری کر لیں۔ ہم اسی وقت نکلیں گے۔" پھر بچوں سے کہنے لگے۔ "چلو بیٹا! یونیفارم تبدیل کرو اور ایک دم فٹ فاٹ ہو جاؤ۔"

"او کے پاپا۔!" دونوں اپنے کمرے کی طرف بھاگے اور میں ان کے ساتھ اندر

آتی ہوئی پوچھنے لگی۔

''احمد! سب خیریت تو ہے ناں۔ ہمیں تو عید پہ جانا تھا، یہ آپ نے ایک دم سے کیسے پروگرام بنالیا؟۔''

''ایک دم سے نہیں عائشہ! میرا بہت پہلے سے پروگرام تھا۔ بس آپ کو اچانک سرپرائز دینا چاہتا تھا۔''

''کیسا سرپرائز۔!'' میں بالکل نہیں سمجھی کیونکہ بی بی اور ابا میاں کے پاس جانا سرپرائز تو نہیں تھا، وہاں تو ہم اکثر جاتے ہی رہتے ہیں۔

''سنیں گی تو خوش ہوجائیں گی۔''

''واقعی، پھر تو جلدی بتائیں۔'' میں نے ان کا بازو تھام کر بے صبری کا مظاہرہ کیا تو وہ مجھے لے کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

''بچوں کو بی بی کے پاس چھوڑ کر ہم عمرہ کے لیے جائیں گے۔''

''سچ۔!'' میری چیخ نکل گئی۔ خوشی کا بے اختیار اظہار تھا کہ میں نے احمد کے بازو کو زور سے دبایا۔

''ہاں، گزشتہ دنوں آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے جانا چاہتی ہیں۔'' انہوں نے یاد دلایا پھر فوراً تیار ہونے کے لیے کہا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ الماری میں سے بیگ نکال کر رکھا تو وہ کہنے لگے۔

''مری میں آج کل برفباری ہورہی ہے بچوں کے گرم کپڑوں کا خیال رکھیے گا۔''

میں سر ہلاتی ہوئی بیگ اٹھا کر بچوں کے کمرے میں آگئی پھر کوئی گھنٹے بھر بعد ہم گھر سے نکلے تو موسم اچانک ابر آلود ہوگیا تھا۔ اور مجھے تو جب موسم پورے جوبن پر ہو، سفر کرنا بے حد اچھا لگتا ہے۔ تمام راستہ جو کچھ میری آنکھیں دیکھتی ہیں اور جو کچھ میرا دل محسوس کرتا ہے۔ کاش میں کبھی کہہ سکوں اور کس سے کہوں کہ یہ رنگینیاں اور رعنائیاں مجھے اپنی طرف بلاتی ہیں۔ دور تک جاتی شفاف سڑک پر یوں لگتا ہے، وہ میرے آگے ہے اور میں اس کے تعاقب میں جارہی ہوں۔ اور جہاں یہ خیال آتا ہے، میرے اندر جستجو انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ کتنی بار بے اختیار ہوکر احمد سے کہتی ہوں، گاڑی تیز چلائیں اور وہ بے نیازی سے کہتے ہیں، جلدی کیا ہے۔ تب میرے اندر آزردگی سمٹ آتی ہے۔ ابھی بھی ان کے جواب پر میں

خاموش ہوگئی ہوں وہی بے سبب اداسی۔

تب ہی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ شاید بادلوں کو میری آنکھوں کی خشک سالی پر رحم آگیا تھا۔ فراخدلی سے پانی مستعار دینے چلے آئے۔ لیکن میں نے پلکیں موند لیں۔ میں مستعار کیوں لوں میرے اندر اتنی برسات ہے۔ قدرے توقف سے میں نے آنکھیں کھولیں تو سامنے جل تھل کا سماں تھا اور احمد ایک کے بعد ایک کیسٹ اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے مطلوبہ کیسٹ لگا کر آن کر دی اور میں دھیمے سروں میں کھوگئی۔

یہ دولت بھی لے لو، یہ شہرت بھی لے لو
بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی
مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون
وہ کاغذ کی کشتی ، وہ بارش کا پانی

احمد خود بھی ساتھ ساتھ گنگنانے لگے، مجھے بہت اچھا لگا، یہ حقیقت ہے، میں احمد سے بے پناہ محبت کرتی ہوں، لیکن پتا نہیں کیوں میں ان کی دوری اور قربت دونوں سے خائف رہتی ہوں۔ حالانکہ ان کا ہر انداز دلنشین ہے، لہجے میں نرمی، محبت میں گرمی، نظروں میں وارفتگی اور انداز میں شائستگی۔ میرا دل ان کی محبت میں سرشار ہے لیکن میری روح۔ پتا نہیں میری روح سیراب کیوں نہیں ہوتی۔ ان کی قربت میں بھی تشنہ رہتی ہے۔ شاید یہ بن مانگے کی محبتیں ہیں جو میری جھولی میں آن گری ہیں اور میں سوالی بننا چاہتی ہوں۔ اپنا کاسہ لے کر اس کے در پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں اور وہ۔''

''وہ۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور میں بری طرح چونک گئی۔ احمد کو دیکھا انہوں نے جس انداز سے ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلایا۔ سمجھ گئی کچھ خرابی ہوگئی ہے۔

''اب کیا ہوگا؟'' میں خوفزدہ نہیں تھی بس یونہی پوچھ لیا۔ اور گردن پیچھے موڑ کر بچوں کو دیکھنے لگی۔ بابا سو گیا تھا اور مانی بھی اونگھ رہا تھا۔ مجھے متوجہ پا کر پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں بیٹا۔ تم بھی سو جاؤ۔''

میں نے اس سے کہا اور احمد نیچے اترے تو میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی، گرم ماحول سے نکلتے ہی بدن میں جھرجھری آگئی۔ مری قریب ہی تھا۔ برفانی ہوا نے

ایک پل میں ہاتھوں اور چہرے کو یخ کر دیا۔ اور مجھے موسموں کی شدتیں اپنے وجود پر سہنا اچھا لگتا ہے۔ احمد نے کہا بھی کہ میں اندر بیٹھی رہوں لیکن میں ان سنی کر گئی۔ اور جیسے وہ بونٹ اٹھا کر انجن وغیرہ چیک کرنے لگے۔ میں اطمینان سے گاڑی کے ساتھ کمر ٹیک کر کھڑی ہو گئی بارش تھم چکی تھی لیکن سارا ماحول ابھی بھی بھیگا ہوا تھا۔ میری نظروں کے عین سامنے ہریالی ہی ہریالی تھی۔ ایک طرف کٹی ہوئی فصل کا ڈھیر اور اس کے قریب ایک جھونپڑی۔ میں بار ہا ان راستوں سے گزری ہوں اور ہر بار مجھے یہ منظر اول روز کی طرح نئے اور دلکش لگتے ہیں۔ مجھے دور ہی سے جھونپڑی میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو میں نے احمد کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"احمد! میں وہاں چلی جاؤں۔؟"

"کہاں۔؟" انہوں نے سر اٹھا کر پہلے مجھے پھر میری نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور اوں ہوں کہہ کر دوبارہ سر جھکا لیا۔

"احمد پلیز، دیکھیں وہاں ایک لڑکی نظر آ رہی ہے۔"

"نہیں، بس یہ ابھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔" میری اتنی منت پر بھی انہوں نے منع کیا تو میں منہ پھلا کر بولی۔

"کبھی ٹھیک نہیں ہو گی۔" وہ ہنس پڑے اور ان کی ہنسی سے شہ پا کر میں اسی طرف چل پڑی۔

انجان سی راہوں میں شاید اس لیے پھرتا ہوں
آواز ہمیں دے گا شاید کوئی منزل سے

چند قدم چلی تھی کہ مجھے اپنے دل کے کاسے میں چھنن کی آواز سنائی دی۔ اور میں بے خود سی ہو گئی۔ بس ایک ہی خیال کہ اس جھونپڑی کے اندر، وہ، ہے۔ اور میری بے قراری کا یہ عالم کہ پلک جھپکتے میں اس تک پہنچ جاؤں۔ شاید میری جستجو کا سفر تمام ہونے کو ہے۔ میں نے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور جب جھونپڑی کے دروازے تک پہنچی تو اس بلا کی سردی میں بھی میری ہتھیلیاں پسینے میں تر ہو رہی تھیں، پیشانی بھی نم، میں نے ایک ہی نظر میں اندر کا جائزہ لے ڈالا۔ ایک کونے میں ایک ضعیف العمر شخص سکڑا سمٹا بیٹھا تھا اس کے بدن پر معمولی سے کپڑے تھے۔ قریب ہی تین چار بچے ایک خستہ حال رضائی میں سمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور وہ لڑکی جو مجھے دور سے نظر آئی تھی، اب ایک طرف کھڑی مجھے حیران نظروں سے

دیکھ رہی تھی۔ میں نے دوبارہ اور سہ بارہ چاروں طرف دیکھا بس یہی لوگ تھے اور جس کے احساس کی خوشبو مجھے بے خود کر کے لے آئی تھی، وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ جبکہ میرے دل کے کاسے میں اب بھی چھنن چھنن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

"اندر آ جاؤ بی بی! باہر سردی ہے۔"

بوڑھے کی آواز پر میں چونک گئی۔ اور اپنی پسینے سے تر ہتھیلیاں صاف کرنے کے لیے رومال کی تلاش میں کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اچانک مجھے اپنے آپ سے شرم محسوس ہونے لگی۔ گرم کپڑوں میں کس قدر محفوظ کھڑی تھی میں اور یہ سب۔ میں نے اس نو عمر لڑکی کو دیکھا، جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی شال کے اندر وہ کس بری طرح ٹھٹھر رہی تھی۔ پھر میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

"بابا! آپ کا گھر کہاں ہے؟۔"

"یہی اپنا گھر ہے۔"

"یہ۔" میں پریشان ہو گئی۔ "یہاں تو بہت سردی ہے۔ اور یہ بچے کیا انہیں ٹھنڈ نہیں لگتی، کیسے رہتے ہیں یہاں اور ان کی ماں کہاں ہے۔"

"پچھلے سال اسی ٹھنڈ میں مر گئی تھی بس اللہ کی مرضی، ہم بندے کیا کر سکتے ہیں۔ نہ اس کی دی ہوئی بارش روک سکتے ہیں نہ سردی نہ دھوپ۔ اور بلاوا آتا ہے تو چل پڑتے ہیں۔"

بوڑھے نے افسردگی سے کہا پھر گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ تو میری نظریں اس پر سے ہٹ کر بچوں پر جا پڑیں۔ کتنے معصوم، کتنے پیارے اور کتنی حسرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرے اندر دکھ رونے لگا، دل چاہا ان سب کو اپنی آغوش میں سمیٹ لوں۔ تب ہی ہارن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ احمد اشارے سے بلا رہے تھے۔ میں تقریباً بھاگتی ہوئی ان کے پاس آئی تو انہوں نے خفگی سے ٹوکا۔

"میں نے آپ کو منع کیا تھا۔"

"سوری احمد! میں رہ نہیں سکی۔ اور پلیز ایک منٹ میں ابھی آتی ہوں۔"

میں نے معذرت کرتے ہوئے عاجزی سے کہا اور ڈگی کھول کر اس میں سے کمبل اور وہ بیگ جس میں میں نے اپنے احمد اور بچوں کے گرم کپڑے رکھے تھے نکالنے لگی۔ پھر اس سے پہلے کہ احمد کچھ سمجھتے اور مجھے روکتے میں یہ دونوں چیزیں لے کر اسی طرح تیز قدموں سے

دوبارہ جھونپڑی تک آئی۔ اور بچوں پر کمبل ڈال کر بیگ بوڑھے کے سامنے رکھ دیا۔

"اس میں گرم چادر بھی ہے بابا! آپ اوڑھ لیں۔"

میں نے جلدی سے کہا اور انہیں کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر واپس پلٹ آئی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کے اندر بیٹھی تو احمد خاموشی سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں قصداً ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ تب کہنے لگے۔

"کبھی کبھی مجھے آپ پر بہت غصہ آتا ہے عائشہ! اور میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کے ساتھ کیا سلوک کروں۔ چلیے آپ ہی بتائیں ابھی اس حرکت پر آپ کو کیا سزا دوں۔"

"کیا واقعی میں سزا کی مستحق ہوں؟۔" میں نے ذرا سی گردن موڑ کر انہیں دیکھا تو پتا نہیں کیا ہوا، وہ ایک دم نرم پڑ گئے۔ ذرا سا نفی میں سر ہلایا پھر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

پانچ بجے کے قریب ہم ابا میاں کے گھر پہنچے تو بی بی اور ابا میاں، ہمیں اچانک دیکھ کر نہال ہو گئے۔ غالباً ان کے خیال میں بھی اب ہمیں عید پہ ہی آنا تھا۔

"سارے رمضان میں تم ہی لوگوں کا خیال رہتا ہے۔ اچھا ہوا، آ گئے۔"

بی بی نے کہا تو احمد انہیں بتانے لگے۔

"بس بی بی! یہی دو چار دن رہیں گے، اس کے بعد میں اور عائشہ عمرہ کرنے جا رہے ہیں۔"

"ماشاء اللہ، اللہ مبارک کرے۔" ابا میاں نے خوشی کے اظہار کے ساتھ دعا دی پھر پوچھنے لگے۔ "بچوں کو بھی لے جاؤ گے؟"

"نہیں ابا میاں! بچے آپ کے پاس رہیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ ہمارے پاس بھی رونق رہے گی۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔"

تب ہی میری دیورانی کنول چائے لے کر آ گئی۔ اور غالباً ابا میاں کی آخری بات سنی تھی جب ہی پوچھنے لگی۔

"کون کہاں جا رہا ہے؟"

"میں اور احمد عمرہ کرنے جا رہے ہیں۔" میں نے بتایا اور چائے کا کپ اٹھاتے ہی مانی اور بابا کا خیال آیا۔ یقیناً دونوں مرغیوں کے پیچھے لگے ہوں گے۔ میں نے اپنے دیور عابد سے ان کی بابت پوچھا تو اس نے تصدیق کر دی۔

"وہ مرغیوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ بلا لاؤں۔"

"ہاں، انہیں چائے پلا دوں۔ اتنی سردی ہو رہی ہے۔ اور سنو ذرا ڈانٹ دینا کہ یہ وقت آنگن میں کھیلنے کا نہیں ہے۔"

"ڈانٹ نہیں سکتا۔" وہ کہتا ہوا گیا لیکن جب واپس آیا تو انہیں ڈانٹتا ہوا آ رہا تھا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ جبکہ ابا میاں منع کرنے لگے۔

"بری بات عابد! بچوں کو ڈانٹتے نہیں ہیں۔"

"ابا میاں! ذرا انہیں چھو کر دیکھیں۔ برف ہو رہے ہیں۔"

پھر مجھ سے کہنے لگا۔" بھابھی یہاں صرف سوئیٹروں سے کام نہیں چلے گا۔ انہیں اوپر جیکٹ بھی پہنائیں۔"

"جیکٹ۔" احمد ہنسنے لگے۔

"کیا ہوا۔ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟۔"

عابد حیران ہوا۔

"نہیں بھئی، تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن جیکٹ ہے کہاں؟۔"

"کیا مطلب۔ کیا گھر بھول آئے؟۔" ابا میاں پوچھنے لگے۔

"نہیں ابا میاں بھولے تو کچھ بھی نہیں تھے۔"

احمد موڈ میں تھے۔ میرے گھورنے کے باوجود مزے لے کر بولے۔

"بس آپ کی بہو بیگم اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ راستے میں فراخدلی سے لٹا آئیں۔ آپ ان سے پوچھیں، اپنے بچوں کو کیا پہنائیں گی۔"

"اور لے لینا۔" ابا میاں نے بھی بڑے آرام سے کہہ دیا تو میں نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ احمد کو آنکھ ماری جس سے وہ سٹپٹا کر رہ گئے۔

اگلے روز احمد اسلام آباد چلے گئے، ایک تو انہیں سیٹیں کنفرم کروانی تھیں دوسرے آفس کا بھی کچھ کام تھا۔ وہ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ اگر میں شام تک نہیں آیا تو سمجھ لینا، دو تین روز کے بعد آؤں گا، اور میں نے شام تک ان D کا انتظار کیا وہ نہیں آئے تو میں بی بی اور ابا میاں سے اجازت لے کر امی کے گھر آ گئی۔ یہ گھر جو کبھی ہم بہن بھائیوں سے بھرا بھرا سا لگتا تھا۔ اب کتنا خالی ہو گیا تھا جیسے سارے پنچھی ایک ساتھ اڑ گئے ہوں اور امی اور بابا کی

آنکھیں راہ تک رہی ہوں۔

''عائشہ آئی ہے۔'' میں امی کے سینے میں منہ چھپائے کھڑی تھی کہ بابا کی آواز سن کر میں لپک کر ان سے لپٹ گئی۔ یہ مہربان اور شفیق محبتیں پتا نہیں کیوں میری پلکیں نم کر دیتی ہیں۔

''آپ اچھے تو ہیں ناں بابا۔؟'' میں نے باپ کے مشفق چہرے کو احترام سے دیکھا۔

''الحمد للہ۔ اندر چلو بیٹا! یہاں بہت سردی ہے۔'' انہوں نے جواب دینے کے ساتھ کہا پھر مانی اور بابا کو اپنے دائیں بائیں لے کر اندر چلے تو میں بھی امی کے ساتھ ان کے پیچھے آ گئی۔ اور بیٹھتے ہی سب کے بارے میں پوچھنے لگی۔ فاطمہ، سلطانہ، پروین، نوید، ندیم۔ بابا سب ٹھیک ہیں۔ خوش ہیں، کہتے رہے۔ البتہ فاطمہ کی طرف سے امی اور بابا دونوں کچھ فکرمند نظر آئے تو مجھے فاطمہ پر غصہ آنے لگا کیونکہ میں اس کی عادت سے واقف تھی کہ وہ محض سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے خود کو مظلوم اور پریشان ظاہر کرنے لگتی ہے۔ کم از کم اب تو اسے امی اور بابا کے بڑھاپے کا خیال کرنا چاہیے۔ بہرحال میں نے انہیں تسلی دی۔ پھر مانی اور بابا بھوک بھوک چلانے لگے۔

''چلو بیٹا! پہلے بچوں کو کھانا کھلاؤ'' بابا نے کہا پھر احمد کا پوچھنے لگے۔'' احمد کھانے تک آ جائے گا؟''

''نہیں بابا! وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ دو تین روز بعد آئیں گے۔''

میں کہتی ہوئی مانی اور بابا کو لے کر امی کے پیچھے کچن میں آ گئی، چولہے میں انگارے دہک رہے تھے۔ امی نے دونوں بچوں کو وہیں قریب بٹھا دیا۔ اور پلیٹ میں سالن نکالنے لگیں۔ مجھے بھوک نہیں تھی لیکن محض اس خیال سے کہ یہ کام بھی نمٹا لیا جائے۔ بچوں کے ساتھ کھانا کھا لیا۔ امی اور بابا سرِ شام ہی کھا لیتے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں نے چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ جبکہ بچوں کو نیند آنے لگی۔

''تم انہیں سلاؤ، میں چائے بنا دوں گی۔''

امی نے کہا تو میں دونوں کو لے کر درمیان والے کمرے میں آ گئی۔ ایک پلنگ پر دونوں کو ساتھ لٹا کر لحاف اوڑھایا تو بابا چیخنے لگا۔

''ممی! بیڈ گیلا ہے۔''

''گیلا نہیں ہے بیٹا! ٹھنڈا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں گرم ہو جائے گا۔''

میں نے کہتے ہوئے بند کھڑکیوں کا جائزہ لیا پھر انہیں آرام سے سونے کی تاکید رتی ہوئی کمرے سے نکلنے لگی کہ امی چائے لے کر آ گئیں۔ مجھے بے حد شرمندگی ہوئی۔

''میں بنا لیتی امی۔''

''کوئی بات نہیں۔ چلو اب تم بھی آرام سے لحاف میں بیٹھو۔''

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''نماز پڑھوں گی۔''

''عشاء کی اذان ہو گئی کیا۔ اتنی جلدی۔''

مجھے تعجب ہوا۔ اور چائے لے کر دوسرے پلنگ پر آ بیٹھی۔ لحاف اوڑھا تو واقعی ف ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تک میں کپکپاتی رہی پھر سکون سے سو گئی۔ بچوں کو دیکھا ایک دوسرے ں منہ گھسائے سو رہے تھے۔ تب مجھے ان بچوں کا خیال آیا جو ایک خستہ حال رضائی میں انے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور پتا نہیں کیوں جہاں میرے اندر درد سمایا وہاں دل کے کاسے ں چھنن چھنن کی آوازیں گونجنے لگیں۔ پھر میں تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں رہی۔ کتنی دیر ہو گئی۔ ہر رف سناٹے کی حکمرانی تھی۔ تب میں نے سوچا اس سے پہلے کہ چولہے کے انگارے راکھ ہو ائیں میں اور چائے بنا لوں۔ گو کہ اب میرا بستر گرم ہو چکا تھا لیکن مجھے کہاں چین تھا۔ ے آرام سے لحاف چھوڑ کر کمرے سے نکل آئی۔ اف گہری سرد خاموش رات۔ میرے اندر نجو انگڑائیاں لینے لگی، اور کتنے بے شمار دکھ ایک ساتھ رونے لگے۔

''میں کیا کروں'' اپنی بے بسی پر میری آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ پلکیں جھپکتی ہوئی چن کی طرف بڑھنے لگی کہ بابا کی آواز نے قدم روک لیے۔ غالباً نماز کے بعد وہ ہاتھ ھیلائے بیٹھے تھے۔ اور مجھے ہمیشہ سے ان کا دعا مانگنا اچھا لگتا ہے۔ کتنا درد سمٹ آتا ہے ان ی آواز میں اب بھی ایک فقیرانہ سی صدا تھی جیسے کوئی ہاتھ میں کاسہ لیے اس کے در پہ کھڑا ہو۔

ے جاہ و جلال دو نہ ہی مال و منال دو
سوز بلال بس میری جھولی میں ڈال دو
دنیا کے سارے غم میرے دل سے نکال دو

اور پھر بار بار یہی صدا تھی۔ دنیا کے سارے غم میرے دل سے نکال دو۔ میں بے

خودی کے عالم میں چلتی ہوئی بابا کے کمرے میں آ گئی۔ آہٹ پر انہوں نے پہلے ہاتھ منہ پر پھیرے پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا اور ذرا سا مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے جنگل کی سرد تاریک رات میں ایک جھونپڑی میں ننھا سا دیا جلتا ہے۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

"بابا۔!" میں ان کے قریب آ کر دوزانو بیٹھ گئی۔ میرا انداز، میرا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ "ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے۔ دنیا کے سارے غم میرے دل سے نکال دو۔"

"ہاں۔!"

"کیوں بابا۔ غم تو بڑے انمول ہوتے ہیں۔ جو دل دکھوں سے خالی ہو جائے پھر اس میں کیا رہ جاتا ہے۔"

میری بات پر بابا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ محبت سے میرا گال تھپک کر بولے۔

"میری بچی! میں ان غموں سے نجات کی دعا مانگتا ہوں جو انسان کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ حسد اور زیادہ کی ہوس ان کی بنیاد ہے۔ ورنہ تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔ محبتوں کے دکھ واقعی بڑے انمول ہوتے ہیں۔ اور یہ ہر دل میں گھر نہیں کرتے۔ کچھ دل مخصوص ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان دکھوں کو سہارنا اور پھر ان کی دھیمی آنچ میں مسلسل سلگتے رہنا ہر ایک کے بس کی بات تو نہیں ہوتی۔"

"بابا۔!" میری آنکھوں میں پھر نمی اتر آئی۔ "یہ تنگ بھی تو بہت کرتے ہیں۔"

"ہاں بیٹا! تنگ تو کرتے ہیں لیکن روح کی تشنگی بھی انہی سے مٹتی ہے۔"

"روح کی تشنگی۔" میں نے چونک کر دیکھا تو انہوں نے میری پیشانی چوم لی۔

"دھیرے دھیرے سب سمجھ جاؤ گی، بس اپنا دامن تنگ نہیں کرنا۔ جاؤ اب آرام کرو۔"

"میں چائے بنانے جا رہی تھی۔ آپ پئیں گے؟"

"نہیں، پھر نیند نہیں آئے گی۔"

"اچھا، شب بخیر۔" میں ان کے کمرے سے نکل کر کچن میں آ گئی۔ چولہے میں انگارے آخری مرحلوں پر تھے۔ میں نے راکھ کو کرید کر انہیں ہوا دی اور پانی رکھ کر ہاتھ سینکنے لگی۔

محبتوں کے دکھ۔ روح کی تشنگی۔ میری ذہنی رو بھٹک گئی۔ اور ایسی ہی کیفیت میں میں نے چائے بنائی اور مگ اٹھا کر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ بچوں پر لحاف ٹھیک کیا پھر اپنی جگہ بیٹھ کر چائے پینے لگی۔ دھیرے دھیرے میرے اندر کا سناٹا ٹوٹنے لگا اور جب خالی مگ ایک طرف رکھ کر میں نے پلکیں موندیں تو کتنے دریچے وا ہو گئے تھے۔ اور میں نے ایک ایک دریچے میں دیکھنا شروع کیا، شاید کسی دریچے میں وہ بھی ہو۔



میں گندی سندی سی بچی ہوا کرتی تھی۔ گندی سندی یوں کہ زیادہ تر مٹی میں کھیلتی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد ہی جگ میں پانی لے کر آنگن کے آخری والے کونے میں جا بیٹھتی۔ اور پھر سارا دن وہیں گزرتا۔ مٹی کو آٹے کی طرح گوندھ کر اس کے چھوٹے چھوٹے برتن بناتی۔ پلیٹ، چمچ، ہانڈی، چولہا۔ پھر انہیں دیوار کے ساتھ سوکھنے کے لیے رکھ دیتی اور دوسری چیزیں بنانے کی کوشش کرتی۔ میرے صرف ہاتھ گیلی مٹی سے خراب نہیں ہوتے تھے۔ بال اور چہرہ بھی مٹی سے بھر جاتا۔ کیونکہ بار بار بال منہ پر آتے تھے اور میں انہی گندے ہاتھوں سے انہیں پیچھے کرتی تھی۔ امی آتے جاتے مجھے ٹوکتیں، اور فاطمہ کو میرے حلیہ سے کراہت آنے لگتی جبکہ چھوٹے بہن بھائی نہ صرف ہنستے بلکہ مذاق بھی اڑاتے تھے۔ کبھی کبھی تو نوید آئینہ لا کر میرے سامنے رکھ دیتا کہ اپنی شکل دیکھو، لیکن مجھے ان سب باتوں کی پروا نہیں تھی۔

شام میں امی زبردستی مجھے اٹھاتیں بلکہ گھسیٹتی ہوئی غسل خانے میں لے جاتیں اور نہلانے کے ساتھ ساتھ تنبیہہ بھی کرتی جاتیں کہ آئندہ میں مٹی سے نہیں کھیلوں گی۔ اور اس وقت تو میں ان سے وعدہ کر لیتی لیکن اگلے دن سورج نکلنے کے ساتھ ہی سب بھول جاتی۔

پھر ایک روز امی نے میرے ہاتھ سے پانی کا جگ چھین لیا کہ گیلی مٹی سے میرے کپڑے اتنے خراب ہو جاتے ہیں کہ انہیں دھونے میں مشکل ہوتی ہے۔ اس روز میں اپنے مخصوص گوشے میں بیٹھی تو پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب میں کیا کروں، خشک مٹی سے برتن کیسے بناؤں، کتنی دیر تک مٹی کا ایک ڈھیر بناتی اور توڑتی رہی۔ اس وقت غالباً میری عمر پانچ سال ہو گی کیونکہ ابھی میں نے اسکول جانا شروع نہیں کیا تھا۔ اور گاؤں میں تو ویسے ہی پانچ چھ سال کی عمر میں اسکول شروع ہوتا ہے۔

بہر حال اتنی عمر میں میں نے پہلا گھروندا بنایا تھا۔ مٹی کے ڈھیر کو اچھی طرح جما کر

پھر ایک طرف سے احتیاط سے تھوڑی مٹی باہر نکالی تو جھونپڑی نما گھر بن گیا تھا۔ میں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی پھر اس کے اطراف چار دیواری کھڑی کی اس کے بعد اس کے اندر مزید ایک کمرے کا اضافہ کرتے ہی میری خود کلامی کا آغاز ہو گیا۔

یہ میرا گھر ہے۔'' میں پتا نہیں کسے بتا رہی تھی۔ ''یہ اتنا بڑا آنگن، یہاں میں گلاب کے پھول لگاؤں گی، اتنے ڈھیر سارے رنگ برنگ کے۔ ایک پودا بڑے بھیا کا ہو گا، ایک فاطمہ کا، ایک یہاں امی اور بابا کے لیے اتنا بڑا پیڑ لگاؤں گی۔ اور میں۔'' میں نے دیکھا میرے پودے کے لیے جگہ ہی نہیں تھی۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی کس کا پودا اپنے نام کروں لیکن دل نہیں مانا۔ تب اپنے آپ کو تسلی دی۔

کوئی بات نہیں۔ میں سب کے پودوں کو پانی دوں گی پھر اپنے کمرے میں آ جاؤں گی، یہ میرا کمرہ ہے ناں۔ یہاں میں بیٹھوں گی اور یہاں وہ۔''

''وہ۔'' میرا ننھا سا ذہن الجھ کر رہ گیا، اور صرف اسی وقت نہیں بلکہ ہر نئے دن کے ساتھ میری الجھن میں اضافہ اور جستجو بڑھتی چلی گئی۔ ہر روز گھروندا بناتی۔ نئے سرے سے سنوارتی ساتھ ہی بڑے آرام سے خود سے باتیں کیے جاتی لیکن جہاں وہ، کا خیال آتا ہیں الجھ جاتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، وہ کیا ہے۔ اور پھر میں اپنی عمر اور سمجھ کے مطابق اسے کھوجنے لگی۔ رات میں جب رات کی رانی سے پورا آنگن مہکنے لگتا تو میں چپکے سے آ کر دریچے میں سے جھانکتی۔ یوں لگتا جیسے خوشبو کوئی سندیسہ لائی ہے۔ پھر صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے جا کر پھولوں کو دیکھتی تو ان پر ٹھہرے شبنم کے موتیوں میں جانے مجھے کیا نظر آتا تھا کہ میں کھو جاتی۔

''عائشہ۔!'' امی پکارتیں۔ ''سردی میں وہاں کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' میں کچھ اداس سی ہو کر امی کے پاس کچن میں آتی اور چھوٹے موٹے جو کام کر سکتی تھی کرتی۔ اس دوران امی مسلسل فاطمہ کو سخت سست کہتی رہتیں کہ وہ بڑی ہے پھر بھی کام میں میرا ہاتھ نہیں بٹاتی۔ اور مجھے امی کے کام کر کے خوشی ہوتی تھی۔

پھر فاطمہ کے ساتھ پہلی بار اسکول جاتے ہوئے میں بہت خوش تھی۔ مجھے اسکول سے زیادہ تانگے میں بیٹھنے کی خوشی تھی۔ تمام راستے چہکتی رہی۔ فاطمہ مجھ سے چار سال بڑی ہے اور اسی حساب سے وہ مسلسل مجھے ٹوکتی رہی۔ پھر اسکول آ کر میں قدرے سہم سی گئی کیونکہ

پہلی بار آئی تھی۔ تب فاطمہ میرا ہاتھ پکڑ کر میری کلاس میں لے آئی۔ میرے گلے میں سے بستہ اتار کر ایک جگہ رکھا پھر برآمدے تک آ کر ایک طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

''ادھر دیکھو۔ وہ مس ہاشمی ہیں۔''

''وہ۔ مس ہاشمی۔'' میں چونک کر دیکھنے لگی۔ وہ سرو قد لڑکی ہماری طرف آ رہی تھی۔ میرا دل ہولے ہولے دھڑکنے لگا۔ اور میں ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔ شاید مجھے اپنی جستجو کا سرا ہاتھ آ گیا تھا۔

''اسلام علیکم مس!'' قریب آنے پر فاطمہ نے سلام کیا پھر میری طرف اشارا کر کے بولی۔

''مس! یہ میری چھوٹی بہن ہے۔''

''اچھا اچھا، کیا نام ہے۔؟'' انہوں نے پوچھا اور فاطمہ بول پڑی۔

''عائشہ۔!''

''بہت پیارا نام ہے اور عائشہ تم بھی بہت پیاری ہو۔'' انہوں نے بہت پیار سے میرا گال چھوا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میرے گھروندے میں وہ مخصوص جگہ ان کے لیے ہے۔

اس روز میں نے چاہا کہ گھروندا بنا کر مس ہاشمی سے ڈھیروں باتیں کروں، لیکن موقع ہی نہیں ملا۔ پہلے کپڑے بدلے پھر امی نے کھانے کے لیے بٹھا دیا۔ اس کے بعد سو گئی۔ شام میں اٹھی تو اسکول کا کام پھر امی کے چھوٹے موٹے کام اور جب روزانہ کی یہی روٹین ہو گئی تو میں نے چپ چاپ گھروندے کو اپنے دل میں بسا لیا۔ پھر جیسے ہی رات میں تکیے پر سر رکھتی میرے دل کا گھروندا اپنے در وا کر دیتا۔

''یہاں میں بیٹھوں گی۔ یہاں مس ہاشمی۔''

''اوں ہوں۔'' مس ہاشمی نے مسکراتے ہوئے منع کر دیا تو میں نے روہانسی ہو کر ان کا آنچل تھام لیا۔

''مس! آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔''

''کتنا پیار، اپنے امی اور بابا سے زیادہ۔ اپنے بہن بھائیوں سے زیادہ۔''

''نہیں۔ ان سب کے جتنا۔''

''پھر میں یہاں کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔ یہاں اسے بٹھاؤ جو سب سے پیارا ہو۔''

"سب سے پیارا کون ہے؟"

اس رات اور اس کے بعد مسلسل میں یہی سوچتی رہی۔ لیکن کسی ایک کو سب سے الگ نہیں کرسکی۔ مجھے سب پیارے تھے۔ پھر میرے پیار کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

ہاجرہ جو میرے بعد اسکول میں داخل ہوئی تھی بے حد ڈری سہمی ایک کونے میں بیٹھی تھی مجھے اس پر ترس آیا۔ قریب جا کر اس کا ہاتھ تھاما تو وہ رونے لگی، اس کی آنکھوں سے آنسو، موتیوں کی صورت اس روانی سے ٹپکے تھے کہ میں حیران ہو کر دیکھے گئی۔ سچ مچ میرا دل چاہا میں ہاتھوں کا کشکول بنا کر سارے موتی اس میں جمع کرلوں۔

"تم روتی کیوں ہو۔؟" میں نے افسردہ ہو کر پوچھا۔

"میری دوات ٹوٹ گئی ہے۔ ساری سیاہی گر گئی۔ اب میں تختی کیسے لکھوں گی۔ مس ماریں گی اور اماں بھی۔" وہ اور شدت سے رونے لگی اور میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

"اماں کیوں ماریں گی۔؟"

"دوات جو ٹوٹ گئی ہے۔ اور اماں دوسری دوات نہیں لا کر دے سکتیں۔"

"کیوں۔؟"

ہم بہت غریب ہیں۔"

"غریب۔" پتا نہیں اس وقت میرے ذہن میں غریب کا کیا تصور تھا لیکن مجھے یاد ہے میں ایک پل میں بہت امیر ہو گئی تھی، اپنی دوات اسے دے کر بدلے میں اس کے سارے موتی اپنے دامن میں جو سمیٹ لیے تھے۔ ہائے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ درد کے موتی ہیں جو ایک بار دل میں سما جائیں پھر نکلتے نہیں بلکہ اوروں کے لیے بھی راستہ ہموار کرتے ہیں۔ اور میرے دل کے راستے میں تو کوئی پیچیدگی تھی ہی نہیں۔ سیدھی شفاف سڑک اور وہ بھی ڈھلوان ادھر کسی کی آنکھ سے موتی ٹپکا اور ڈھلوان سے پھسلتا ہوا سیدھا میرے دل میں جاگزیں ہو گیا۔ گو کہ یہ موتی بڑے انمول تھے پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے آزردہ رکھنے لگے۔ میں امیر ہو کر بھی خوشی سے تالیاں نہیں بجا پاتی تھی، شاید اس لیے کہ کوئی میرے ساتھ شیئر کرنے کو تیار نہیں تھا۔

شروع میں میں نے سب کو بہت خوش ہو کر اپنے دامن میں بھرے انمول موتی دکھائے تھے۔ لیکن کوئی بھی خوش نہیں ہوا نہ میرے خیال کے مطابق کسی نے مستعار مانگے بلکہ

سب ہی خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ پھر مختلف آوازیں تھیں۔

"پھینکو انہیں، بچھو ہیں۔"

"دیمک ہے، دھیرے دھیرے تمہارے وجود کو کھوکھلا کر دے گی۔"

"انگارے۔ جل کر راکھ ہو جاؤ گی۔"

اور میں انگارے چھو چکی تھی۔ کوئی کیا جانے ان کے اسرار شاید میں خود بھی نہیں جانتی تھی مجھے تو بس اتنا معلوم تھا کہ اندر کہیں کسی گوشے میں ایک جنت نظیر وادی ہے جب میں انگاروں پر پاؤں دھرتی ہوں۔ تب ہی اس کا دروازہ کھلتا ہے اور شروع میں تو میں اس وادی میں اتر کر بس یونہی خوشی ہوا کرتی تھی۔ اپنے آپ میں مگن کبھی کلیوں کو چھو کر دیکھتی، کبھی پھولوں کو گدگداتی، کسی وقت جھر جھر بہتا جھرنا اپنی طرف کھینچ لیتا۔ اتنی ڈھیر ساری خوبصورتیوں میں کھو کر ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے میں تنہا نہیں ہوں کوئی بے حد حسین سا احساس تھا جس کے سامنے یہ ساری خوبصورتیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ میں اچانک بہت بے قرار ہو گئی ایک ایک کلی سے پوچھتی پھری۔

"کون ہے۔ کہاں ہے۔"

"ڈھونڈ لو۔" کتنی پیاری شوخی تھی۔ اور میں ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ مجھے یقین تھا 'وہ' یہیں کہیں ہے پھر بھی میں اسے کھوجنے اور دیکھنے سے قاصر رہی اور اس رات کے اختتام پر وادی سے نکلتے ہوئے میں بے حد آزردہ تھی۔

پھر وقت گزرتا چلا گیا۔ میں سوائے جستجو کے بہت کچھ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اور اس مقام پر میری جستجو اور کتنے رنگ شامل ہو گئے تھے۔ میرے تصور کی دنیا میں اب بھی وہ ہی وہ تھا۔ پہلے میں صرف سوچتی تھی، وہ کون ہے کہاں ہے جبکہ اب اسے پانے کی تمنا کرنے لگی تھی۔ میرا خیال ہے میں نے شروع ہی میں آئیڈیل بنا لیا تھا اور جب لڑکپن کی عمر سے نکلتے ہی نئے جذبے بیدار ہونے لگے تو اسے پانے کی تمنا بھی جاگ اٹھی تھی۔ پھر مجھے اپنے جذبے کسی پر عیاں کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ گو کہ میری بہت ساری سہیلیاں تھیں جن میں ہاجرہ تو بچپن کی دوست تھی لیکن اپنی جستجو کے سفر میں میں نے اسے بھی ساتھ نہیں لیا۔ شاید اس کے لیے میں نے ہاجرہ سے دوستی سے پہلے ہی اپنی ایک الگ دنیا بسا لی تھی۔

میرا ایک گھروندا تھا۔ اور جب جو اچھا لگا میں نے اسے گھروندے میں بسا لیا لیکن

مستقل ٹھکانہ تو کسی نے بھی نہیں کیا۔ پرائمری تک مس ہاشمی اس کے بعد اسکول بدلا تو ان کی جگہ مس زیدی نے لے لی۔ پھر وہ اسکول چھوڑ کر چلی گئیں تو مس سلمیٰ آ گئیں۔ اس کے بعد میں اپنی دوست زاہدہ ہی کو سب کچھ سمجھنے لگی۔ اب بھی میں ان سب کو سوچتی ہوں تو مجھے ایک قدر مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے محبت۔ گویا میں اپنے گھروندے کو محبت کے سدا بہار پودے سے ہمیشہ ہرا رکھنا چاہتی ہوں۔

بہر حال عمر کے اس حصے میں جب نئے جذبے بیدار ہو چکے تھے تو میرے سوچنے کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ پھر بھی اپنی ٹیچرز اور سہیلیوں سے کی ہوئی محبتیں نہ تو بھلائی جانے والی تھیں اور نہ ہی میں نے انہیں کبھی دل سے نکالنے کا تصور کیا۔ اس لیے کہ میرے دل میں ابھی بھی بہت گنجائش تھی شاید اتنی کہ ساری دنیا سما جائے۔ اور یہ سچ ہے کہ میرے پاس محبت کا نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔ ساری دنیا میں بانٹتی پھروں تب بھی خالی نہیں ہو گا لیکن افسوس کہ اکثریت کے نزدیک محبت کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ سب مادہ پرست ہیں۔ یا شاید جانتے ہیں کہ محبتوں کے راستے میں جنگل گل زار ہیں اس سے کہیں زیادہ خار اور کون جانے ان خاروں کے اسرار۔ میں بھی نہیں جانتی مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ اندر کہیں کسی گوشے میں ایک جنت نظیر وادی ہے جب ان خاروں سے الجھتی ہوں تب ہی اس کا دروازہ کھلتا ہے اور کتنے دن ہو گئے نہ انگاروں پہ پاؤں دھرا نہ خاروں سے الجھی۔ کہیں میں دنیا کے جھمیلوں میں تو نہیں کھو گئی۔



فاطمہ کی منگنی چچا زاد عاطف سے ہو رہی تھی گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اور کام اتنا کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ امی بار بار ٹوک رہی تھیں کہ میں کپڑے بدل لوں اور جہاں میں اس ارادے سے کمرے کی طرف جانے لگتی کوئی نہ کوئی پکار لیتا۔ اور میں اندر ہی اندر جھنجھلاتی ہوئی ادھر متوجہ ہو جاتی۔ لیکن اس وقت میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب کسی آواز پر کان نہیں دھروں گی۔ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ پھر کسی نے پکار لیا۔

''عائشہ سنو۔'' میں نے توجہ نہیں دی۔

''رکو تو۔ دیکھو یہ دانیال بھائی آئے ہیں۔''

''وہ کسی دانیال بھائی کو نہیں جانتی۔''

میں کہتی ہوں جھپاک سے کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ بھی بند کر لیا۔ مجھے اب سچ مچ مہمانوں پر غصہ آنے لگا تھا۔ کیونکہ سب ہی قریبی عزیز تھے لیکن ہر ایک اپنی جگہ مہمان خصوصی بن کر بیٹھ گیا تھا۔ کہ ایک گلاس پانی کے لیے بھی مجھے آواز دی جاتی۔ پھر جب میں تیار ہو کر کمرے سے نکلی، تب بھی میرا موڈ خراب ہی تھا۔ بہت احتیاط سے سب کی نظروں سے بچتی ہوئی میں نے چاہا کہ چپ چاپ فاطمہ کے پاس جا کر بیٹھ جاؤں کہ مامی جی نے پکار لیا۔

''جی۔!'' میں با دل نخواستہ ان کی طرف پلٹی لیکن ان کے ساتھ کسی کو کھڑے دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سی گئی۔ تب مامی جی ہنس کر بولیں۔

''ارے پہچانا نہیں؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو کہنے لگیں۔

''ہاں تم کہاں پہچانو گی۔ جب یہ گیا تھا تم چھوٹی تھیں۔''

''ابھی بھی بڑی تو نہیں لگ رہیں۔'' وہ شرارت سے کہہ کر براہ راست مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''تم وہی ہو ناں جو اس کونے میں بیٹھ کر مٹی سے کھیلا کرتی تھیں۔''

''جی۔!'' میں نے اس کی شاندار پرسنالٹی کو دل میں سراہتے ہوئے کہا۔ ''غالباً آپ دانیال بھائی ہیں۔''

''اوں ہوں۔'' اس نے بڑا سا منہ بنایا۔ ''آخر سب لوگ میرے نام کے ساتھ بھائی کا دم چھلا کیوں لگا رہے ہیں۔''

''اچھی بات ہے ناں، آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ سب لوگ آپ کو اتنی عزت دے رہے ہیں۔''

''ارے یہ لوگ کیا عزت دیں گے، ہونہہ۔!'' اس نے نخوت سے سب مہمانوں پر نظر ڈالی، جیسے وہ سب اس کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ تب ہی امی نے مجھے پکار لیا تو میں اس سے معذرت کر کے امی کے پاس چلی آئی۔

''تم دانیال کے پاس کیوں کھڑی تھیں۔؟'' امی کے تنبیہی لہجے میں ناگواری بھی شامل تھی۔

''مامی جی نے روکا تھا۔''

''تمہاری مامی جی تو بس۔ بہر حال اب ادھر نہیں جانا۔''

امی کہتی ہوئی دوسری طرف چلی گئیں تو میں افسردہ سی ہو کر پھوپو جی کے پاس آ بیٹھی۔ سچ سچ اب مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ محض امی کی ناگواری کے باعث۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ ہر بات میں مجھے ہی کیوں ٹوکتی ہیں۔ فاطمہ پر تو انہوں نے کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔

”ہیں، تم تو یوں چپ چاپ بیٹھی ہو جیسے فاطمہ ابھی رخصت ہو رہی ہو۔“

میری خالہ زاد عفت نے میرے برابر بیٹھتے ہوئے مجھے کہنی مار کر کہا تو میں قصداً مسکرائی۔

”نہیں بس کچھ تھک گئی ہوں۔“

”سنو۔!“ کچھ دیر بعد اس نے مجھے سرگوشی میں متوجہ کیا۔ ”دانیال کو دیکھا ہے۔ کیا زبردست پرسنالٹی ہے۔ ایمان سے سب میں نمایاں نظر آ رہا ہے۔ اور مامی جی کو دیکھو، کیسی اترائی اترائی پھر رہی ہیں۔“

”بس چپ کرو۔“ میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔ مجھے ڈر تھا کہیں کوئی سن نہ لے۔

”دیکھو، وہ آ رہا ہے۔“

”وہ۔“ اس کے چٹکی کاٹنے پر میں نے چونک کر دیکھا۔ پتا نہیں جہاں کوئی 'وہ' کا اشارا کرتا میرا ذہن کیوں بھٹک جاتا۔

”یہاں میں بیٹھوں گی یہاں وہ، اور اس وقت ذہن میں یہی تکرار تھی اور نظروں کے عین سامنے دانیال۔ جس کی وجاہت کے قصے زبان زدعام تھے۔

پھر منگنی کی رسم ادا ہونے کے بعد سب لڑکوں نے بڑے کمرے پر قبضہ جما کر وہاں محفل جمالی۔ زیادہ تر مہمان چلے گئے بس وہ لوگ رہ گئے جن کے گھر قریب تھے۔ لڑکیاں میرے اور فاطمہ کے مشترکہ کمرے میں آ بیٹھیں۔ اور میں D بھی فراغت سے بیٹھنا چاہتی تھی لیکن بڑے بھیا نے آ کر چائے کے لیے کہہ دیا۔ اور میں نے کسی کام کو منع کرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ خواہ خود پر جبر کر کے کرنا پڑتا۔ عفت کو لے کر کچن میں آ گئی۔

چائے بنانے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگی، پھر عفت کا کہنا تھا کہ ہم خود جا کر دے آتے ہیں لیکن مجھے امی کا خوف تھا کیونکہ بڑے کمرے میں سب لڑکے ہی لڑکے تھے اور امی مجھے ادھر جانے کو منع کر چکی تھیں اچھا ہوا بڑے بھیا خود آ گئے۔ میں نے جلدی سے ٹرے انہیں تھما دی۔ پھر عفت اندر فاطمہ کے پاس چلی گئی اور میں نے دیکھا۔ نوید آنگن میں پھیلی

کرسیاں اٹھا اٹھا کر ایک طرف رکھ رہا تھا۔ اسے اکیلا دیکھ کر میں بھی اس کے ساتھ لگ گئی۔

”تم رہنے دو، میں کر لوں گا۔“ اس نے مجھے منع کیا لیکن میں اب کہاں آرام سے بیٹھ سکتی تھی۔ ان سنی کر کے اس کے ساتھ لگ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی بڑے کمرے سے گانے کی آواز آنے لگی۔

اک پیار کا نغمہ ہے موجوں کی روانی ہے
زندگی اور کچھ بھی نہیں تیری میری کہانی ہے

پتا نہیں کون گا رہا تھا۔ بہت خوبصورت اور دل کو چھو لینے والی آواز تھی۔ میں رک کر سننے لگی۔ اور جب نوید نے دیکھا تو میں نے کھوئے ہوئے انداز میں اس سے پوچھا۔

”کون گا رہا ہے؟۔“

”پتا نہیں، شاید دانیال بھائی۔“ وہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اور میں ایسی ہی بے خود میں برآمدے تک آ گئی پھر ایک دم چونک کر اپنے کمرے کی راہ لی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ دانیال اکثر ہمارے ہاں آنے لگا۔ اور پتا نہیں کیوں وہ جب بھی آتا۔ امی مجھے کسی نہ کسی کام میں مصروف کر دیتیں۔ پھر ایک روز موقعہ ملتے ہی وہ مجھ سے کہنے لگا۔

”میں تمہارے لیے آتا ہوں اور تم غائب ہو جاتی ہو۔“

”میرے لیے۔“ ایک پل کو میرا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ پھر میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو کہنے لگا۔

”اتنا ڈرتی کیوں ہو۔؟۔“

”پتا نہیں۔“ میں کہتی ہوں اندر بھاگ گئی۔ اور اس رات میں نے چاند، تاروں، پھولوں، کلیوں سب کو بتانا چاہا کہ وہ میرے لیے آتا ہے لیکن کسی نے بھی رک کر میری بات نہیں سنی۔ تب میں ان سب سے روٹھ کر اپنے گھروندے میں آ بیٹھی۔ جہاں ایک طرف میری چاہتوں کے گلاب کھلے تھے اور دوسری طرف درد کے موتیوں کا انبار تھا۔ اور پتا نہیں کیسے میں اس وقت گلابوں سے نظریں چرا کر موتیوں کے پاس آ بیٹھی۔ یہ وہی موتی تھے جنہیں کوئی بچھو کہتا تھا کوئی دیمک اور کوئی انگارے۔ اور میں کسی کو کیا بتاتی کہ یہ میرے لیے کتنے انمول تھے۔ یہی تو تھے جو میرے دل کو گداز بخشتے تھے۔ میں نے بہت دھیرے سے

انہیں چھوا تھا اور اگلے پل اس حسین ولوی میں اتر گئی۔ شاید میں بہت دنوں بعد یہاں آئی تھی جب ہی ہر شے خفا لگ رہی تھی۔

''سنو۔ سنو۔'' میری جان پر بن گئی لیکن دوسری طرف بے نیازی ہی بے نیازی تھی۔ تب میں ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی۔

''روتی کیوں ہو؟۔'' پھول نے انگڑائی لی۔

''تم خفا جو ہو۔''

''تمہیں میری خفگی کی کیا پروا۔''

''ایسا نہ کہو۔ مجھے بہت پروا ہے۔''

''جھوٹی!'' سب نے شور مچا دیا۔ ''پروا ہوتی تو یوں خالی ہاتھ نہ آتیں۔ بتاؤ اور کتنے موتی لائی ہو ہمارے لیے۔''

''اور۔ اور تو نہیں ہیں۔''

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بے تحاشا ندامتوں میں گھر کر بولی تو اچانک سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا تو ہوا نے سرگوشی کی۔

''تمہاری ندامت کے موتی اچھے لگے۔'' میں اور شدت سے رو پڑی۔

''عائشہ۔!'' بابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا تو میں آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے بیٹا۔ تم رو کیوں رہی ہو۔ کیا کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھیں؟۔''

''بھیانک خواب۔ میں رو رہی ہوں۔'' میں نے اپنا چہرہ چھو کر دیکھا۔ گیلا ہو رہا تھا اور حلیہ بھی۔ بابا سے نظریں چرا کر اٹھ بیٹھی۔ تو وہ کہنے لگے

''خواب تو خواب ہوتا ہے۔ ڈرتے نہیں ہیں۔''

''جی۔ لیکن بابا میں بھیانک خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی۔''

''پھر۔؟۔''

''پتا نہیں۔ پتا نہیں کیا تھا۔ بس میں رونے لگی۔'' اب بابا کو کیا بتاتی، یہی کہہ سکی۔

''چلو اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ کالج جاؤ گی یا۔''

''جاؤں گی۔'' میں جلدی سے کہہ کر پلنگ سے اتر آئی۔ پھر کالج کے لیے تیار ہو کر

ناشتا کرنے کچن میں آئی تو فاطمہ پتا نہیں امی سے کس بات پر الجھ رہی تھی۔ میں نے قصداً توجہ نہیں دی اور بہت خاموشی سے مگ میں چائے ڈال کر پینے لگی۔

''خالی چائے کیوں پی رہی ہو؟۔''

امی نے دیکھا تو فوراً ٹوکا۔ ساتھ ہی روٹی کا برتن اٹھا کر میرے سامنے رکھا۔ تو میں دو تین نوالے چائے کے ساتھ حلق سے اتار کر کچن سے نکل آئی۔ بابا برآمدے میں بیٹھے ناشتا کرنے کے ساتھ اخبار بھی دیکھ رہے تھے۔ میں نے بیگ اور کتابیں اٹھائیں اور انہیں سلام کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اور پھر ابھی اسٹاپ پر آ کر کھڑی ہوئی تھی کہ دانیال نے گاڑی میرے قریب آن روکی۔

''کالج جا رہی ہو۔ آؤ میں چھوڑ دوں گا۔'' اس نے کہتے ہوئے گاڑی کا دروازہ بھی کھول دیا اور میں بالکل غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ گو کہ وہ میرا ماموں زاد تھا لیکن اس روز جس طرح امی نے مجھے ٹوکا تھا تو میں کچھ محتاط سی ہو گئی تھی۔

''آؤ ناں۔'' اس نے اصرار سے بلایا اور میرے نفی میں سر ہلانے پر گاڑی سے اتر کر میرے قریب آ گیا۔

''عجیب لڑکی ہو۔ اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ یہاں کون ہے دیکھنے والا۔ چلو بیٹھو۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا۔ تب ہی ایک چھوٹا سا بچہ درمیان میں آ گیا۔

''اللہ کے نام پر بابو جی، ایک روپیہ۔''

''الو کا پٹھا۔'' دانیال ایک دم غضبناک ہو گیا اور جو ہاتھ میری طرف بڑھایا تھا اسی سے بچے کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ دور جا گرا۔ اور میرے منہ سے نہ صرف چیخ نکلی بلکہ بے اختیار لپک کر بچے کو اٹھا لیا۔ غالباً اسے کہیں شدید چوٹ لگی تھی جو وہ بلک بلک کر رونے لگا تھا۔ ہائے اس معصوم کے آنسو، میرا دل درد سے پھٹنے لگا۔ بے حد تاسف سے دانیال کو دیکھا تو وہ نخوت سے بولا۔

''پھینکو اسے، دیکھتی نہیں ہو، کتنا گندا ہے۔''

پھر جھنجلا کر بڑبڑانے لگا۔ ''گندی نالی کے کیڑے صبح ہی صبح راستے میں آ جاتے ہیں۔''

''دانیال پلیز، آپ جائیں یہاں سے۔'' میں نے بمشکل خود پر ضبط کر کے کہا پھر

اس سے چند قدم دور آ کر بچے سے پوچھا۔

''کہاں چوٹ لگی ہے بیٹا۔'' وہ اور زیادہ رونے لگا۔ اور اس کی آنکھوں سے گرتے موتی نہیں ہیرے تھے شفاف، چمکدار اور میرے دل کے راستے میں تو یوں بھی کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ سیدھی شفاف سڑک وہ بھی ڈھلوان۔ ادھر ہاتھوں کا کشکول بنایا ادھر دل کے کاسے میں چھنن چھنن کی آوازیں جلترنگ بجانے لگیں۔ کون جانے اس جلترنگ کے اسرار۔ میں بھی نہیں جانتی۔

میری طرف سے مایوس ہو کر دانیال چلا گیا۔

تب میں نے آرام سے بچے کو نیچے کھڑا کیا اور میرے بیگ میں جتنے پیسے تھے نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیئے۔ میں ایسا کرتے ہوئے سچ مچ بہت شرمندہ تھی کیونکہ اتنے انمول ہیروں کے عوض ان چند روپوں کی کیا حقیقت تھی۔

پھر دوپہر میں جب میں کالج سے لوٹی تو دانیال پہلے سے موجود تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس سے کراہت سی محسوس ہوئی۔ اس کی طرف سے منہ پھیر کر جانے لگی کہ وہ امی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''پھوپھو! صبح میں نے دیکھا۔ عائشہ ایک فقیر بچے کو گود میں لیے ہوئے تھی۔ اف مجھے اتنا عجیب لگا۔ اتنے گندے بچے کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہی تھی۔''

''اس کی تو عادت ہے سب کے آنسو پونچھنے کھڑی ہو جاتی ہے۔''

فاطمہ نے بھی میرا مذاق اڑایا اور میں جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اب فاطمہ اسی حوالے سے جانے کب کب کے قصے سنائے گی۔ اور میں اپنی ذات کے اس اسرار کو خود سے بھی پوشیدہ رکھتی تھی۔

پھر کچھ وقت اور سرک گیا، فاطمہ شادی ہو کر اپنے گھر چلی گئی تو میں بہت اکیلی اکیلی سی ہو گئی۔ گو کہ ہماری عادات اور ہمارے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے میں فاطمہ کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ اس کے جانے سے ایک دم خالی خالی ہو گئی۔ حالانکہ بڑے بھیا اکثر چھیڑتے۔

''عائشہ! تمہارے مزے ہو گئے، جان چھوٹ گئی فاطمہ سے۔'' میں ان کی بات پر ذرا سا ہنس دیتی۔

انہی دنوں جب میں تنہا ہو کر اپنی ذات کے اسرار سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ دنیا کی بھیڑ میں سے نکل کر ایک شخص اچانک میرے سامنے آ کھڑا ہوا جسے دیکھتے ہی میں سب بھلا بیٹھی یوں لگا میری جستجو کا سفر تمام ہوا شاید میں برسوں سے اسے ہی کھوجتی آ رہی تھی۔

''آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟'' میں اس کی بائیک سے ٹکرائی تھی بلکہ ایک بچہ اچانک بھاگتا ہوا اس کے سامنے آ گیا تھا اور اسے بچانے کے چکر میں اس کی بائیک الٹ گئی۔ میں وہیں کھڑی تھی۔ وہیل لگنے سے پیچھے جا گری اور گرا تو وہ بھی تھا لیکن فوراً کھڑا ہو کر میری خیریت پوچھنے لگا اور میں اتنی نروس ہوئی کہ اپنے کپڑے جھاڑنے میں لگ گئی۔

''آپ کا نام عائشہ ہے ناں۔؟'' اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا اس کے ہونٹوں میں بڑی پیاری مسکراہٹ دبی تھی۔

''آ۔'' میں پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ کون ہیں۔ لیکن میرے ہونٹ بس ذرا سا کھل کر رہ گئے۔ تب وہ کہنے لگا۔

''ہم جانتے ہیں آپ کو۔ آپ محمود کی بہن ہیں۔''

اس نے بڑے بھیا کا نام لیا تو میں سمجھ گئی۔ ان کا کوئی دوست ہے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ میں بڑے بھیا کے دوستوں کو جاننا تو کیا کبھی کسی کے سامنے گئی بھی نہیں تھی جبکہ وہ باقاعدہ میرا نام لے رہا تھا۔

''آیئے۔ ہم آپ کو گھر تک چھوڑ دیں گے، اس بہانے محمود سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔'' اس کے اتنے آرام سے کہنے پر میں سٹپٹا گئی۔

''جی نہیں شکریہ۔''

''کس بات کا۔؟''

''میرا مطلب ہے، میں خود چلی جاؤں گی۔''

''اچھا۔!'' وہ بائیک پر جا بیٹھا پھر میرے پیچھے نظر ڈال کر پوچھنے لگا۔ ''آپ یہاں، اس کالج میں پڑھتی ہیں۔؟''

''جب میرے نام سے واقف ہیں تو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے۔''

میں بے اختیار کہہ گئی۔ تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر غالباً کسی خوشگوار احساس میں گھر گیا۔ ایک پل دو پل اور میں اپنے دل کے گھروندے میں

محبت کا ایک اور بیج بو گئی۔ حالانکہ میں جانتی تھی محبت بہت دکھ دیتی ہے۔ جس سے ہم پیار کرتے ہیں، اس کی ذات کے سارے دکھ ہماری جھولی میں آن گرتے ہیں۔ اور میں کیا کروں۔ محبت کے خزانے کی طرح میرا دامن بھی بہت وسیع ہے، ساری دنیا کے دکھ سمیٹتی پھروں تب بھی تنگ نہیں پڑے گا۔

''اچھا پھر ملاقات ہوگی۔'' وہ کہتا ہوا بائیک بڑھا لے گیا۔ تب اچانک جیسے میں ہوش میں آ گئی۔ تو عجیب سی الجھن۔

اس شام پودوں کو پانی دیتے ہوئے میں نے ایک ایک سے پوچھا کون تھا؟''

''وہ۔'' ہر کلی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا تھا تب مجھے یقین ہو گیا کہ میری جستجو کا سفر تمام ہوا۔

اور پھر واقعی اسے دھڑکنوں میں بسا کر میں بہت مگن ہو گئی۔ جیسے اب مزید پانے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ وہی میری آرزو، وہی میری منزل۔ اور منزل کے راستے میں کچھ کٹھنائیاں بھی تھیں۔ لیکن ابھی میں یہ سب سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ برسوں بعد ایک خوشگوار احساس ملا تھا اور میں بس خوش ہونا چاہتی تھی۔ میری بے نام سی اداسیوں نے چپ چاپ کسی کونے میں منہ چھپا لیا۔ جبھی تو میں اور آزاد ہو گئی تھی۔ آہٹوں پر چونکنا اور دستک پر دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ کسی وقت جب کوئی آ کر بڑے بھیا سے یہ کہتا کہ باہر ان کا کوئی دوست آیا ہے تو میں جہاں کھڑی ہوتی پوری ان سے متوجہ ہو جاتی۔

عجیب سی بے قراری تھی اور یہ خیال کہ میں اسے جانتی تھی اور وہ میرے نام سے بھی واقف ہے۔ مجھے سوچنے اور پھر مسکرانے پر مجبور کرتا۔ زندگی کا یہ موڑ واقعی بہت خوبصورت تھا۔ کوئی پہلی نظر میں ہی میری ذات کے گرد ایسا حصار کھینچ گیا تھا جس میں ہمہ وقت رنگوں اور خوشبوؤں کی بارات اترتی محسوس ہوتی تھی۔ پھر دوسری بار بھی وہ مجھے کالج کے سامنے ملا جبکہ خصوصاً مجھ سے ملنے آیا تھا۔ چھوٹتے ہی کہنے لگا۔

''ہمیں خود پر اختیار نہیں رہا۔ پتا نہیں کیا جادو کر دیا ہے۔ آپ نے۔ سارا وقت آپ ہی کا خیال رہتا ہے۔'' میں سر جھکا کر دھیرے سے مسکرائی۔

''ہم پریشان ہیں اور آپ ہنس رہی ہیں ٹھیک ہے اڑا لیں ہمارا مذاق، ہم بھی محمود سے آپ کی شکایت کریں گے۔''

''کیا۔؟'' میں سٹپٹا گئی۔ ''کیا کہیں گے آپ بڑے بھیا سے؟''

''یہی کہ آپ کی بہن بہت تنگ کرتی ہے۔''

وہ بڑے شوق سے مجھے پریشان ہوتے دیکھ رہا تھا۔

''میں کب تنگ کرتی ہوں۔''

''ہر وقت۔ نہ دن میں چین لینے دیتی ہیں نہ رات میں۔''

''تو آپ یہ سب بڑے بھیا سے کہیں گے؟''

''ہاں۔!'' اس کے اتنے آرام سے کہنے پر میں روہانسی ہو گئی اور روٹھ کر اپنے ستے پر سے چل پڑی تو وہ لپک کر پیچھے آیا۔

''ارے، آپ تو مذاق کا بھی برا مان گئیں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے مجھ سے مذاق کرنے کی۔'' میں تڑخ کر بولی۔ ''آپ ا کون، میں تو آپ کو جانتی تک نہیں۔''

''واقعی۔!'' اس نے حیرت کا مظاہرہ کیا پھر میرے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کہنے لگا۔ ہمارا نام احمد ہے۔ ایک سیمی گورنمنٹ ادارے میں ملازم ہیں۔ آپ کے گھر سے تھوڑا آگے کر ہمارا گھر ہے، کبھی آیئے ناں۔''

''ہیں۔!'' میں قدم روک کر اسے دیکھنے لگی تو مسکین شکل بنا کر پوچھنے لگا۔

''ناراض تو نہیں ہوئیں ناں۔؟'' میں خاموش رہی تو صدیوں کے فاصلے پل میں یٹ گیا۔

''ہم آپ کو بہت مانتے ہیں۔'' میرا دل اس اظہار پر بہت زور سے دھڑکا۔ ہائے '' جیسے اس کے ساتھ ساری خدائی شریک ہو۔ کتنا خوش کن تھا یہ احساس کہ وہ میری طرف توں کے قافلے لیے چلا آ رہا تھا۔

''آپ کو تو خبر بھی نہیں ہے عائشہ، ہم آپ کو بہت عرصے سے جانتے ہیں۔ اسی ستے پر ہم آپ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ آپ ہی کی خاطر ہم نے محمود سے دوستی کی۔ اگر پ ناراض ہو گئیں تو ہم تو مر جائیں گے۔''

''نہیں، میرا مطلب ہے میں ناراض نہیں ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا تو وہ دم بہت خوش ہو گیا تھا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ میری آنکھیں بڑے خوبصورت خواب بننے لگی تھیں۔ یوں بھی محبت کا یہ رنگ دوسری محبتوں سے الگ اور جدا سا تھا۔ جس میں ایک پل جدائی کا ہجر۔ اور کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے کوئی بہت خاموشی سے میری محبتوں کو آزما رہا ہے۔ یا پھر آزمائش کی بھٹی میں اترے بنا محبت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ بہرحال اس روز دانیال آیا تو پہلے بہت مشکوک نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر موقع ملتے ہی میرے پاس چلا آیا۔

''سنو۔ آج تمہارے ساتھ کون تھا؟''

اس کے مشکوک لہجے پر میرا دل لرزنے لگا۔ میں سمجھ گئی، وہ مجھے احمد کے ساتھ دیکھ چکا ہے پھر بھی انجان بننے کی کوشش کی۔

''کب۔؟''

''دوپہر میں، کالج سے واپسی پر۔'' اس کی چبھتی ہوئی نظریں مجھ پر جمی تھیں اور میں قصداً سوچنے میں لگ گئی۔ تب وہ کہنے لگا۔

''شاید محمود کا دوست ہے میرا خیال ہے میں نے اسے فاطمہ کی منگنی پر دیکھا تھا۔ ہاں یاد آیا اس نے ایک گانا بھی سنایا تھا ایک پیار کا نغمہ ہے۔''

''ایک پیار کا نغمہ ہے۔ میری سماعتوں میں اس کی آواز گونجنے لگی اور میں کھوسی گئی بالکل بھول گئی کہ سامنے دانیال کھڑا ہے اور پتا نہیں وہ کتنی دیر کھڑا رہا مزید کیا کچھ کہا۔ میں جب چونکی تو وہ جا چکا تھا۔ تب مجھے ڈر لگنے لگا۔ جانے وہ کس کس سے اور کیا کیا کہے کہیں افسانہ ہی نہ بن جائے اچانک کتنے اندیشے دل میں گھر کر گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں۔ کسی کو ہمراز بھی تو نہیں بنایا تھا جواب مدد کے لیے پکارتی۔

میرے دوست میرے ہمنوا، پھول، کلیاں، سورج، چاند، ستارے اور میں ان سے احوال کہتے کہتے بہت آگے نکل گئی۔

''الٰہی، میری لاج رکھنا، میں بہت بزدل لڑکی ہوں کسی رسوائی کا سامنا نہیں کر سکتی۔''

اور اس ہفتے بڑے بھیا ٹرانسفر ہو کر کراچی چلے گئے تو میں جو اس خوف میں مبتلا ہو کر اپنا سکھ چین گنوا بیٹھی تھی کہ دانیال کسی بھی وقت بڑے بھیا کو احمد کی بابت بتا دے گا، قدرے اطمینان سے ہوگئی۔ لیکن ابھی میں احمد سے مل کر اسے یہ صورتحال بتا بھی نہیں پائی تھی

کہ مامی جی دانیال کا پروپوزل لے کر آگئیں۔ میں حیران سے زیادہ پریشان ہوگئی۔ اچھا ہوا بابا نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے احمد سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ کہنا اچھا نہیں لگا بس میں نے اس قدر بتایا تھا۔

''میری ممانی اپنے بیٹے کا پروپوزل لے کر آئی ہیں، پتا نہیں بابا کیا فیصلہ کرتے ہیں۔'' میری بات سن کر وہ کتنی دیر چپ کھڑا جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر پوچھنے لگا۔

''آپ سے پوچھیں گے یا خود ہی فیصلہ کرلیں گے؟''

''پتا نہیں۔'' مجھے واقعی پتا نہیں تھا۔ پھر میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ ''ایسا ہے احمد کہ اگر مجھ سے پوچھا گیا تب بھی میں کوئی جواب نہیں دے سکوں گی۔ میرا مطلب ہے امی اور بابا کی مرضی پر چھوڑ دوں گی۔''

''اس کا مطلب ہے۔ آپ کو ہم سے محبت نہیں ہے۔'' وہ اچانک شاکی ہو گیا اور میری آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

''اگر قسمیں کھا کر اور جان دینے کی باتیں کر کے محبت کا یقین دلایا جاتا ہے تو مجھے معاف کر دیں احمد، میں ایسی باتیں نہیں کر سکتی۔'' میرے آنسو بے اختیار چھلک گئے۔

''کیوں۔؟'' وہ میرے رونے سے پریشان ہوا پھر بھی پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

''اس لیے کہ میں سب سے محبت کرتی ہوں اور کسی ایک محبت کو پانے کے لیے باقی محبتوں کا خون نہیں کر سکتی۔''

''باقی محبتیں۔؟'' وہ سوالیہ نشان بن گیا۔

''ہاں میری محبتوں کا دائرہ بے حد وسیع ہے جو اس میں سما چکا ہے، میں اسے نکال نہیں سکتی۔ اور مزید جو آنا چاہے اس کے لیے راستہ بند کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ البتہ بجز ایک محبت کے ساری محبتوں کا رنگ ایسا جیسا ہے اور وہ جو سب سے الگ اور جدا ہے، وہ آپ کے لیے ہے۔''

''میں اپنی بات کہہ کر رکی نہیں فوراً پلٹی اور سامنے سے جو بس آرہی تھی اس میں سوار ہوگئی۔

میرا خیال تھا۔ میں اپنی الگ والی محبت ہار آئی ہوں جبھی اس رات میں بہت روئی تھی۔ اتنی کہ صبح تک بخار میں جل رہی تھی، امی اور بابا کی پریشانی فطری تھی کیونکہ رات تو میں

اچھی بھلی تھی۔ بابا اسی وقت جا کر ڈاکٹر کو لے آئے۔ اس کے بعد سارا وقت میرے پاس بیٹھے رہے۔ یوں بھی گھر میں کوئی بھی بیمار ہوتا، بابا اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھ جاتے تھے، کھانا دوا سب اپنے ہاتھ سے کھلاتے اور میں ایسی شفیق محبتوں سے نظریں چرا کر بھلا کیونکر خود غرضی کا لبادہ اوڑھ سکتی تھی۔

بہر حال شام تک میرا بخار کافی کم ہو گیا اور اسی وقت احمد کے ابا میاں اور بی بی آ گئیں مجھے نہیں معلوم کیا باتیں ہوئیں اور پھر انہیں کیا جواب دیا گیا۔ البتہ اس کے بعد میں نے گھر میں کچھ کشیدگی محسوس کی۔ کچھ دن تک تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا پھر ایک روز فاطمہ آئی تو میں نے اس سے پوچھا اور اس نے بتایا کہ امی میری شادی دانیال سے کرنا چاہتی ہیں جبکہ بابا کو احمد پسند ہے۔ اور میں کر سکتی تھی سوائے دعاؤں میں اسے مانگنے کے۔ بڑی شدتوں سے مانگا اور اس نے کب مجھے مایوس کیا تھا۔ کبھی نہیں، اب بھی نہیں۔

پھر احمد سے میری بات پکی ہو گئی۔ مامی جی کو منع کر دیا گیا اور اسی روز دانیال میرے پاس چلا آیا۔ بے حد حیران اور یوں جیسے اسے کسی طرح یقین نہ آ رہا ہو کہ اسے ریجیکٹ کیا جا سکتا ہے مجھ سے پوچھنے لگا۔

''کیا کمی ہے مجھ میں۔؟'' فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے جبھی پرسوچ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ تب وہ خود ہی کہنے لگا۔

''میرا خیال ہے، میں احمد سے ہر لحاظ سے بہتر ہوں۔ تمہیں بہت اچھی اور پر آسائش زندگی دے سکتا ہوں پھر۔؟''

''پلیز۔'' میں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''یہ سب قسمت کی باتیں ہیں۔ جو میرے نصیب میں ہوگا، وہ مل کر رہے گا اور اگر نہیں تو سب دعوے جھوٹے ہو جائیں گے۔ یوں بھی مجھے دولت و زر کی تمنا نہیں۔ دو کے بجائے ایک وقت کی روٹی محبت کے ساتھ میسر ہو، اسی پر خوش رہوں گی۔''

''یہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں، حقیقت میں ایک وقت کا فاقہ محبت کی موت ہوتا ہے۔''

میں اس کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے خاموشی سے اس کے پاس سے ہٹ گئی۔

پھر یہ وقت جو پر لگا کر اڑ رہا تھا، بے حد حسین تھا۔ امی کے کہنے پر میں کالج چھوڑ کر کچھ گھر داری سیکھنے میں لگی ہوئی تھی۔ جبکہ فراغت کا سارا وقت اس کے نام تھا۔ اس وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھی دھیرے دھیرے ایک پیار کا نغمہ ہے گنگنا رہی تھی کہ اچانک بڑے بھیا آ گئے۔ میں پلکیں موندے بیٹھی تھی جبھی ان کی آمد کا پتا نہیں چلا۔ اور وہ پتا نہیں کب سے دروازے میں کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو سچ مچ بری طرح سٹپٹا گئی۔

''بڑے بھیا آپ۔ آپ کب آئے۔؟''

''ابھی۔'' وہ ذرا سا مسکرائے پھر میرے پاس آ کر بیٹھے تو کہنے لگے۔ ''تو تم نے بھی یہاں سے جانے کی تیاری کر لی۔''

''کہاں۔''

''وہاں۔'' میرا ''کہاں'' بے دھیانی میں تھا ان کے ''وہاں'' میں قدرے شوخی اور معنی خیزی کہ میں نے جھینپ کر سر جھکا لیا، پھر بڑے، بھیا کچھ دیر تک یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور انہی باتوں کے دوران اچانک کہنے لگے۔

''احمد سے میری دوستی بہت پرانی نہیں ہے البتہ ایک ہی محلے میں رہنے کے باعث دور کی سلام دعا کافی عرصے سے ہے۔ پھر اس نے خود ہی میرے پاس آنا شروع کیا۔ یوں رفتہ رفتہ دوستی ہو گئی۔ بہر حال وہ اچھا لڑکا ہے۔ خاصا ہینڈسم اور اپنی گفتگو سے دوسروں کو متاثر کرنے والا ہے لیکن۔''

بھیا جانے کیوں خاموش ہو گئے انداز ایسا لگا جیسے پتا نہیں مجھ سے کہنا چاہیے یا نہیں جبکہ میرا انداز بظاہر سرسری لیکن درحقیقت پوری جان سے متوجہ تھی۔ اور قدرے توقف سے وہ کہنے لگے۔

''مجھے وہ اچھا خاصا خود پسند اور خود غرض نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ بھی ہو۔ میرا مطلب ہے۔ میں نے سمجھنے میں غلطی کی ہو بہر حال۔''

بھیا میری طرف دیکھ کر قصداً مسکرائے پھر میرا سر ہلا کر بولے۔ ''خوش رہو۔''

اور یہ واہموں، اندیشوں میں گھرنے کے دن نہیں تھے۔ جبھی میں نے بڑے بھیا کی باتیں بس سن لیں اس کے بعد پھر میری اپنی دنیا تھی۔ خوبصورت رنگوں سے سجی ہوئی۔ اور

کسی کو کیا معلوم کہ میں کب سے اس ان جزیروں میں بھٹک رہی تھی۔

''یہاں میں بیٹھوں گی، یہاں وہ۔'' میرے دل کے گھروندے میں محبتوں کے کتنے گلاب کھلے تھے۔ میں نے سب کو اس کی آمد کی نوید دی کہ اوّل روز سے یہ جگہ جس کے لیے مخصوص تھی، وہ آ رہا ہے۔

''وہ۔'' سب ایک دوسرے کو پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنے لگے اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

پھر یہ دن بھی گزر گئے اور میں ساری محبتوں کی ڈھیروں دعائیں لیے احمد کے سنگ بابل کی دہلیز پار کر آئی۔ احمد کی کوئی بہن نہیں تھی ان کی کزنز نے ہی مجھے حجلہ عروسی تک پہنچایا اور ابھی وہ سب لڑکیاں ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں تھیں کہ احمد آ گئے۔ میں نے سمٹتے ہوئے آنچل کی اوٹ سے دیکھا۔ وہ سب احمد کو دیکھتے ہی ایک دم خاموش ہو کر کھسک گئیں۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ یہی تو وقت تھا، وہ احمد کو ستا کر اپنے پرانے بدلے لے سکتی تھیں۔

''سلام علیکم۔'' میرا دھیان لڑکیوں کی طرف تھا احمد کی آواز پر چونک کر انہیں دیکھنے لگی، تو انہوں نے ذرا سا پنجوں پر اونچا ہو کر پوچھا۔

''کیسے لگ رہے ہیں ہم۔؟'' فطری شرم کے باعث میں کچھ کہہ نہیں سکی لیکن میری نظروں نے انہیں ضرور سراہا تھا۔ تب وہ میری کھلی آنکھوں میں دیکھ کر شرارت سے بولے۔

''ہمارا خیال تھا۔ آپ کی آنکھیں کھلوانے میں ہی ہمیں دس گھنٹے لگ جائیں گے لیکن یہاں تو۔''

''میرے خدا۔'' میں نے فوراً پلکیں جھکا لیں تو ہنس پڑے۔

''اوں ہوں۔ اب یہ سب نہیں چلے گا۔''

اس کے ساتھ ہی انہوں نے میرا آنچل کھینچ لیا۔ تبھی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو میں نے دوبارہ خود کو آنچل میں چھپا لیا اور وہ ناگواری سے پوچھنے لگے۔

''کون ہے؟''

''احمد بھائی! یہ دودھ لے لیں۔'' غالباً ان کی کوئی کزن تھی۔

''نان سنس۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے اور دروازہ کھول کر اسی ناگوار لہجے میں

اس سے بولے۔ ''یہ پہلے نہیں رکھا جا سکتا تھا۔؟''

''پتا نہیں۔ بی بی نے۔'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور پلٹ کر میری طرف آئے تو میں کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

''اس میں خفا ہونے والی کیا بات تھی؟''

''ارے آپ نہیں جانتیں ان لڑکیوں کو خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہم نے کبھی انہیں لفٹ نہیں دی۔''

میں یونہی خاموشی سے دیکھے گئی۔ تو میرے سامنے لیٹتے ہوئے کہنے لگے۔

''یہ جو ساری لڑکیاں یہاں نظر آئی ہیں ناں، آج یہ سب انگاروں پہ سوئیں گی، کیونکہ سب ہم سے شادی کے خواب دیکھتی تھیں۔ اور یہ جو ابھی دودھ لے کر آئی تھی، اس کی بڑی بہن تو ایک بار ہماری خاطر زہر کھا چکی ہے۔ کہتی تھی۔ تم نہیں ملے تو جان دے دوں گی۔''

پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ اچانک میرے اندر دور تک سناٹا چھا گیا۔ گزشتہ کئی دنوں بلکہ مہینوں سے میں صرف پا لینے کے احساس میں کتنی سرشار تھی۔ میرے اندر ہمہ وقت رنگوں اور خوشیوں کی برسات اترتی تھی جس میں میں نے پنا پور پور بھگویا تھا اور اب ایک دم سے میں صحرا ہو گئی تھی۔ میری شب زفاف کا آنچل دھیرے دھیرے سرکتا چلا جا رہا تھا اور ان کی داستانیں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ بالآخر میں نے تھک کر پلکیں موند لیں۔ میری محبت کا یہ سب سے الگ اور جدا رنگ اتنا کچا تو نہیں تھا، پھر اس اوّلین رات میں یہ ماند کیوں پڑ رہا تھا۔ نہیں شاید میری آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔



صبح وصال پوچھ رہی ہے عجب سوال
وہ پاس آ گیا کہ بہت دور ہو گیا

میں نے بہت احتیاط سے احمد کو دیکھا۔ وہ اپنی ذات کے سارے دکھ میری جھولی میں ڈال کر گہری نیند سو رہے تھے۔ اور اب ان کے چہرے پر صرف پا لینے اور تسخیر کر لینے کا اطمینان ہی اطمینان تھا۔ کاش میں بھی ان کی طرح احساسِ طمانیت میں گھر کر پلکیں موند سکوں، میں ابھی تو مجھے ان دکھوں کو کہیں نچلی تہوں میں چھپا کر رکھنا ہے، جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔

''اس سے پہلے کہ کوئی آ جائے میں اپنی شب زفاف کے دکھ سمیٹ لوں۔''

میں نے سوچا اور جلدی سے پہلے ادھر ادھر دیکھا پھر دل کے گھروندے میں جھانکا تو جیسے سارے گلاب منتظر تھے۔

''کہاں ہے وہ۔؟''

''وہ۔'' میں نے گھبرا کر سر اونچا کیا تو اس نئی صبح کی پہلی کرن شیشے پر دستک دے رہی تھی۔اور مجھے لگا اس طرف پوری کائنات مسکرا رہی ہو۔تب میرے ہونٹوں کی کلیاں بھی آپ ہی آپ چٹک گئیں بہت آہستگی سے پلنگ سے اتر کر کھڑکی کے پاس آ کر دیکھا۔ برآمدے سے آگے چھوٹا سا گارڈن جس میں مختلف اقسام کے پھول اس بلا کی سردی میں بھی شبنم سے نہائے کھڑے تھے۔ مجھے ان پر ٹوٹ کر پیار آیا اور پھر یوں لگا جیسے سب نے میری طرف بانہیں پھیلا دی ہوں۔ میں نے ذرا سی کھڑکی کھول دی تو سرد ہوا کمرے کے اندر چلی آئی۔

''عائشہ۔!'' احمد جھرجھری لے کر اٹھ گئے۔'' بند کریں کھڑکی۔آپ کو سردی نہیں لگ رہی۔؟''

''نہیں۔'' میں نے یونہی کہہ دیا اور کھڑکی بند کر کے دوبارہ آ کر بیٹھی تو انہوں نے میرے اوپر کمبل ڈال دیا اور میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولے۔

''بہت ظالم ہیں آپ، نیند میں بھی تنگ کرتی ہیں۔'' میں نے چونک کر دیکھا۔وہ آنکھیں بند کر چکے تھے قربت کے احساس سے سرشار ان کے وجیہہ چہرے پر الوہی چمک تھی۔

پھر یہ دن جنہیں اکثریت سنہرے دنوں سے تعبیر کرتی ہے میں انہیں سمجھنے کی کوشش میں لگی رہی۔لیکن ان کی ذات کا کوئی پہلو پوری طرح اجاگر ہو کر نہیں دے رہا تھا۔ پل پل رنگ بدلتے تھے جس سے میں الجھتی چلی جا رہی تھی۔

صبح آفس جاتے ہوئے ان کا انداز ایسا ہوتا جیسے ایک طویل عرصے کے لیے مجھ سے دور جا رہے ہوں اور میرے بنا ان کا کہیں دل نہیں لگے گا اسی حساب سے مجھ سے اظہار کرتے اور الوداع کہتے پھر جاتے جاتے یہ ضرور کہتے۔

''اداس نہیں ہونا۔ہم دوپہر کے کھانے تک آ جائیں گے، ہمارا انتظار کیجئے گا۔''

اور روزانہ دوپہر میں بی بی کہہ کہہ کر تھک جاتیں کہ وہ نہیں آئے گا تم کھانا کھا لو،

لیکن میں ظاہر بھوک نہ ہونے کا بہانا کرتی اور درحقیقت انتظار۔بیزاری اور خفگی بھرا انداز۔ میں اندر ہی اندر پریشان ہوتی۔ان کے آگے پیچھے پھرا کرتی۔کسی وقت تھک کر کسی جگہ بیٹھ جاتی تب فوراً پوچھتے۔

''آپ وہاں کیوں بیٹھی ہیں۔؟''

''یونہی۔'' میرے وجود کی تھکن میرے لہجے میں سمٹ آتی۔

''ہم جانتے ہیں۔آپ ہمارے ساتھ خوش نہیں ہیں۔'' ایسے وقت میں ہمیشہ ایسی کوئی بات کہتے جس سے میں دہل کر رہ جاتی۔

''نہیں۔ میں خوش ہوں۔''

''اچھا۔!'' تاسف سے کہتے۔''ہر وقت تو اداس نظر آتی ہیں۔''

''جیسا چاہو گے ویسی ہی نظر آؤں گی ناں۔''

میں سوچ کر رہ جاتی پھر کتنا بہت سارا وقت گزر گیا، میں دھیرے دھیرے جہاں ان باتوں کی عادی ہو گئی۔ وہاں بہت حد تک انہیں سمجھنے بھی لگی تھی، گویا بڑے بھیا نے ان کے بارے میں ٹھیک قیاس کیا تھا کہ یہ خود پسند اور خود غرض ہیں۔ان ساری باتوں سے ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ میں ہمہ وقت صرف اور صرف ان کی ذات میں کھوئی رہوں اور وہ کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔شاید غلطی میری ہی تھی جو میں نے کبھی انہیں ٹوکا نہیں ہمیشہ خاموشی اختیار کر لی۔ اصل میں میں لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتی۔ مجھے ہمیشہ یہ خوف رہا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور بات بڑھ چکی تھی۔اب جبکہ نئے مہمان کی آمد قریب تھی تو مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے احمد کو غیر معمولی اہمیت دے کر اور ان کی ہر بات پر سر تسلیم خم کر کے غلطی کی ہے۔ مجھے کبھی کبھی ان کی نفی ضرور کرنی چاہیے تھی کیونکہ اب میری توجہ سمیٹنے والا ایک اور فرد آنے والا تھا اور میں یہ سوچ کر پریشان تھی کہ پتا نہیں بچے کے ساتھ میری وابستگی کو احمد کس انداز میں محسوس کریں گے جبکہ میری دوسری وابستگیاں تو انہیں سخت ناگوار گزرتی تھیں۔

امی، بابا کے پاس بیٹھتی یا بہن بھائیوں کے درمیان، ان کا چہرہ مسلسل رنگ بدلتا رہتا اسی طرح بی بی اور ابا میاں کے پاس بیٹھی ہوتی تو فوراً کسی نہ کسی کام سے بلا لیتے۔ حالانکہ میں پہلے ہی انہیں صاف گوئی سے بتا چکی تھی کہ میری محبت کا دائرہ بے حد وسیع ہے جو

اس میں سما چکا ہے۔ میں اسے نکال نہیں سکتی اور مزید جو آنا چاہیے۔ اسے روکنے پر قادر نہیں۔ پھر پتا نہیں کیوں یہ میرا دائرہ تنگ کرنے میں مصروف تھے۔ غالباً یہی ان کی خودغرضی تھی۔ جو یہ چاہتے تھے کہ ان کی محبت کے علاوہ باقی ساری محبتیں دم توڑ جائیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ بھلا۔ میرے دل کی زمین تو بہت نرم تھی، محبتیں خودرو پودوں کی طرح اگتی تھیں۔ میں آبیاری نہ کروں تب بھی۔

اور پھر وہی ہوا۔ مانی کی پیدائش پر میری توجہ بٹ گئی۔ اور احمد یہ برداشت نہیں کر سکے۔ حالانکہ پہلے وہ اپنے چھوٹے موٹے کام حتیٰ کہ کپڑے بھی خود پریس کرتے تھے لیکن اب یہ سارے کام میرے سر ڈال دیئے۔ صبح میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پہلے مانی کی نیپیز، بستر وغیرہ چینج کروں یا احمد کو آفس کی تیاری میں مدد دوں۔

وہ بچے کا رونا بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ مجھ سے یہی کہتے پہلے اسے ٹھیک کر لیں اور پھر آفس جاتے ہوئے یہ بھی ضرور کہتے کہ روزانہ مجھے آپ کی وجہ سے دیر ہو جاتی ہے۔ پھر شام میں آ کر بھی ضرور جتاتے کہ میری وجہ سے آفس میں ان کی ریپوٹیشن خراب ہو رہی ہے۔ پہلے وہ کبھی لیٹ نہیں ہوئے تھے۔ اور میں پتا نہیں کیوں خاموش رہتی تھی۔ ساری باتیں سنتی، پھر سوچتی اور دل مسوس کر رہ جاتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ حالانکہ مجھ سے محبت بھی شدید قسم کی کرتے تھے پھر پتا نہیں کیوں دل توڑنے والی باتیں کرتے۔

اس شام میں اپنے دیور عابد کے ساتھ گارڈن میں کھڑی تھی، وہ مجھے پودوں کی کسی نئی نسل کے بارے میں بتا رہا تھا۔ تبھی احمد آ گئے اور حسب عادت انہوں نے مجھے فوراً پکار لیا۔ میں نے ان کی پکار سن لی تھی لیکن کیونکہ عابد بات کر رہا تھا۔ اس لیے میں اس کی بات ختم ہونے تک کھڑی رہی۔ جبکہ میرا دھیان ان کی طرف تھا۔

''لگتا ہے۔ آپ کو پھولوں سے دلچسپی نہیں ہے۔''

''غالباً میری عدم توجہی کے سبب عابد نے ٹوک دیا تو میں پہلے چونکی پھر یہاں سے وہاں تک پھولوں کو دیکھتے ہوئے میں کھو سی گئی۔ نم گھاس پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھی تو کہنے لگی۔

''تمہیں کیا پتا میں نے کتنے پودے اپنے ہاتھوں سے لگائے تھے۔ تم دلچسپی کی بات کرتے ہو، مجھے ان سے عشق ہے۔ انہیں چھو کر کیسا خوبصورت انوکھا احساس ملتا ہے۔

میرے اندر جستجو انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ میں اس احساس کو پانا چاہتی ہوں کہاں ڈھونڈوں، کہاں ملے گا یا وہ؟''

''ارے بھابی۔!'' وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''آپ تو اتنی خوبصورت باتیں کر لیتی ہیں۔ ویسے کون ہے وہ۔؟''

''وہی جوان پھولوں، کلیوں میں ایک نرم لطیف سا احساس سمو کر۔'' میں اچانک جیسے ہوش میں آ گئی۔ عابد کی شوخ مسکراہٹ جانے کیا کہہ رہی تھی میں سٹپٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بہت بدتمیز ہو تم۔'' وہ ہنسنے لگا اور ایک پھول توڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔

''لیجیے۔ یہ آپ کو سیدھا اس کے پاس لے جائے گا۔'' وہ شرارت سے باز نہیں آ رہا تھا۔ میں روٹھ کر چلی آئی اور وہ پیچھے بھاگا آیا احمد ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میں بھی وہیں بیٹھ گئی۔ عابد پھول میری گود میں پھینک کر بولا۔

''یہ تو لے لیں۔''

''شٹ اپ عابد سننے دو۔'' احمد نے اسے ٹوک کر اسکرین پر نظریں جما دیں۔ تب میں بھی ادھر متوجہ ہوئی۔ نیرہ نور اپنی سریلی آواز کا جادو جگا رہی تھیں۔

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں، ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے

''بھابی! جذبہ دل شرط ہے۔'' عابد شرارت سے کہتا ہوا چلا گیا اور میرے اندر ایک بار پھر جستجو انگڑائیاں لینے لگی۔

اے رہبرِ کامل چلنے کو تیار تو ہوں پر یاد رہے
اس وقت مجھے بھٹکا دینا جب سامنے منزل آ جائے

''اف! یہ بہزاد لکھنوی کس قدر شدت پسند ہیں۔'' میں سوچتی ہوئی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

پھر رات میں مانی اچانک رونے لگا۔ پتا نہیں کیا تکلیف تھی نہ دودھ پی رہا تھا نہ ٹہلانے سے چپ ہوا۔ احمد بھی سوتے سے اٹھ گئے تو میں نے یونہی کہہ دیا۔

''یہ چپ نہیں ہو رہا۔''

''ہم کیا کریں۔'' ایسا ندھوٹھا انداز کہ میں حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ تبھی بی بی آ گئیں

اور پوچھنے لگیں۔

''کیا ہوا ہے بچے کو۔؟'' اور مجھ سے پہلے احمد بول پڑے۔

''انہیں کیا پتا۔ انہیں اپنی عیاشیوں سے فرصت ملے تب نا بچے کی خبر ہو۔''

کس قدر غلط لفظ استعمال کیا تھا انہوں نے، میں ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ اور پتا نہیں بی بی نے سنا نہیں یا مانی کی وجہ سے نظر انداز کر گئیں۔ اسے ہر جگہ سے چھو کر دیکھا پھر مجھ سے کہنے لگیں۔

''جاؤ۔ ذرا سا تیل گرم کر لاؤ۔''

میں ایسے ہی عالم میں اٹھ کر کچن میں آئی اور ایک کٹوری میں تیل گرم کر کے لے آئی۔ پھر اسی طرح چپ چاپ کھڑی بی بی کو مانی کی مالش کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک مانی روتا رہا پھر سکون سے ہو گیا۔

''پیٹ تو اس کا ٹھیک ہے، لگتا ہے ٹھنڈ لگ گئی ہے۔''

بی بی اپنے آپ بولتی بھی جا رہی تھیں۔ پھر انہوں نے اچھی طرح بچے کو پہلے گرم کپڑے میں لپیٹا پھر کمبل میں، اس کے اوپر لحاف بھی اوڑھا دیا۔ پھر جاتے جاتے کہنے لگیں۔

''اب خیال رکھنا۔ ٹھنڈا دودھ بالکل نہیں دینا۔'' میں ایسے ہی گم صم کھڑی تھی۔ ان کی بات پر ذرا سا سر ہلایا پھر مانی کے پاس لیٹ گئی۔ کافی رات بیت گئی تھی پھر بھی مجھے نیند نہیں آئی۔ میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا لیکن میں جانتی تھی۔ احمد انتہائی معصوم بن کر سبب پوچھیں گے اور پھر وہی بات۔

''ہم جانتے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ خوش نہیں ہیں۔'' اور اس ایک شخص کو خوش اور راضی رکھنے کی خاطر میں کتنوں کو ناراض کر رہی ہوں۔ پھر بھی یہ راضی نہیں ہوتا۔ شاید یہ کبھی راضی نہیں ہوگا۔ میں اس کے لیے اپنی ہستی کو مٹا ڈالوں تب بھی نہیں۔ اس لیے کہ یہ مجازی خدا ہے اگر مجازی نے راضی ہونا سیکھا ہوتا تو سجدہ واجب نہ ہو جاتا اور اس مقام پر آ کر میرے سوچنے کا انداز ہی بدل گیا۔ کیسی بے نیازی عطا ہوئی تھی مجھے میرے دل کے دریچوں میں ننھے منے چراغ جل اٹھے۔ جیسے مدتوں بعد میری واپسی ہوئی ہو۔ ایک خوشی کا سماں تھا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر میں خاصی مگن سی تھی بی بی نے بیٹھتے ہی مانی کی طبیعت کا پوچھا تو میں انہیں جواب دے کر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ جبکہ احمد ناشتا کر لینے کے بعد چائے پیتے تھے۔ انتظار میں بیٹھے رہے کہ میں انڈا اور پراٹھا اٹھا کر ان کے سامنے رکھوں گی اور مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ اطمینان سے ناشتا کر کے جب ان سے چائے کے لیے پوچھا تو چبھتے ہوئے لہجے میں بولے۔

''آپ کو پتا نہیں ہے، پہلے ہم ناشتا کرتے ہیں۔''

''تو کیا آپ نے ناشتا نہیں کیا۔؟'' میں حیران ہوئی۔

''آپ کو خود کھانے سے فرصت ہو تب تو۔''

''مجھے فرصت نہیں ہے۔'' میں فوراً بول پڑی۔ اور وہاں سے اٹھ کر آ گئی۔ مانی بے خبر سو رہا تھا میں اس کی طرف سے اطمینان کر کے اس کے رات کے گیلے کپڑے سمیٹ رہی تھی کہ احمد آ گئے میں سمجھ گئی۔ غصے میں ناشتا چھوڑ آئے میں پھر بھی اپنے کام میں لگی رہی۔

''آپ کو تو فرصت ہے نہیں، ہم جا رہے ہیں۔''

روٹھے لہجے میں کہہ کر چلے گئے اور مجھے پتا نہیں کیوں ہنسی آ گئی۔

انہی دنوں بڑے بھیا کی شادی طے پا گئی۔ غالباً احمد کا خیال تھا میں مہمانوں کی طرح شرکت کروں گی جبھی مجھے بیگ تیار کرتے دیکھ کر حیران ہوئے پھر انجان بن کر پوچھنے لگے۔

''یہ بیگ میں کیا رکھ رہی ہیں۔'' میں نے اس فضول قسم کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اطمینان سے بیگ بند کر کے کھڑی ہوئی تب کہا۔

''آپ کو پتا ہے بڑے بھیا کی شادی ہے پھر۔''

''پھر۔؟''

''پھر یہ کہ چلیں۔ صبح بھی نوید بلانے آیا تھا۔''

''اتنی جلدی ابھی تو پورا ایک ہفتہ باقی ہے اور ہم اتنے دن آفس چھوڑ کر تو نہیں بیٹھ سکتے۔''

''ہم آپ کو آفس چھوڑ کر بیٹھنے کے لیے نہیں کہہ رہے۔'' میں انہی کے انداز میں شروع ہو گئی۔

’’آپ بس ہمیں چھوڑ آئیں۔‘‘

’’تو اتنے دن آپ وہاں رہیں گی؟‘‘ خواہ مخواہ کی بحث میں جھنجھلا گئی۔

’’کیا چاہتے ہیں آپ، نہیں جاؤں؟‘‘

’’ہم جانے سے منع نہیں کر رہے لیکن۔‘‘

میں ان کی بات پوری ہونے سے پہلے کمرے سے نکل آئی۔ اور ابھی آ کر بی بی کے پاس کھڑی ہوئی تھی کہ وہ بیگ اٹھائے پیچھے چلے آئے اور بی بی سے کہنے لگے۔

’’بی بی! ہم عائشہ کو چھوڑنے جا رہے ہیں۔ یہ تو وہیں رہیں گی لیکن ہم واپس آ جائیں گے۔‘‘

پھر مجھ سے چلنے کے لیے کہا تو میں بی بی کی گود میں مانی کو لے کر چل پڑی۔

امی کے گھر میں ابھی مہمان وغیرہ تو نہیں آئے تھے لیکن چچیرے ممیرے بھائیوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا اور ظاہر ہے دانیال بھی تھا۔ پھر اتفاق سے جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوئی پہلے سامنا اسی سے ہو گیا۔ اور اب تک تو میں احمد کی وجہ سے سب کو نظر انداز کر رہی تھی لیکن اب میرے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ کیونکہ احمد کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی حال میں خوش رہنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ بہر حال اس وقت دانیال سے بات کرنے میں پہل میں نے ہی کی۔

’’ارے دانیال بھائی کیسے ہیں آپ، مامی جی کیسی ہیں۔؟‘‘

’’بالکل ٹھیک۔ تم تو جب سے شادی ہوئی ہے نظر ہی نہیں آئیں۔‘‘

’’کیا کروں، احمد نظروں سے اوجھل ہی نہیں ہونے دیتے۔‘‘

میں نے احمد کو دیکھتے ہوئے کہا اور ہنستی ہوئی اندر چلی آئی۔

پھر بڑے بھیا کی شادی میں خوب رونق رہی۔ میں نے بہت انجوائے کیا اور میں چاہتی تھی احمد بھی سب کے ساتھ مل کر بیٹھیں لیکن جہاں محفل جمتی وہ اٹھ کر چل دیتے۔ مجھے افسوس ہوتا۔ آخر وہ الگ تھلگ کیوں رہنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کا یہ رویہ میرے میکے کی وجہ تک ہوتا تب تو بات سمجھ میں آئی تھی لیکن وہ اپنے گھر میں بھی ایسے ہی رہتے تھے بہر حال اب میں بے نیاز ہو چکی تھی۔ ان کا چہرہ خواہ کتنے رنگ بدلتا، میں قصداً نظریں چرا جاتی۔

پھر ولیمے سے فارغ ہوتے ہی میں گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اپنا بیگ تیار کر کے احمد کو تلاش کرتی ہوئی آئی، وہ بابا کے پاس بیٹھے تھے میں نے چلنے کے لیے کہا تو بڑے

آرام سے کہنے لگے۔

’’ابھی اب یہیں رہیں، کیونکہ یہاں آپ خوش رہتی ہیں۔‘‘ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔ بابا نے چونک کر مجھے دیکھا پھر مسکرا کر بولے۔

’’میری عائشہ، ہر حال میں نہ صرف خوش رہتی ہے بلکہ سب کو خوش رکھنا بھی چاہتی ہے۔ کیوں بیٹا۔؟‘‘

’’جی۔!‘‘ میں اسی قدر کہہ سکی۔

’’لیکن ہمارے ساتھ تو خوش نہیں رہتی۔‘‘

’’یہ تمہارا وہم ہے احمد! عائشہ نے کبھی تمہاری شکایت نہیں کی۔‘‘

بابا میری صفائی میں اور بھی کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن میں وہاں سے چلی آئی۔

بظاہر یہ عام سی باتیں کیسے دل کی کشتی کو بیچ بھنور میں لا چھوڑتی ہیں۔ میں چپ چاپ آ کر برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔ سامنے آنگن اور اس سے میرے نظریں بھٹکتی ہوئی سیاہ آسمان پر جگمگاتے ستاروں میں الجھنے لگیں۔ کیسی بھول بھلیاں تھیں میں اپنا راستہ تلاش کرنے میں لگ گئی۔ تبھی احمد نے آ کر چونکا دیا۔

’’یہاں کیوں کھڑی ہیں۔؟‘‘ میری سمجھ میں نہیں آیا جواب دوں بس انہیں دیکھ کر رہ گئی تب کہنے لگے۔

’’اگر گھر چلنا چاہیں تو چلیں۔‘‘

’’نہیں، ابھی میں کچھ دن اور خوش رہنا چاہتی ہوں۔‘‘

میں کہتی ہوئی اندر مانی کے پاس آ گئی اور غالباً وہ وہیں سے چلے گئے۔ لیکن انہیں میرا مزید کچھ دن خوش رہنا منظور نہیں تھا۔ جبھی اگلے دن صبح ہی صبح عابد کو بھیج دیا۔ میں نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ یوں بھی شادی کا گھر تھا اور آج سب نے اطمینان سے ہی اٹھنا تھا۔ لیکن عابد کے آنے سے میرے ساتھ ساتھ امی اور بابا بھی اٹھ گئے۔ پھر امی نے چاہا کہ جلدی سے ناشتا بنا لیں لیکن میں نے منع کر دیا۔ اور مانی کو اٹھا کر عابد کے ساتھ چلی آئی۔

گھر آئی تو بی بی دیکھتے ہی حیران ہو کر بولیں۔

’’ہائیں! رات احمد تو بتا رہا تھا تم ابھی وہیں رہو گی۔‘‘

میں کچھ نہیں بولی۔ مانی کو ان کی گود میں دے کر عابد کے ہاتھ سے بیگ لیا اور

اپنے کمرے میں آ گئی۔ چھٹی کا دن ہونے کے باعث احمد اطمینان سے بستر میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ میں کچھ دیر کھڑی یونہی ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر بیگ میں سے کپڑے نکال کر الماری میں رکھنے لگی۔

''ہم نے جان بوجھ کر آپ کو بلا لیا۔'' احمد نے کہا تو میں الماری بند کر کے ان کی طرف گھوم گئی تب وہ اپنی کزن کا نام لیتے ہوئے کہنے لگے۔

''اصل میں کل ثمینہ آئی تھی اور بی بی سے اسے معلوم بھی ہو گیا کہ آپ یہاں نہیں ہیں پھر بھی ہمارے کمرے میں گھسی چلی آئی۔ خواہ مخواہ فری ہو رہی تھی۔ عجیب پاگل لڑکی ہے۔ کہہ رہی تھی میں ابھی بھی تمہاری خاطر دنیا چھوڑ سکتی ہوں۔''

''اچھا۔!'' میں یونہی ذرا سا ہنسی۔

''ہاں، بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ ہمیں ڈر تھا کہیں آج پھر نہ آ جائے۔ اس لیے ہم نے آپ کو بلا لیا۔''

''ارے، لوگ تو ایسے موقعوں پر بیوی کے نہ آنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اور آپ۔'' میں نے شرارت سے چھیڑا۔ اور انہوں نے غالباً مجھے جلانے اور طیش دلانے کے لیے یہ بات کی تھی، اس کے برعکس میرے انداز پر بری طرح جھنجلا کر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ عابد مانی کو لے کر آ گیا۔

''لیجئے بھابی! یہ تنگ کر رہا ہے۔'' میں نے بڑھ کر مانی کو لے لیا۔

''بڑے بھائی! اخبار لے لوں؟'' عابد نے پوچھا تو انہوں نے اخبار سمیٹ کر اسے تھما دیا۔ اور وہ جانے لگا تو میں نے اچانک پکار لیا۔

''سنو عابد۔!''

''جی۔!'' وہ رک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو میں نے شرارت سے کہا۔

''بھائی!'' وہ رک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو میں نے شرارت سے کہا۔

''بھائی! اب تم بھی بڑے ہو گئے ہو۔ کل ثمینہ آئی تھی۔ تم ہی اسے لفٹ کرا دیتے۔''

''کب۔ کب آئی تھی۔؟'' وہ حیران ہوا تو احمد فوراً بات بدلتے ہوئے کہنے لگے۔

''دیکھنا عابد! ٹی وی لاؤنج میں ہمارا بریف کیس تو نہیں ہے۔'' عابد نے مجھے دیکھ کر کندھے اچکائے یعنی ثمینہ کی آمد سے لاعلمی کا اظہار کیا پھر کمرے سے نکل کر گیا تو کچھ دیر

بعد وہیں سے پکار کر بولا۔

''بریف کیس یہاں نہیں ہے۔'' میں بظاہر لاتعلق لیکن کن انکھیوں سے احمد کو دیکھتی رہی خاصے چور سے بنے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا آخر انہیں یہ جھوٹا واقعہ گھڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ پتا نہیں کیا جتانا چاہتے تھے مجھ پر۔

پھر ہر روز وہ ایسی ہی باتیں لے کر بیٹھ جاتے انہیں ہر وہ لڑکی یاد آتی جو ان سے شادی کی خواہش مند تھی۔ اور ان کی خاطر سب کو چھوڑنے پر تیار۔ میں بہت خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہتی۔

اور پھر ایک روز آپ ہی آپ میری سمجھ میں آ گیا کہ ان ساری باتوں کے پیچھے ان کی کون سی خواہش بولتی ہے۔ یعنی وہی خودغرضانہ سی سوچ کہ میں سب سے ناتا توڑ کر صرف ان کی ہو رہوں۔ اور میں تو یوں بھی ان کی ہو چکی تھی باقی سارے رشتے ناتے اپنی جگہ تھے لیکن جیسا کہ احمد چاہتے تھے کہ میں دل سے ساری محبتیں اور تعلق مٹا ڈالوں تو یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ ابھی تو میری جستجو کے سفر میں کتنی محبتیں منتظر کھڑی تھیں۔ مجھے ان سب سے آگاہی حاصل کرنی تھی۔ کتنے درد کے موتی چننے تھے تب ہی تو اس تک رسائی ممکن تھی۔ پتا نہیں کہاں ہے وہ۔



احمد کی ٹرانسفر لاہور ہو گئی۔ اور میں ان دنوں پھر امید سے تھی۔ بی بی کا کہنا تھا کہ مجھے ڈیلیوری کے بعد جانا چاہیے اور خود مجھے بھی یہی مناسب لگ رہا تھا لیکن احمد ساتھ لے جانے پر بضد تھے۔ بہر حال میں نے خود سے کچھ نہیں کہا کیونکہ میں دونوں میں سے کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور دونوں ماں بیٹے میں مسلسل تکرار جاری تھی۔ پھر ابا میاں بھی بی بی کے ساتھ مل گئے یوں احمد کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جاتے ہوئے بہت بگڑے بگڑے سے تھے۔ مجھ سے بھی ٹھیک طرح سے بات نہیں کی۔ حالانکہ لاہور اتنا دور نہیں تھا۔ ہر ویک اینڈ پر آ سکتے تھے۔ لیکن ویک اینڈ کیا مہینہ پھر دو مہینے ہو گئے۔ فون تک نہیں کیا۔ میں کسی وقت پریشان ہوتی تو بی بی ٹوکتیں بلکہ پیار بھری ڈانٹ بھی پلاتیں۔

''کتنے دن ناراض رہے گا۔ دیکھنا ایک دن خود ہی بھاگا چلا آئے گا اب ایسی حالت میں میں تمہیں اس کے ساتھ بھیج دیتی بتاؤ بھلا۔''

بی بی کی بات بھی ٹھیک تھی لیکن احمد کی طویل ناراضگی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

پھر جیسے تیسے دو مہینے اور گزر گئے۔ بابا کی پیدائش پر عابد نے ہاسپٹل سے ہی احمد کو فون کیا اور انہوں نے اسی وقت آنے کو کہا تو لیکن آئے نہیں۔ میں تین دن ہاسپٹل میں ان کی راہ دیکھتی رہی پھر گھر آ کر بی بی کے سر ہو گئی۔

"بی بی! مجھے عجیب سے خیال آنے لگے ہیں۔ بس آپ احمد کو بلائیں۔"

"بیٹا! تم اپنے گھر میں بیٹھی ہو۔ تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" بی بی مجھے سمجھانے لگیں تو میں نے عاجزی سے کہا۔

"مجھے پریشانی احمد کی طرف سے ہے بی بی! میں تو ٹھیک ہوں۔ بس آپ عابد کو بھیجیں۔"

"ٹھیک ہے، میں عابد کو بھیجتی ہوں لیکن تم سن لو، اگر وہ خواہ مخواہ کی ضد لے کر بیٹھا ہوگا تو میں تمہیں نہیں جانے دوں گی، خود ہی آ کر لے جائے۔"

بی بی نے عابد کو بھیجنے کی ہامی بھر لی ساتھ ہی مجھے خبردار کرتے ہوئے ایک طرح سے پابند کر دیا۔

پھر اسی شام عابد لاہور چلا گیا۔ مجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ جاتے ہی فون کرے گا۔ اس لیے میں رات دیر تک اس کے فون کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ لیکن پتا نہیں وہ بھول گیا تھا یا کیا تھا۔ میں نے دو دن بڑی مشکل سے گزارے۔ اور وہ آیا تو کوئی احساس ہی نہیں تھا۔

"ٹھیک ہیں احمد بھائی بلکہ بہت مزے میں ہیں۔" میرے بے قراری سے پوچھنے پر اس نے یہی جواب دیا۔

"آیا کیوں نہیں؟" بی بی نے تڑخ کر پوچھا۔

"مجھے کیا پتا۔ کہہ رہے تھے۔ بی بی کو بہت شوق تھا۔ بہو کو اپنے پاس رکھنے کا، تو اب رکھیں اپنے پاس ہی۔"

"ہائیں۔!" بی بی پہلے آنکھیں پھاڑے عابد کو گھورتی رہیں پھر ساری بھڑاس احمد پر نکالی۔

"پاگل ہو گیا ہے کیا وہ، ایسا نادان ناسمجھ بچہ تو نہیں ہے دیکھ نہیں رہا تھا عائشہ کی

حالت۔ اس کے ساتھ بھیج دیتی تو وہاں کون اس کی دیکھ بھال کرتا۔ تم آرام سے بیٹھی ہو عائشہ! دیکھتی ہوں کب تک نہیں آتا۔"

"بس کریں بی بی! خواہ مخواہ اتنا شور مچا رہی ہیں۔"

عابد نے انہیں ٹوکا، ساتھ ہی مجھے اندر جانے کا اشارا کیا تو میں سست روی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اچانک ایک بے نام سی اداسی میرے اندر گھر کر گئی تھی۔ اگر احمد سے میری لڑائی ہوئی ہوتی تب تو کوئی بات بھی تھی یوں بنا کسی بات کے ضد میں آنا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر اگر مجھ سے خفا تھے تو بچے کے لیے تو آتے۔

رات میں عابد، مانی سے کھیلنے کے بہانے میرے کمرے میں آ بیٹھا۔ غالباً اس نے میری غیر معمولی خاموشی محسوس کر لی تھی۔ جب ہی مانی کے ساتھ شرارتیں کر کے مجھے بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور میں بس کچھ دیر کو ان کی طرف متوجہ ہوتی پھر اپنی سوچوں میں گم ہو جاتی پھر مانی تھک گیا تو وہ اسے تکیے پر لٹا کر تھپکنے لگا۔ میں یونہی بے دھیانی سے اسے دیکھنے لگی تو جانے کیوں وہ سٹپٹا گیا۔ پھر قصداً ہنس کر بولا۔

"آپ عورتیں بہت وہمی ہوتی ہیں بھابی!"

"وہم یونہی تو نہیں ہوتا عابد! سچ بتاؤ۔ احمد کیسے ہیں۔؟"

"یقین کریں، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ اور میں اصل بات بتاؤں وہ آپ کے لیے ایک خوبصورت سا گھر بنا رہے ہیں۔ حالانکہ ابھی انہوں نے آپ کو بتانے سے منع کیا تھا کیونکہ وہ آپ کو سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔ بہر حال اس مصروفیت کے باعث وہ آ نہیں پا رہے۔ ویسے اب کچھ دنوں کی بات ہے آ جائیں گے۔"

عابد نے ان کی مصروفیت کا بتاتے ہوئے مجھے تسلی بھی دی۔

"سچ کہہ رہے ہو۔؟" میں یقین کر بھی رہی تھی نہیں بھی۔

"بالکل سچ۔"

"لیکن شام میں تو تم بی بی سے کچھ اور کہہ رہے تھے؟۔"

"وہ تو میں نے انہیں یونہی چھیڑا تھا۔ ورنہ آپ ہی بتایئے احمد بھائی آپ کے بغیر رہنے والے ہیں۔ یہاں گھر میں دو گھڑی ہم لوگوں کے پاس تو بیٹھنے نہیں دیتے آپ کو فوراً

انہیں کوئی اپنا کام یاد آ جاتا ہے۔''

وہ شوخ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولا تو میں قدرے جھینپ کر نظروں کا زاویہ بدل گئی۔

''فون بھی تو نہیں کرتے؟۔''

''ہاں، میں نے کہا تھا ان سے کہنے لگے، عائشہ کی آواز سن کر رہ نہیں سکوں گا، جبکہ میں چاہتا ہوں، گھر بنا کر ہی اس کے پاس جاؤں۔'' اسے نے بتایا پھر شرارت سے پوچھنے لگا۔''سچ بتائیں آپ بھی ان سے اتنی ہی محبت کرتی ہیں۔''

''نہیں۔'' میں لاکھ نہیں کہوں لیکن میری آنکھیں تو سچ بول رہی تھیں جب ہی وہ ہنس پڑا۔ پھر جمائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے اچانک جانے کس خیال کے تحت پلٹ کر پوچھنے لگا۔

''سنا ہے۔ محبت کے راستے میں بڑے امتحان آتے ہیں اگر آپ کو کسی امتحان کا سامنا ہو تو کیا کریں گی؟۔''

''پتا نہیں۔'' میں نے کہا تو وہ کچھ دیر تک مجھ پر نظریں جمائے کھڑا رہا پھر شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔

پھر یونہی دن گزرتے چلے گئے۔ میں اگر خوش نہیں تھی تو ناخوش بھی نہیں تھی۔ البتہ بی بی کسی وقت بیٹھے بیٹھے احمد کو برا بھلا کہنے لگتی تھیں پھر عابد سے کہتیں، جا کر اس کی خیر خبر لے آؤ۔ اور عابد ان دنوں نیا نیا جاب سے لگا تھا اس لیے وہ بس آج کل پر ٹال دیتا۔

بہر حال پورے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ اس وقت میں انہی مہینوں کو شمار کر رہی تھی کہ نوید آ گیا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ بابا بلا رہے ہیں۔ اور میں بی بی سے کہہ کر اسی وقت اس کے ساتھ چلی آئی۔ حالانکہ دونوں گھروں میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا لیکن میں چھوٹے بچے کی وجہ سے ذرا کم ہی نکلتی تھی۔ ادھر مہینے بھر سے بالکل ہی جانا نہیں ہوا تھا اور میرا خیال تھا امی، بابا نے یونہی ملنے کے لیے بلوایا ہے۔ اور پہلے انہوں نے یہی کہا کہ بہت دنوں سے تم نہیں آئیں، میری اور بچوں کی خیریت پوچھتے رہے۔ پھر احمد کے بارے میں پوچھا تو میں یہی کہہ سکی۔

''کچھ مصروفیت میں گھرے ہوئے ہیں جب ہی نہیں آ سکے۔'' میرے جواب پر بابا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر کہنے لگے۔

''مصروفیات تو ہوتی ہی ہیں بیٹا لیکن بندہ یوں بیوی بچوں سے لاپروا تو نہیں ہو جاتا۔ تمہارے ساس، سسر کیا کہتے ہیں؟۔''

''ان کا کہنا ہے، خود ہی آئیں گے۔'' میں خواہ مخواہ چور سی بن رہی تھی۔

خود ہی آئے گا۔ کیا مطلب، کیا تمہاری اس سے لڑائی ہوئی تھی یا گھر میں کوئی اور بات ہوئی۔؟'' بابا نے تشویش سے پوچھا تو میں نے صاف گوئی سے بتا دیا۔

''نہیں بابا! میری تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اصل میں وہ اس وقت مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن بی بی اور ابا میاں نے نہیں جانے دیا۔ کہ وہاں میری دیکھ بھال کون کرے گا۔''

''صحیح بات ہے اور یہ تو احمد کو خود بھی سوچنا چاہیے تھا۔ اس میں ناراضگی کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

بابا نے کہا تو میں نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور قدرے توقف کے بعد وہ کہنے لگے۔

''بہر حال بیٹا! میرا مشورہ یہ ہے کہ تم فوراً لاہور چلی جاؤ۔ مرد کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ اسے یوں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اور میں تم سے کیا کہوں بیٹا! بس اپنے دل اور ظرف کو بڑا کر لو۔ زندگی میں امتحان تو آتے ہی ہیں۔ واویلا کرنے کے بجائے صبر کا دامن تھام لینا چاہیے۔''

یہ بابا کہہ رہے تھے میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔

''انسان تو خطا کا پتلا ہے اور اکثر غلطی کرتے ہوئے بھول جاتا ہے کہ خود سے وابستہ کتنی ہستیوں کا اعتماد ریزہ ریزہ کر رہا ہے۔ لیکن تم سے مجھے امید ہے کہ احمد کی غلطی کو معاف کر دو گی۔''

''کیسی غلطی بابا۔؟'' میں سناٹوں میں گھر گئی تھی۔ کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا تو انہوں نے میرا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

''یہی کہ اس نے تم سے لاپروائی برتی۔''

مجھے لگا بابا کچھ چھپا رہے ہیں۔ الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھے گئی تب انہوں نے میری پیشانی چوم لی اور اپنے خصوص انداز میں میرا گال تھپک کر کہنے لگے۔

''اب بھی کسی کسی وقت تم مجھے وہی چھوٹی سی بچی نظر آتی ہو، جو ایک کونے میں مٹی کا گھروندا بنا کر کھیلا کرتی تھی۔''

پھر جیسے ان کی آنکھوں میں وہی منظر آسمایا اور میں خود کو بہت واضح دیکھ رہی تھی۔ بڑی پیاری مشفق مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے۔

''مجھے یاد ہے۔ ایک بار تم اپنے گھروندے میں بہت سارے پھول لگا رہی تھیں۔ یہ امی، یہ بابا کا، یہ بڑے بھیا، یہ فاطمہ کا، سب کے نام کے پودے لگائے تھے۔ اپنی سہیلیوں اور ٹیچرز کے لیے بھی۔ تب میں نے جانا، میری عائشہ سب سے کتنا پیار کرتی ہے۔ فاطمہ اور نوید اکثر تمہارے ساتھ زیادتی کر جاتے تھے پھر بھی تمہاری محبت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ نہ میں نے تمہیں کبھی کسی سے خفا ہوتے دیکھا۔ تمہاری امی کہتی تھیں۔ عائشہ ڈرپوک ہے۔ کیا واقعی تم ڈرپوک ہو؟۔''

میں نے ذرا سا ہنس کر سر جھکا لیا۔ گویا اعتراف تھا اور وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے

''نہیں تم ڈرپوک نہیں ہو بلکہ میری نظر میں سب سے بہادر ہو، اس لیے کہ تم معاف کر دیتی ہو۔ اور معاف کرنے والا ڈرپوک نہیں بہادر ہوتا ہے۔''

قدرے توقف کے بعد موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگے۔

''ہفتے بھر سے فاطمہ یہاں تھی۔ کل ہی تو گئی ہے ایک تو مجھے اس لڑکی کا پتا نہیں چلتا۔ ذرا ذرا سی بات کو مسئلہ بنا لیتی ہے۔ اسے سوچنا چاہیے اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری ناتواں جان پریشانیوں کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں ہے۔ پھر میں اب سلطانہ اور پروین کی فکر کروں یا اسے دیکھوں۔''

فکر مندی سے بات کرتے ہوئے بابا اچانک کتنے بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ مجھے ان پر ڈھیروں رحم آیا۔ اور میرا نرم دل دکھنے لگا۔ تب ہی سلطانہ نے آکر کھانے کے لیے

کہا تو بابا مجھ سے بولے۔

''جاؤ بیٹا! کھانا کھالو۔''

''آپ بھی چلیں، ناں بابا۔''

''بس بیٹا! اپنی امی سے کہو۔ مجھے یہیں دے دیں گی۔''

وہ تکیے کے سہارے آرام دہ حالت میں بیٹھتے ہوئے بولے تو میں سلطانہ کے ساتھ باہر آگئی۔

پھر شام میں جب میں گھر آ رہی تھی تب بھی بابا نے مجھے بہت تاکید سے لاہور جانے کے لیے کہا۔ تو میں کچھ ٹھٹھک سی گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا آخر بابا اتنے اصرار سے کیوں کہہ رہے ہیں۔ بہرحال گھر آ کر میں عابد کے سر ہو گئی کہ وہ مجھے لاہور لے جائے لیکن اس کے پاس وہی جاب کا بہانا تھا۔ رات دیر تک میں اس سے الجھتی رہی۔ وہ کسی طرح مان کے نہیں دیا۔ تب اگلے روز میں نے ابا میاں سے کہا اور غالباً وہ خود بھی یہی سوچ رہے تھے جب ہی اسی وقت تیار ہو گئے۔ میں نے جلدی سے ایک سوٹ کیس میں اپنے اور بچوں کے کپڑے اور دوسری ضروری اشیاء رکھ کر تیاری کر لی۔ لیکن جب بی بی نے سنا تو خفا ہونے لگیں۔ ان کا کہنا تھا، پہلے ابا میاں اکیلے ہی جائیں یا پھر احمد کو اطلاع دے دیں کہ ابا میاں مجھے لے کر آ رہے ہیں لیکن اس وقت ابا میاں بھی جانے کس موڈ میں تھے بی بی کی بات نہیں مانی اور مجھے اور بچوں کو لے کر چل پڑے۔



شادابیوں کے دور کا انجام یہ ہوا
اب کے تو بوند بوند کو دریا ترس گئے
اب خاک اڑ رہی ہے گلابوں کے شہر میں
وہ لو چلی ہے اب کے پتھر جھلس گئے

جس وقت ہم لاہور پہنچے سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ میرا خیال تھا اس وقت احمد آفس میں ہوں گے اور ہمیں تھوڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن گھر کا گیٹ کھلا دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ جب تک ابا میاں ٹیکسی سے سوٹ کیس اترواتے اور اسے فارغ کرتے میں

اندر چلی آئی۔ سامنے خوبصورت لان اس کے بعد برآمدہ میں اطمینان سے چلتی ہوئی پہلے دروازے سے داخل ہوئی تو دوسرے قدم پر ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔ میرے سامنے احمد تھے اور احمد کے ساتھ پتا نہیں کون تھی۔

''سنا ہے محبت کے راستے میں بڑے امتحان آتے ہیں اگر آپ کو کسی امتحان کا سامنا ہوا تو کیا کریں گی؟'' گویا عابد جانتا تھا اور شاید بابا کو بھی معلوم ہو گیا تھا جب ہی تو کہہ رہے تھے۔

''زندگی میں امتحان تو آتے ہی ہیں۔ بجائے واویلا کرنے کے صبر کا دامن تھام لینا چاہیے۔''

''عائشہ!'' احمد مجھے دیکھ کر سٹپٹا کر کھڑے ہو گئے۔ اور اس لڑکی نے پہلے چونک کر دیکھا پھر پوچھنے لگی۔

''کون ہے یہ؟''

''یہ۔'' احمد کو کوئی جواب نہیں سوجھا۔ تب ہی ابا میاں آ گئے، خاصا پر جوش انداز تھا ان کا اور غالباً احمد سے بغل گیر ہونا چاہتے تھے لیکن ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر میرے پاس ہی رک گئے۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں مخاطب کر کے بولے۔

''میں تمہارے بال بچوں کو لے آیا ہوں احمد۔ مانی اب تمہارے بغیر نہیں رہتا تھا۔''

''احمد۔!'' اس لڑکی کو یقیناً شاک لگا تھا۔ بے حد تاسف اور ملامت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔

''تم نے تو کہا تھا کہ تم غیر شادی شدہ ہو پھر یہ۔ او مائی گاڈ تم ایسے لگتے تو نہیں ہو۔ اتنا فریب کیا کمی ہے تمہاری بیوی میں اور ان معصوم بچوں کا کیا قصور ہے جو تم انہیں چھوڑ کر۔''

احمد نے اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا تب وہ میرے پاس چلی آئی۔

''سنبھالو اپنے میاں کو اور لگام ڈال کر رکھو۔ ویسے حیرت ہے تمہیں دیکھ کر تو اچھے اچھوں کے ایمان ڈول جاتے ہوں گے اور یہ۔''

وہ پلٹ کر احمد پر ہنسی پھر پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔ تو ابا میاں گلوگیر لہجے میں مجھ سے بولے۔

''چلو بیٹا! ہم بھی چلتے ہیں۔''

اور میں پلٹ کر کہاں جاتی میری گود میں دو ماہ کا بچہ اور قریب کھڑا مانی ان دونوں معصوموں کو اس شخص کی ضرورت تھی جو ان سے منہ موڑے کھڑا تھا، اگر میں صرف اپنے لیے سوچتی تو میں تو اب بھی ایسی ہی تھی کہ دیکھ کر اچھے اچھوں کے ایمان ڈول جائیں لیکن میرے پیش نظر تو پہلے بھی کبھی اپنی ذات نہیں رہی اب بھی نہیں۔ بہت آہستگی سے میں نے خود کو ابا میاں سے الگ کیا اور مانی کا ہاتھ تھام کر سامنے جو دروازہ نظر آیا اسی سمت چل پڑی۔ فوراً ہی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ فوراً ہی ابا میاں کے چلانے کی آواز آنے لگی۔ یقیناً احمد پر بگڑ رہے تھے اور میرا ذہن اس وقت بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ بچے کو بیڈ پر سلا دیا اور خالی خالی نظروں سے بند دروازے کو تکنے لگی۔

''ممی۔!'' مانی نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا تو میں نے چونک کر دیکھا، وہ بہت سہما ہوا لگ رہا تھا، تب میں نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا اور اس کے بالوں میں منہ چھپا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کیسی ہوا چلی تھی۔ میرا دل قطرہ قطرہ لہو ٹپکا رہا تھا جبکہ آنکھیں خشک تھیں۔ مانی کو گود میں لیے آہستہ آہستہ دائیں بائیں جھول رہی تھی۔ کتنی دیر تک ابا میاں کی اونچی اور احمد کی دھیمی آوازیں آتی رہیں پھر ایک دم سناٹا چھا گیا تو میں بھی اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔ مانی سو چکا تھا، میں نے اسے بھی لٹا دیا اور بہت آہستگی سے بیڈ سے اتری تھی کہ دروازے پر دستک کے ساتھ ابا میاں نے پکارا۔

''عائشہ! دروازہ کھولو بیٹی۔'' میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تو انہوں نے میرے پیچھے نظر دوڑا کر پہلے بچوں کو دیکھا پھر سر جھکا کر بولے۔

''میں ابھی واپس جا رہا ہوں بیٹی۔! تم یہیں رہو گی یا۔؟۔''

کتنی آسان راہ منتخب کی تھی انہوں نے کہ فیصلے کا اختیار مجھے سونپ دیا۔ اور میں اپنے دل کی بستی سے کب کسی کو نکالنے پر قادر تھی۔ جو ایک بار بس گیا سو بس گیا پھر میں صرف

محبت کرتی ہوں یہ جاننے کے باوجود کہ بدلے میں درد کے موتی ہی ملیں گے اور میرے نزدیک یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ اب کسی کو کیا معلوم اس درد کے اسرار اور پہلے تو میں بھی نہیں جانتی تھی لیکن اب آگاہیوں کے در کھلنے لگے تھے۔ ابا میاں کے جھکے ہوئے سر پر میرا دل رو اٹھا۔ میں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں ابا میاں! کچھ دن رہیں ناں۔''

انہوں نے چونک کر سر اونچا کیا تو ان کی پانیوں سے لبریز آنکھیں چھلک پڑیں اور اس سے پہلے کہ یہ انمول موتی مٹی میں رلتے میں نے ہاتھوں میں سمیٹ لیے۔

''ابا میاں! آپ کیوں روتے ہیں؟۔''

''کیا کروں، مجھے کم از کم احمد سے ایسی چھچھوری حرکت کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اس نے تو میرا مان توڑ دیا۔''

''ہاں، انسان غلطی کرتے ہوئے بھول جاتا ہے کہ وہ کس کس کا مان توڑ رہا ہے۔''

مجھے بابا کی بات یاد آئی۔ پتا نہیں بابا نے مجھ سے کیسی امیدیں وابستہ کر لی تھیں میں اتنی بہادر تو نہیں تھی۔ اگر یہ محبتیں راہ میں حائل نہ ہوتیں تو میں اسی وقت دروازے سے واپس پلٹ جاتی۔ لیکن ہائے یہ محبتیں۔

''اچھا بیٹی! میں چلتا ہوں۔'' ابا میاں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کچھ دن رہیں ناں۔؟'' میں نے پھر کہا۔

''ابھی نہیں رک سکتا بیٹی! پھر آؤں گا۔ تم فکر نہیں کرنا۔ یہ تمہارا گھر ہے، آرام سے رہو۔ اور اگر اب احمد نے کوئی غلط بات کی تو فوراً مجھے بلا لینا میں اس بدذات کو چھوڑوں گا نہیں۔''

پھر وہ مجھے خوش اور سدا آباد رہنے کی دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے اور میں اپنے گھر میں اجنبیوں کی طرح کھڑی رہ گئی۔



وہی شہر ہے وہی راستے وہی گھر ہے وہی لان بھی مگر اس دریچے سے پوچھنا، وہ درخت انار کا کیا ہوا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گرمی، حبس اور حد درجہ گھٹن تھی کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ مری کے مضافات میں تو مئی جون میں بھی موسم خوشگوار ہی رہتا ہے جبکہ یہاں کافی گرمی تھی۔

میں نے اٹھ کر پنکھا تیز کیا اور کھڑکی سے پردے ہٹا دیے اور کچھ دیر وہیں کھڑی رہ کر لمبے لمبے سانس لیتی رہی لیکن میرے اندر کی گھٹن کم نہیں ہوئی۔ تب بچوں کی طرف سے اطمینان کر کے میں بہت احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ بہت خاموش اور پرسکون رات تھی۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں میری نظریں بھٹکتی ہوئی لان کے دوسرے سرے پر جا ٹھہریں جہاں پھولوں کی باڑھ میں ننھے سے جگنو نے ایک پل کو اپنی چھب دکھلائی تھی۔ اور میرے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔ پتا نہیں کیوں جب میں اداس ہوتی ہوں، مایوسیاں میرا گھیراؤ کرنے لگتی ہیں تب ایسی ہی کوئی روشنی کی کرن مجھے میری اگلی منزل کا پتا دیتی ہے ابھی جانے کتنی منزلیں طے کرنی ہیں۔ اپنے دل کے کاسے میں گونجتی چھنن چھنن کی آواز کو پانے کے لیے جانے کن کن راستوں سے گزرنا ہے۔

''الٰہی۔'' میں نے سر اونچا کر کے آسمان کی طرف دیکھا تب ہی احمد نے بہت آہستگی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ خدا گواہ ہے میں اس وقت نہ تو اس سے کوئی شکوہ کرنے جا رہی تھی اور نہ اس شخص کے حوالے سے کوئی اور بات، میں تو اس سے کچھ اور مانگنا چاہتی تھی۔ اور یقیناً وہ جانتا تھا۔ جب ہی پہلے میری محبت کو پرکھنے کا سامان کر گیا۔

''عائشہ۔!'' احمد کی آواز بہت دھیمی تھی۔ میں نے خالی خالی نظروں سے دیکھا تو غالباً ان کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا تو اپنا ہمیشہ والا سوال دہرا گئے۔

''یہاں کیوں کھڑی ہیں۔؟'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گہری سانس سینے کے اندر روک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''میں جانتا ہوں۔ آپ مجھ سے بہت خفا ہیں۔''

میں ان کے انداز پر چونک گئی۔ گویا اپنی ذات کا تفخر وہ خود نیلام کر آئے تھے۔ جبکہ میں اپنے مقام پر کھڑی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس مقام پر مضبوطی سے قدم جمائے رکھنے کے لیے مجھے نہ صرف ضبط کے مراحل طے کرنے ہیں بلکہ اپنے دامن کو بے حد وسیع کر

دینا ہے۔

میں نے آپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے اس کے لیے آپ جو سزا چاہیں۔"

وہ اعتراف کرتے ہوئے بے حد نادم تھے اور میں فرشتہ تو نہیں تھی۔ میرا دل چاہا ایک جھٹکے سے اپنا دامن چھڑا کر دور ہٹ جاؤں لیکن میری ہتھیلیوں پر ابا میاں کے آنسوؤں کی نمی تھی اور سماعتوں میں بابا کی آواز۔

"تم سے مجھے امید ہے بیٹا! کہ تم احمد کی غلطی کو معاف کر دو گی۔" پھر کیسی مشفق مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

"نہیں تم ڈرپوک نہیں ہو بلکہ میری نظر میں سب سے بہادر ہو۔ اس لیے کہ تم معاف کر دیتی ہو اور معاف کرنے والا ڈرپوک نہیں بہادر ہوتا ہے۔"

"احمد۔!" میری آنکھوں میں ٹوٹ کے ساون اترا اور پل میں جل تھل کا سماں ہو گیا، اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ اگر مجھے واپس جانا ہوتا تو میں شام میں ابا میاں کے ساتھ ہی چلی جاتی۔ جب یہیں رہنا ہے۔ اور یہ بھی طے ہے کہ دل کے گھروندے سے یہ شخص کہیں نہیں جا سکتا تو پھر اس سے ناراضگی کتنے دن چلتی۔ وہ سزا سننا چاہتا تھا۔ اور میرے آنسوؤں نے معافی کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد میں اتنی پرسکون ہو گئی کہ کسی کسی وقت مجھے خود اپنے آپ سے خوف آنے لگتا کہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے۔ احمد کی وارفتگیاں اور والہانہ نظریں میرے اندر ہلچل کیوں نہیں مچاتیں۔ یہ سچ تھا کہ احمد سے گریز میں میرے شعور کو قطعی دخل نہیں تھا۔ اور کیا ستم تھا کہ میں جتنا گریز کرتی، احمد کی محبت میں بے قراری اور بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ گو کہ میری محبت میں بھی کمی نہیں آئی تھی لیکن شاید ٹھہراؤ آ گیا۔ اور میں زندگی کے مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے اسی حساب سے مصروف ہو رہی تھی۔ یعنی مانی کو اسکول میں داخل کرا دیا تو ظاہر ہے پھر اسے پڑھانا، ہوم ورک کرانا اور اسکول کی دوسری ضروریات کا خیال رکھنے میں میری خاصی توجہ اسی پر صرف ہو جاتی۔ پھر چھوٹا بابا بھی چلنے لگا تھا۔ اس کے پیچھے دوڑنا کہ کہیں وہ برآمدے کی سیڑھیوں سے گر نہ جائے۔ اور غالباً احمد یہ سمجھ رہے تھے کہ میں قصداً ان سے دور ہو رہی ہوں یا پھر صبح کا بھولا گھر آ کر مسلسل خوف کا شکار تھا کہ کہیں میں سچ مچ ان سے روٹھ

کر کہیں بہت دور نہ چلی جاؤں۔ ان کا انداز بے حد سنبھال سنبھال کر رکھنے والا تھا کہ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ کر بکھر جاؤں گی۔

اور میں ٹوٹنے کے عمل سے گزر چکی تھی جب ہی اب یہ ساری باتیں بے معنی سی لگتیں۔ کبھی میرے اندر سناٹا چھا جاتا۔ کبھی حیران ہو کر دیکھنے لگتی اور کبھی ذرا سا ہنس کر چپ ہو جاتی۔ وہ ساری باتیں جنہیں سننے کے لیے میری شب زفاف نے تڑپ تڑپ کر کروٹ بدلی تھی، وہ احمد اب میری جھولی میں ڈالتے تھے۔

"پتا ہے عائشہ! جب پہلی بار میں نے آپ کو دیکھا تو اپنی بے خبری پر حیران ہوا کہ میرے گھر کے قریب رہنے والی یہ سوندھی سوندھی سی لڑکی مجھے بہت پہلے نظر کیوں نہ آئی۔"

وقت گزر جائے تو کتنی خوبصورت باتیں اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔ گو کہ میرا اندر مر نہیں گیا تھا پھر بھی میں خالی خالی سی ہو جاتی۔ شاید اس لیے کہ میری جستجو ان دکھ دینے والی محبتوں سے کہیں آگے پرواز کر گئی تھی۔ میری بے قراری اور میری تڑپ کا رنگ ہی بدل گیا۔ کتنا اچھا لگتا تھا جب میں تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں ہوتی تھی۔ اس کائنات کا سب سے نرم، لطیف اور بے حد خوبصورت احساس جو میری کھوج کو جلا بخش رہا تھا اور میں دیوانہ اس کے تعاقب میں بھاگ رہی تھی، اب سے نہیں بہت پہلے سے جب میں چھوٹی سی تھی تو پہلی بار گھروندا بنا کر میں نے سب کے نام کے پودے لگائے (جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا گیا) پھر سوچا تھا "یہاں میں بیٹھوں گی یہاں وہ" اور 'وہ' کے ساتھ ساری خوبصورتیاں، ساری اچھائیاں منسوب تھیں۔ اور پھر جہاں کہیں کسی میں میں نے ان خوبصورتیوں اور اچھائیوں کی ہلکی سی جھلک پائی سمجھ لیا یہی ہے وہ اور اسے اپنے گھروندے سے میں بسا کر اطمینان سے ہو گئی کہ میری جستجو کا سفر تمام ہوا۔

جیسے تپتی دھوپ میں چھاؤں کا احساس دلانے والی مس ہاشمی کی ہلکی سی مسکراہٹ میں اس کی جھلک نظر آئی تھی۔

جیسے مس سلمٰی کی پاکیزگی کہ پلکیں آپ ہی آپ سجدہ ریز ہو جاتیں۔

جیسے حاجرہ کی معصومیت۔

جیسے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا زاہد کا حسین۔

پھر دانیال کی وجاہت میں جو ایک شان جھلکتی تھی۔

اور احمد کی ذات کا تفخر (ہم آپ کو بہت مانتے ہیں) اپنے ساتھ ساری خدائی کو شریک کر کے وہ سب پر بازی لے گیا تھا۔

پھر وہ درد کے سارے موتی جو میں وقتاً فوقتاً چنتی آئی تھی۔ اگر ان سب کے ساتھ میں اس کائنات کی ساری خوبصورتیاں بھی ایک پلڑے میں رکھ دوں تب بھی اس کے سامنے سب ہوا میں معلق ہو جائے گا۔ یہ سچ ہے، شعور و آگاہی کی منزلیں طے کر کے اب احساس ہوا تھا کہ سب تو کڑیاں ہیں میری جستجو میں کچھ دیر ستانے کے بہانے ورنہ میری منزل تو کہیں اور ہے۔ جسے میں دیکھ نہیں پا رہی لیکن پوری شدتوں کے ساتھ محسوس کرتی ہوں۔ اور احساس کی۔ یہ ڈوری مجھے کہاں کہاں لیے پھرتی ہے۔ کبھی بہتے آبشاروں میں گم ہو جاتی ہوں، کبھی ستاروں کے جھرمٹ میں تو کبھی پھول کلیوں میں کھوجتی ہوں۔ جب دل کی بے قراری سوا ہو جاتی ہے تو درد کے موتی چننے لگتی ہوں۔ بڑے انمول ہیں یہ موتی۔ کون جانے ان کے اسرار میں بھی نہیں جانتی۔ مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ جب یہ کسی مظلوم کی آنکھ سے ٹپک کر میرے دل کی شفاف و ڈھلوان سڑک پر پھسلتے ہوئے روح کی گہرائیوں، میں اترتے ہیں تو میرے دل کا کاسہ لبریز ہو چھلکنے لگتا ہے کیسا انوکھا احساس ملتا ہے اس وقت مجھے جیسے کسی نے چپکے سے اپنی محبت کا یقین دلایا ہو۔ روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔

پھر کتنا بہت سارا وقت بیت گیا۔ میرے پاس سب ہی کچھ تو ہے۔ خوبصورت گھر، بے پناہ چاہنے والا شوہر۔ جو کبھی کچھ وقت کو جو مجھ سے غافل ہوا تھا اور اپنے طور پر وہ اب تک تلافی نہیں کر پایا۔ حالانکہ میں نے اسی وقت معاف کر دیا تھا بہت پیارے اور معصوم بچے۔ حقیقتاً بہت آئیڈیل اور قابل رشک زندگی ہے میری۔ میں بہت خوش ہوں لیکن میرے اندر کی جستجو کبھی کبھی مجھے بہت بے قرار کر دیتی ہے۔ اتنی کہ کبھی میں تپتی دوپہروں میں اے سی سے نکل کر برآمدے میں آ کھڑی ہوتی ہوں اور کبھی یخ بستہ راتوں میں ننگے پاؤں لان میں چکراتی ہوں۔ ایسے میں ایک ہی خیال رہتا ہے۔



اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری آج عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

میں قدرے غنودگی میں تھی کہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔ یقیناً بابا کی آواز تھی جو نماز سے فارغ ہو کر نعتیہ اشعار پڑھتے ہوئے غالباً کچن کی طرف جا رہے تھے۔ گویا صبح ہو گئی تھی۔ میں جلدی سے لحاف پھینک کر کھڑی ہو گئی۔ اور شال اوڑھ کر کمرے سے نکل کر کچن میں آئی تو بابا چولہے میں لکڑیاں رکھ رہے تھے۔ میں نے سلام کرنے کے ساتھ ہی کہا۔

"کیا کر رہے ہیں بابا؟ آپ اندر جائیں میں چائے بنا دوں گی۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے بیٹا! تم اطمینان سے نماز پڑھ لو۔"

انہوں نے کہا تو میں نے پلٹ کر دیکھا، ملگجا سا اجلا دھیرے دھیرے اپنے پر پھیلا رہا تھا۔ تب میں نے نل پر آ کر وضو کیا پھر برآمدے ہی میں جانماز بچھالی۔ رگوں میں لہو منجمد کر دینے والی سردی تھی اور مجھے موسموں کی شدتیں اپنی ذات پر سہنے کی عادت۔ نماز سے فارغ ہو کر میں دوبارہ کچن میں آئی تو بابا چائے کا پانی رکھ چکے تھے اور آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے ابھی بھی وہی اشعار پڑھ رہے تھے۔

ہم نیک ہیں یا بد ہیں بالآخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھی ہے مگر حال برا ہے

میں بہت خاموشی سے چولہے کے دوسری طرف چوکی رکھ کر بیٹھ گئی۔ اور توجہ سے انہیں سننے لگی۔ پھر جب وہ خاموش ہو گئے تب میں نے پوچھا۔

"بابا! ہم مسلمان اتنے برے حالوں کو کیوں پہنچ گئے ہیں؟

"اپنا راستہ چھوڑ کر غیروں کی تقلید جو کرنے لگے ہیں۔ اور جو اپنی راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ بہت نادان ہیں ہم، خود اپنے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔ اگر آج آنحضرت ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں تو کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گا۔ لیکن صد افسوس ہم پر۔"

بابا گہری آہ کھینچ کر خاموش ہو گئے۔

چائے کا پانی کھول رہا تھا۔ میں نے اسی میں پتی اور دودھ بھی ڈال دیا پھر مگوں میں چائے ڈالی۔ امی اندر کلام پاک پڑھ رہی تھیں۔ میں انہیں وہیں چائے دے آئی۔ دوبارہ آ کر بابا کے پاس بیٹھی تو وہ کہنے لگے۔

''آج مسلمانوں پر جتنی آفتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ اس کے لیے ہم کسی دوسرے کو الزام نہیں دے سکتے۔ یہ ہمارے اپنے اعمال ہیں۔ جو ناگہانی آفتوں کی صورت دوبارہ ہماری طرف لوٹ آئے ہیں۔ اور ہم پھر بھی نہیں سمجھ رہے۔''

''میرا خیال ہے بابا ہم سب سمجھتے ہیں۔''

''یہی تو بڑا المیہ ہے بیٹا کہ سمجھ کر نہ سمجھنا۔ تو ایسے میں خدا ہم سے خوش تو نہیں ہوتا ہوگا۔ جب اس نے اپنے محبوب ﷺ کے ذریعے ہم پر ہر بات واضح کر دی بلکہ ہر شعبہ ہائے زندگی میں انہیں ﷺ مثال بنا کر بھیجا۔ پھر ان ﷺ کی تعلیمات سے منہ موڑ کر ہم خسارے میں ہی تو جائیں گے۔ حالانکہ بہت سیدھا، سچا اور صاف ستھرا راستہ ہے ہمارا جس پر چل کر اگر غور کرو تو ہم کسی دوسرے کے ساتھ نہیں بلکہ خود اپنے ساتھ بھلائی کریں گے۔ جیسے عفو درگزر، مساوات، اخوت و بھائی چارہ۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

مئں بڑے غور سے انہیں سن اور دیکھ رہی تھی، ان کے پوچھنے پر اسی طرح بنا پلکیں جھپکائے اثبات میں سر ہلایا تو قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

''بس بیٹا! خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت میں ہی ہماری فلاح ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جب تک ہم اطاعت گزار نہیں بنیں گے فلاح نہیں پائیں گے۔''

''بابا! خدا ہم سے ناراض ہے کیا؟'' میرا دل ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔

''وہ ناراض ہونا نہیں چاہتا۔ ہم ناراض کرتے ہیں۔ ورنہ تو بڑا بے نیاز ہے۔ اسے ہمارے کسی عمل کی نہ ضرورت ہے نہ پروا۔ بس وہ تو چاہتا ہے کہ ہم بندے ایک دوسرے پر نہ اپنے آپ پر ظلم کریں۔''

''انسان اپنے آپ کے ساتھ ظلم کیسے کرتا ہے؟''

میرے پوچھنے پر بابا ذرا مسکرائے اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔

''دوسرے پر ظلم ہی درحقیقت اپنے آپ کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی کا ناحق خون بہاتا ہے تو پھر وہ کتنے دن آزادی سے زندہ رہ سکے گا۔ فرض کرو، اس دنیا میں اس نے اپنے آپ کو بچا بھی لیا تو روزِ محشر کیسے بچے گا۔ اس وقت تو کوئی اس کی مدد کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔ اور یہی انسان کا اپنے آپ پر ظلم ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے جنت کے دروازے خود بند کرتا ہے اور جہنم کے قریب ہو جاتا ہے اور خدا تو بڑا مہربان ہے، وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بندے اپنے لیے ہلاکت کا سامان کریں۔''

میری پرسوچ نظریں چولہے میں دہکتے انگاروں پر جا ٹھہریں جن کی تپش بدن کو سرور بخش رہی تھی۔

''اگر میں ان پر اپنا ہاتھ رکھ دوں تو۔'' جانے کیوں مجھے یہ خیال آیا اور فوراً ہی میں نے اپنے بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹ دیا پھر بابا کو دیکھ کر پوچھا۔

''بابا! وہ ہم سے خوش بھی ہوتا ہے؟''

''ہاں بیٹا! ہمارے اچھے اعمال اسے خوش کرتے ہیں۔ یوں سمجھو اس کی رحمت تو ہم سے راضی ہونے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ اگر ہم اپنی ہی کسی غلطی پر نادم ہو جائیں تو وہ اسی پر خوش ہو جاتا ہے کہ میرے بندے کو احساس تو ہوا۔'' بابا ابھی کچھ اور کہتے کہ مانی اٹھ کر آ گیا۔

''ممی! مجھے بھوک لگی ہے۔''

''یہاں میرے پاس آؤ بیٹا۔''

بابا نے مانی کو اپنے قریب بٹھا کر اپنی گرم چادر اسے اڑھا دی۔ اور میں چولہے پر توا رکھ کر سلائس گرم کرنے لگی۔ کچھ دیر میں امی میرے چھوٹے بابا کو گود میں لے کر آ گئیں پھر ہم سب نے وہیں بیٹھ کر ناشتا کیا۔ اس کے بعد امی نے فاطمہ، سلطانہ اور پروین کو بلوا لیا۔ تینوں اپنے بچوں کے ساتھ آئیں تو ایک دم سے بہت رونق ہو گئی۔ بڑے بھیا ان دنوں شارجہ میں تھے۔ نوید کراچی میں اور ندیم بھی امی کے پاس تھا۔ بہر حال جب ہم بہنیں مل کر بیٹھیں تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ کبھی اپنے گھر کے قصے اور کبھی مامی کی باتیں فاطمہ نے ماضی کو یاد کرتے ہوئے اب بھی ناک چڑھا کر میرا مذاق اڑایا۔

''اوں ہوں۔کیسی گندی مندی ہوا کرتی تھیں تم۔ ہر وقت مٹی میں کھیلتی تھیں۔''

''ایمان سے فاطمہ! بڑا مزا آتا تھا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

''میری بیٹی تم پر گئی ہے۔ سارا وقت مٹی میں بیٹھی رہتی ہے اور تمہاری طرح اپنے آپ سے باتیں بھی کرتی ہے۔''

''اچھا۔!'' میری ہنسی مدھم پڑ گئی۔ ''کبھی تم نے سنی ہیں ان کی باتیں۔''

''ہاں۔آتے جاتے سن لیتی ہوں۔ مجھے تو دیوانی سی لگتی ہے۔ مٹی کا گھروندا بنا کر اس میں سب کے نام کے پھول لگائے گی پھر پتا نہیں کیا کیا بولتی جاتی ہے۔ ایسے میں مجھے تم یاد آتی ہو عائشہ! اگر تم اسے گھروندے میں بیٹھے دیکھو تو تمہیں بھی اپنا بچپن یاد آئے گا۔''

فاطمہ اس کی ایک ایک بات بتا کر مجھ سے منسوب کرتی رہی اور میں اس کی پہلی بات ہی میں کھوئی تھی۔

''مجھے تو دیوانی سی لگتی ہے۔''

شاید ٹھیک کہہ رہی تھی فاطمہ۔ کوئی مجھے دیکھے تو اب بھی دیوانہ کہے۔ پتا نہیں کس جستجو میں رہتی ہوں۔

میرے ساتھ ساتھ سدا رہا وہ میری نظر سے چھپا ہوا
یہ عجیب ہجرو وصال ہے، نہ کبھی ملا، نہ جدا ہوا

اگلے روز صبح ہی احمد آ گئے اور اسی شام کی فلائٹ سے ہمیں جدہ جانا تھا۔ میں امی اور بابا سے رخصت ہو کر احمد کے ساتھ ابا میاں کے گھر آ گئی۔ وقت کم تھا کیونکہ فلائٹ سے دو گھنٹے پہلے ہمیں اسلام آباد پہنچنا تھا۔ احمد کے کہنے پر میں نے بس ایک بیگ ہی تیار کیا اور دوپہر کا کھانا کھاتے ہی ہم اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ عابد اور کنول ہمارے ساتھ تھے۔ راستے میں کتنی بار کنول نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے لیے ضرور دعا کروں کہ اللہ اس کی دعا گود ہری کرے۔ پانچ سال ہو گئے تھے اس کی شادی کو اور اب وہ کافی مغموم رہی تھی۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اب بھی اسے تسلی دی کہ خدا بڑا مہربان ہے اسے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ پھر جب تک ہم لاؤنج میں نہیں چلے گئے عابد اور کنول وہیں کھڑے رہے تھے۔

دو تین گھنٹے کا سفر تھا لیکن معیاری اوقات میں فرق ہونے کے باعث جب ہم جدہ پہنچے رات ہو چکی تھی۔ احمد کے ایک سیکنڈ کزن آفتاب بھائی گاڑی لیے موجود تھے۔ غالباً احمد نے انہیں اصلاع کر دی ہوگی۔ آفتاب بھائی اپنی فیملی کے ساتھ طائف میں مقیم تھے۔ انہوں نے یہی کہا کہ اس وقت ہم ان کے ساتھ گھر چلیں پھر اطمینان سے عمرہ کے لیے جائیں۔ اور ہم نے ان سے اتفاق کر لیا لیکن جب گاڑی مکہ کے قریب سے گزرنے لگی تو میرے ساتھ احمد بھی بول پڑے۔

''رک جائیں آفتاب بھائی! یہ مکہ ہے تو پہلے ہمیں حرم شریف لے چلیں۔'' وہ ہنس پڑے۔

''میں جانتا تھا، یہاں آ کر تم یہی کہوں گے۔''

پھر انہوں نے گاڑی اسی طرف موڑ دی۔ جیسے جیسے فاصلہ سمٹا جا رہا تھا، مجھ پر بے خودی طاری ہوتی گئی۔ میری بے نام سی اداسیاں، میری بے قراریاں، میری کھوج، میری جستجو، سب کا حاصل وہ ہی تو ہے، میری ساری محبتوں کو بہت خاموشی سے آزمانے کے بعد بالآخر وہ مجھے اپنے در پر لے آیا تھا۔

''الٰہی۔الٰہی۔'' وفورِ جذبات سے اس کے در پر پیشانی ٹیک کر میں نے شدت سے پکارا۔ تو یہاں ہے میں نے تجھے کہاں کہاں ڈھونڈا۔

جب کلیاں چٹکتی تھیں۔
جب پھول کی پتیوں پر شبنم کے موتی چمکتے تھے۔
جب آسمان مینہ برساتا تھا۔
جب زمین سونا اگلتی تھی۔
جب ستاروں کے جھرمٹ میں چاند مسکراتا۔
جب آفتاب طلوع ہو کر کائنات کے ذرے ذرے کو منور کرتا۔
جب پہاڑوں پر برف جمتی۔
بہتے آبشاروں میں۔

میں نے جانا، یہ سب تیری قدرت کی نشانیاں ہیں۔ اور میں ان نشانیوں میں تجھے

کھوجتی تھی۔ پروردگار بے شک تو ہر جگہ موجود ہے اور اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتا ہے۔ کبھی خفا ہو کر، کبھی خوش ہو کر، کبھی آزما کر اور کبھی دل کے کاسے میں اپنی رضا کے سکے ڈال کر۔

میں اپنی جستجو کے سفر میں کھڑی تمام محبتوں سے آگاہی کے بعد اب حقیقی محبت کو پا کر اپنی منزل پر کھڑی تھی۔ جسے پانے کے لیے میں نے راہ میں آئے سارے درد کے موتی چنے تھے۔ اب اپنی ذات کے لیے کوئی تمنا نہیں تھی اور میرے پیش نظر صرف اپنی ذات تو کبھی بھی نہیں رہی۔ اب بھی نہیں۔ میرے اندر وجود سسکتے ہیں، میں انہی کے لیے اس پرودگار سے بہت عاجزی سے سوال کر رہی تھی۔

''الٰہی! آج ہم مسلمان بہت برے حالوں کو پہنچ گئے ہیں۔ کیا تو ہماری مدد نہیں کرے گا۔؟ اور جواب بہت سادہ بہت واضح تھا۔

؎ کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

